یہی آئین قدرت ہے، یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہ عمل میں گامزن، محبوبِ فطرت ہے
(اقبالؔ)

شش ماہی مجلّہ

تَسَلسُل

جموں توی

ریاست کی علمی و ادبی پیش رفت کا ترجمان شش ماہی مجلّہ

مرتبہ
پروفیسر (ڈاکٹر) شہاب عنایت ملک
(مدیرِ اعلیٰ)

شعبۂ اُردو جموں یونیورسٹی، جموں توی، جموں وکشمیر

مجلس ادارت

۱۔ پروفیسر شہاب عنایت ملک شعبہ اُردو جموں یونیورسٹی جموں توی

۲۔ پروفیسر سکھ چین سنگھ‘ شعبہ اُردو‘ جموں یونیورسٹی، جموں توی

۳۔ پروفیسر ضیاء الدّین، شعبہ اُردو جموں یونیورسٹی، جموں توی

۴۔ ڈاکٹر محمد ریاض احمد ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ اُردو جموں یونیورسٹی جموں توی

۵۔ ڈاکٹر چمن لال بھگت، اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اُردو جموں یونیورسٹی جموں توی

۶۔ ڈاکٹر عبدالرشید منہاس اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اُردو جموں یونیورسٹی جموں توی

۷۔ ڈاکٹر فرحت شمیم اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اُردو جموں یونیورسٹی جموں توی

ششماہی مجلّہ

تَسَلسُل

جموں توی

جلد: ۲۷ شمارہ: ۳۹

جولائی تا دسمبر ۲۰۱۷ء

مرتبہ

پروفیسر (ڈاکٹر) شہاب عنایت ملک

(مدیر اعلیٰ)

شعبۂ اُردو جموں یونیورسٹی، جموں توی، جموں وکشمیر

جملہ حقوق بحق شعبۂ اُردو جموں یونیورسٹی جموں توی محفوظ

ششماہی مجلّہ ''تَسَلسُل'' جموں توی

ISSN NO.2348-277X

قیمت فی شمارہ	:	۱۰۰/روپے
زرِسالانہ	:	۱۵۰/روپے
طابع وناشر	:	صدر شعبۂ اُردو جموں یونیورسٹی، جموں توی
مرتبہ/مدیر اعلیٰ	:	پروفیسر شہاب عنایت ملک
کمپوزر	:	طارق ابرار، موبائل نمبر:9596868150
سرورق	:	مسعود احمد
ڈیزائننگ۔لے آوٹ	:	قاسمی کتب خانہ تالاب کھٹیکاں جموں توی۔ موبائل نمبر:9797352280

مشمولات میں ظاہر کی گئیں آرا سے مدیر اعلیٰ یا شعبۂ اُردو جموں یونیورسٹی کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ ''تسلسل'' میں شامل مضامین نقل یا ترجمہ کیے جاسکتے ہیں لیکن اس کیلئے مصنف یا مدیر اعلیٰ یا ناشر کی تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔

عرضِ حال

شعبہ اُردو جموں یونیورسٹی میں اُردو کی معیاری تعلیم ، اُردو سکھانے اور اُردو کے فروغ کے لئے جو اقدامات اٹھائے جارہے ہیں اس کی نظیر شاید ہی کہیں اور ملے گی ۔ اس شعبہ کی ایک روایت یہ بھی رہی ہے کہ اُردو کے بلند مرتبت شعراء و ادباء کو شعبہ میں دعوت دی جاتی ہے اور ان سے توسیعی اور خصوصی خطبے دلوائے جاتے ہیں ۔ شعبہ اُردو جموں یونیورسٹی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ بین الاقوامی اور قومی سیمینار ، کانفرنسیں اور مشاعروں کے ساتھ ساتھ یہ شعبہ قدآور شعراء و ادباء کے جشنوں کا اہتمام بھی کرتا رہا ہے جن سے اساتذہ کے ساتھ ساتھ اسکالرس اور طلباء و طالبات بھی استفادہ کررہے ہیں ۔ شعبہ اُردو جموں یونیورسٹی کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ 1998 سے ادبی رسالہ ''تسلسل'' تواتر کے ساتھ شائع ہورہا ہے ۔ یہ ایک ادبی و تحقیقی ریفریڈ جنرل ہے جس میں غیر مطبوعہ ادبی و تحقیقی مضامین / Review کے بعد ہی شائع کئے جاتے ہیں ۔

خطوط نگاری کے فن اور اہمیت پر خصوصی شمارہ شائع کیا جارہا ہے ۔ ہمیں خوشی ہے کہ قلمکاروں نے ہمارا تعاون کیا اور اپنی گراں قدر نگارشات ''تسلسل'' کے لئے ارسال کیں ۔ ہم سبھی قلمکاروں کے شکرگذار ہیں ۔ امید قوی ہے کہ آئندہ بھی ان

کا تعاون ملتا رہے گا۔

قارئین اور قلمکاروں کے مشوروں کا انتظار رہے گا۔

(نوٹ: 'تسلسل' کے آئندہ شماروں کیلئے مضامین اس ای میل ایڈریس profshohab.malik@gmail.com پر ارسال کریں)

شکریہ

پروفیسر شہاب عنایت ملک

(مدیر اعلیٰ)

فہرست

صفحہ نمبر	مصنف	نمبر شمار عنوان
9	ڈاکٹر سیّد تقی عابدی، کنیڈا	۱۔ خطوط نگاری روایت اور تسلسل کے امکانات
33	پروفیسر صغیر افراہیم	۲۔ 'مکاتیبِ سرسید' کی عصری معنویت
56	پروفیسر عارفہ بُشریٰ	۳۔ مکتوب نگاری اور مکتوباتی افسانہ نصیر اور خدیجہ
62	ڈاکٹر محمد ریاض احمد	۴۔ اُردو کے اہم مکتوب نگار (غالب کے علاوہ)
84	ڈاکٹر چمن لال بھگت	۵۔ برج پریمی کے خطوط۔ایک جائزہ
91	ڈاکٹر عبدالرشید منہاس	۶۔ بیگم حسرت موہانی کے خطوط اور جدوجہد آزادی
104	ڈاکٹر فرحت شمیم	۷۔ خطوط نگاری: ایک تعارف
111	ڈاکٹر اعجاز حسین شاہ	۸۔ نظیر کی شاعری میں طنز و مزاح
117	آصف ملک علیمی	۹ خطوط نگاری کی ختم ہوتی روایت کے اسباب وعوامل
141	ڈاکٹر جاوید اقبال	۱۰۔ سعادت حسن منٹو کی خطوط نگاری ایک جائزہ
149	ڈاکٹر عرفان امین	۱۱۔ خطوط غالب میں طنز و مزاح کے عناصر
156	سجاد احمد سلطان	۱۲۔ مکاتیب اقبال میں فلسفہ تصوف
162	کوشل کرن ٹھاکر	۱۳۔ صفیہ اختر خطوط کے آئینے میں
175	صائمہ منظور	۱۴۔ فیض کے خطوط کے ادبی حوالے
186	محمد شکیل	۱۵۔ کرشن چندر افسانوں میں رومانی حقیقت نگاری
195	مہناز کوثر	۱۶۔ اردو میں منظوم مکتوب نگاری

۱۷۔ حالؔی خطوط کے آئینے میں	ڈاکٹر رضا محمود	201
۱۸۔ خطوط شبلی پر ایک نظر	رابعہ بانو میر	213
۱۹۔ مولانا محمد حسین آزاد کے سوانحی جھلکیاں: مکاتیبِ آزاد کے آئینہ میں	جاوید احمد شاہ	219
۲۰۔ اردو میں داغ دہلوی کی خطوط نگاری	محمد اقبال	227
۲۱۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط کی اہمیت	ڈاکٹر ریش پال شرما	232
۲۲۔ ریڈیو ڈراموں کا ارتقائی سفر	ذُلفی رام	244
۲۳۔ خطوط نگاری کی روایت و اہمیت	نصیر احمد ڈار	251
۲۴۔ خطوط غالب کی اہمیت۔ایک مطالعہ	اعجاز احمد	261
۲۵۔ اُردو خطوط نگاری ماضی، مستقبل اور حال	مشتاق احمد سوہل	268
۲۶۔ مکتوب نگاری کی اہمیت وافادیت۔ایک مطالعہ	محمد مقیم انصاری	278
۲۷۔ مکتوب نگاری کی تاریخ	رافیہ اختر	284
۲۸۔ علامہ اقبال کی خطوط نگاری میں سیاسی پہلو	محمد عارف	291
۲۹۔ مکاتیبِ اقبالؔ میں کشمیریت	ڈاکٹر عاشق چوہدری	297
۳۰۔ خطوط غالبؔ کی خصوصیات	شاہدہ نواز	306
۳۱۔ مکاتیب کی اہمیت	نیرو سید	312
۳۲۔ ابوالکلام آزاد کی خطوط نویسی کا پس منظر	روضیہ تبسم	317
۳۳۔ پروفیسر شہاب عنایت ملک۔ایک صحافی،ایک ادیب	نصرت بانو	323
۳۴۔ ریاست جمّوں وکشمیر میں اُردو صحافت کا آغاز	عبدالمجید	327
۳۵۔ اُردو کے اہم مکتوب نگار	محمد ارشاق	333
۳۶۔ قرۃالعین حیدر کے افسانوں میں مشترکہ تہذیب	بلبیر	341

خطوط نگاری روایت اور تسلسل کے امکانات

______ ڈاکٹر سیّد تقی عابدی، کنیڈا

شخصی اور نجی خط حدیث دل بھی ہے اور واردات قلب بھی ہے۔ خط کا وجود اُس وقت سے ہے جب سے رسم الخط بنا۔ خط میں خط لکھنے والے کی شناخت چھپی رہتی ہے۔ چنانچہ ذاتی خطوط شخصیت کی شناخت اور پہچان بھی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جو بات ڈاکٹر یوفان متوفی 1788ء نے اسٹائل یا اُسلوب کے بارے میں کہی تھی کہ ''اسٹائل خود انسان ہے اس میں انسان کی شخصیت چھپی رہتی ہے اور اس میں اس کے ذہن کو پڑھا جاسکتا ہے۔'' یہ بات خطوط پر بھی صادق آتی ہے۔ جس طرح اُسلوب کئی اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے اُسی طرح خطوط بھی مختلف قسم کے ہوتے ہیں، چنانچہ خطوط نجی یا ذاتی ہوں، علمی یا ادبی ہوں، سیاسی یا ثقافتی ہوں، مذہبی یا سیکولر ہوں، تہذیبی، تربیتی، تمدنی، اخلاقی اور آزادی کی قدروں سے مالا مال ہوں، تاریخی جغرافیائی عشقی منطقی یا فلاسفی کے مسائل سے مربوط ہوں، بہرحال ایک مستند ترین دستاویز ہے جس پر تاریخ، مقام دستخط کے علاوہ بعض اوقات مہر اور خط تحریر بھی ثبت ہوتا ہے۔ انہی درجہ بندیوں اور مطالب کے باعث کبھی اس کو چٹھی، کبھی خط، کبھی رقعہ، کبھی سند کبھی مکتوب اور لیٹر کہتے ہیں۔ صدیاں گزرنے کے باوجود آج بھی خط تحقیقی، تنقیدی، تشریحی، تمجیدی، تہدیدی اور تعزیری مطالب اور معاملات کا مستند حوالہ مانا جاتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ خط کہیں جذبات سے بھری داستان ہے تو کہیں ادبی علمی سیاسی، ثقافتی مذہبی تاریخی

اقتصادی معلومات کا خزینہ اور کہیں شادی وغم حیات وممات کا پروانہ ہے۔

خط کبھی نامہ بر کے ہاتھ، کبھی کبوتر اور عقاب کے پیروں، کبھی گھوڑا سائیکل بس ریل جہاز کے ذریعے بھیجے گئے اور اب بھی تیز رفتار سواریوں کے علاوہ الیکٹرونک موجوں پر بھیجے جا رہے ہیں اور اس وجہ سے خطوں کے خدوخال کے ساتھ ساتھ اس میں لکھے ہوئے اندرونی احوال بھی بدل رہے ہیں اور یہ سوال کہ کیا انھیں خط کی صف میں شامل کیا جائے ابھی بھی حسب حال بحال معلوم ہوتا ہے۔ جہاں تک خطوط کی تاریخ اور قدامت کا مسئلہ ہے وہ اس وجہ سے بھی الجھا ہوا ہے کہ خط اور رسم الخط تحریر کے جڑواں بچے ہیں اور تاریخ سے پہلے پیدا ہو چکے تھے۔ آج سے ایک سوتیس سال قبل سمرنا عراق میں جو کھدائی ہوئی اُس میں تین ہزار سال پرانی مٹی کی ایسی تختیاں نکلیں جن پر مصر کے فرعونوں کے نام خطوط کندہ ہیں۔ آج بھی ہمیں بہت سے خطوط افلاطون، ارسطو اور ابی غورث سے منسوب ملتے ہیں۔ یونان کے مشہور شاعر ہومر اور مورخ ہیروڈوٹس کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے قدیم یونان میں خط و کتابت کا رواج بڑھا اور بعد میں رومن افراد نے اس کو فن میں تبدیل کیا اور اس طرح خط و کتابت کے ادبی سلسلہ کا آغاز ہوا۔ یورپ کا یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے کہ اُس نے مشرق کو خطوط نویسی کا سلیقہ سکھایا۔

چودہ سو سال قبل پیغمبر اسلام نے جو جامع اور مختصر خطوط عیسائیوں کے شہنشاہ اعظم ہرقل روم کو، ایران کے شہنشاہ کسریٰ، حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے نام بھیجے آج بھی محفوظ ہیں۔ ہم یہاں شمس التواریخ کے حوالوں سے ان خطوں کے ترجموں کو پیش کر رہے ہیں۔

حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے نام:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' یہ خط ہے محمدؐ رسول اللہ کا نجاشی شاہ

حبش کے نام۔حمد وثنا ہے اُس خدائے برحق اور قادر مطلق کی جو دونوں جہان کا بادشاہ ہے وہ سب عیوب ونقصانات سے پاک اور جمیع خواہشات سے مبرّا ہے وہی بے نیاز ہے اور ہم سب اُس کے بندے ہیں۔ وہ اپنے نشانات ظاہر اور معجزات باہر دے کر اپنے پیغمبروں کو سچا کرتا ہے۔یہی اپنے بندوں کو قیامت کے عذاب سے بچانے والا اوران کو عالی مراتب پر پہنچانے والا ہے۔وہی سب سے زبردست اور سب پر غالب۔وہی دانا جبار اور متکبر ہے۔

میں گواہی دیتا ہوں کہ عیسیٰ خدا کا بندہ۔اس کی روح اوراس کا کلمہ ہے۔اور مریم روح وکلمہ کے باعث حاملہ ہوئی۔خدا نے عیسیٰؑ کو اپنی روح سے پیدا کیا تھا جو مریم کے پیٹ میں رکھ دی گئی تھی جیسے کہ اُس نے آدم کو اپنے لطف وکرم سے بغیر ماں باپ کے پیدا کیا اوراس میں اپنی روح پھونک دی۔نجاشی! میں تجھے خدا کی طرف بلاتا ہوں۔اس سے پہلے میں نے اپنے چچا زاد بھائی جعفر کو تیرے پاس بھیجا تھا اس کے ساتھ اور بہت سے مسلمان بھی تھے، تجھے مناسب ہے کہ غرور کو بالائے طاق رکھ کر میری نصیحت مان لے۔والسلام

”علی من اتبع الھدی“ (شمس التواریخ صفحہ(۵۱۳)

عیسائیوں کے شہنشاہ روم کے نام:

”بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔یہ نامہ محمد رسول اللہ نے ہرقل اعظم روم کو لکھا ہے۔سلام اس شخص پر سیدھی اور سچی راہ کی پیروی

کرے۔ اے ہرقل بندہ تجھے اسلام کی طرف بلاتا ہوں۔ تو
مسلمان ہوجا۔ اس سے تیرے دین و دنیا (دونوں) درست
ہوجائیں گے۔ بلکہ خدا اس کے بدلے میں تجھے دونا دے گا۔
اگر تو نے انکار کیا تو سمجھ کہ تیرے سارے ملک کی رعایا کا وبال
تیری گردن پر رہے گا۔"

(شمس التواریخ، صفحہ ۵۱۶)

شہنشاہ ایران کسریٰ کے نام:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ خط ہے محمد رسول اللہ کا کسریٰ پرویز
بادشاہ فارس کے نام۔ سلام اس شخص کو جو راہ راست کی پیروی
کرے اور خدا کا قائل ہو کر گواہی دے کہ خدا ایک ہے اور محمدؐ اُس
کا بندہ اور رسول ہے۔ کسریٰ! میں تجھے اسلام کی طرف بلاتا
ہوں چونکہ سارے جہاں کے لیے خدا کا رسول ہوں۔ اس لیے
سب آدمیوں کو خدا کے عذاب سے ڈراتا ہوں۔ اور کافروں پر
حجت تمام کرتا ہوں اے کسریٰ تو بھی خدا سے ڈر کے مسلمان
ہوجا تاکہ ہلاکت سے بچ کے فلاح کو پہنچے۔ اگر انکار یا سرکشی
کرے گا تو یاد رکھیو کہ مجوسیوں کا سارا وبال تجھی پر پڑے گا۔

(شمس التواریخ، صفحہ ۵۲۴)

ان خطوط کی سادگی اور اختصار کھلی ہوئی دلیل اس بات کی ہے کہ اسلام کی بنیاد مبالغہ اور بناوٹ سے بالکل پاک تھی۔ اس میں اس کا لحاظ نہ کیا جاتا تھا کہ جس کو خط لکھنا ہے وہ کس درجہ اور مرتبہ کا ہے۔ بڑے سے بڑے شہنشاہ اور ادنی سے ادنیٰ غلام کے نام یکساں خطاب کے ساتھ نامہ نویسی ہوتی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

ان خطوط کے علاوہ اور بہت سے خط ان مسلمانوں کے نام ہیں جو آپ کے غلام اور حلقہ بگوش تھے۔ان کو بھی جب آپ خط لکھتے تھے تو اسی طرح خطاب فرماتے تھے کہ ''من محمد رسول اللہ الی فلاں'' القاب آداب کا نام ونشان بھی نہ ہوتا تھا۔تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایران آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں بھی تکلفات اور تصنع میں ازحد مبتلا تھا اوراس کے ہاں مبالغہ اور بناوٹ کی عبارت آرائیاں خطوں میں ہوتی تھیں۔ چنانچہ جس وقت آنحضرت ﷺ کا خط شاہ ایران پرویز ابن ہرمز کے سامنے پڑھا گیا تو وہ آگ بگولہ ہوگیا اوراس نے حضورﷺ کے نامۂ مبارک کو پارہ پارہ کر کے پھینک دیا اور کہا ''یہ کون گستاخ شخص ہے جس نے میرے نام سے پہلے اپنا نام لکھا ہے۔'' اس واقعہ سے معلوم ہوسکتا ہے کہ مسلمانوں کی خطوط نویسی ابتدا میں بالکل سادہ تھی اور ایران نے اپنے اثر صحبت سے اس میں رنگ آمیزیاں کردی تھیں۔

اس کے علاوہ حضور ﷺ کا ایک اور خط مصر کے والی کے نام بھی ہے۔خلافت راشدین کے دور میں کاتب موجود تھے۔بنی اُمیہ اور بنوعباسیہ کے دور میں مکتوب نویسی نے ترقی کی پہلے جو خط سیدھے سادے لکھے جاتے تھے وہ محاسن زبان و بیان سے آراستہ ہوئے۔اورنگ زیب، بیدل، مجدد الف ثانی کے رقعات حضرت عبدالقدوس کے تصوفی مکتوبات اور غالب کے فارسی خطوط آج بھی موجود ہیں جہاں تک اردو خطوط نگاری کا تعلق ہے شاید چند ذاتی خطوط اردو میں لکھے گئے ہوں جن کی ہمیں کوئی مستند تحریر نہیں ملتی اور ہم جانتے ہیں انیسویں صدی کے نصف اول تک دفتری تعلیمی درباری اور خانگی خطوط بھی فارسی میں لکھنے کا چلن تھا کیونکہ فارسی میں خط لکھنا علم وفضل و دانش کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ یہ سچ ہے کہ خطوط نگاری پر تحقیقی کام کم ہوا ہے اگر مخطوطات کی چھان بین کی جائے تو اردو کے خطوط کی دستیابی کا امکان ہے۔پہلے پہل خطوط بناوٹی اور پر تکلف اردو زبان میں مسجع اور مقفیٰ الفاظ کی سجاوٹ میں لکھے جاتے

تھے۔جس کو سمجھنا مشکل تھا۔ اسد اللہ خاں غالب وہ پہلے عظیم شاعر ہیں جنھیں ہم سیدھے سادے دلکش خطوط کا بنیاد گزار کہہ سکتے ہیں۔انھوں نے اپنے اردو خطوط کے مراسلے کو مکالمہ بنادیا اور خطوط میں جذبات کے ساتھ اطلاعات اور ارشادات بھی بیان کیے۔ چنانچہ پہلا اردو خطوط کا مجموعہ ''عود ہندی'' کے نام سے غالب کی زندگی میں دوستوں نے شائع کیا۔ یہ اردو مکتوب نگاری کا سنگ میل تھا۔سر سید احمد خاں نے ادبی تحریروں میں غالب کی تقلید کرنے کی کچھ کوشش ضرور کی لیکن ان کا اصلی کارنامہ نثر اور خطوط کو علمی تعلیمی اور سائنٹفک اردو سے جوڑنا تھا جس میں وہ کامیاب ہوئے۔ چنانچہ ان کے مصاحب اور ہم عصروں نے اپنا اپنا اسلوب کچھ کچھ جدا رکھتے ہوئے بھی سر سید کی نثری مہم میں ساتھ دیا۔ چنانچہ اردو نثر اور خطوط کے کئی اسلوب گلدستہ بن کر ظاہر ہوئے۔ان خطوط نگاری کے اسالیب میں محمد حسین آزاد، سر سید، حالی، ڈپٹی نذیر احمد، عبدالحلیم شرر، شبلی نعمانی، علامہ اقبال، خواجہ حسن نظامی، اکبرالہ آبادی، سید سلیمان ندوی اور مہدی افادی قابل ذکر ہیں جن میں سے بعض مشاہیر کے خطوط پر آئندہ گفتگو ہوگی۔

اردو خطوط نگاری کی روایت اس لیے توانا ہے کہ اس میں توانا شعرا ادبا اور دانشوروں نے اِسے محراب عشق پر سجایا ہے۔ہم پہلے خطوط نگاری کی روایت میں ان مشاہیر کے خطوط پر مختصر بحث اور ان کا تجزیہ کریں گے اور پھر تسلسل کے امکانات پر غور وخوض کرنے کی کوشش کریں گے۔

غالب کے اردو خطوط:

جناب کاظم علی خاں نے خطوط غالب کے تحقیقی مطالعہ میں ایک کامل فہرست بنا کر غالب کے اردو خطوط کی تعداد آٹھ سو تہتّر (873) بتائی ہے جو غالب نے

نوّے(90) سے زیادہ اشخاص کو لکھّے۔ غالبؔ نے سب سے زیادہ خطوط یعنی ایک سو تئیس (123) خط ہرگوپال تفتہ کو لکھے۔ غالب کے اردو خطوں کا پہلا مجموعہ ''عود ہندی'' 1888ء میرٹھ میں مطبع مجتبائی سے شائع ہوا۔اس کا تاریخی نام ''مہر غالب'' ہے۔غالب کے اردو خطوط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک بازار میں بیٹھے ہوئے ہر آنے جانے والے سے سلام ودعا کررہے اور خط بھی لکھ رہے ہیں۔اپنی خطوط نگاری کے طرز پر خود غالب 'پنج آہنگ' میں لکھتے ہیں:

> ''میرا طریقہ یہ ہے کہ جب خط لکھنے کے لیے قلم اور کاغذ اٹھاتا ہوں تو مکتوب الیہ کو کسی ایسے لفظ سے جو اس کی حالت کے مطابق ہو پکارتا ہوں اور اس کے بعد ہی مطلب شروع کردیتا ہوں۔القاب وآداب کا پرانا طریقہ شکروشکوہ وشادی وغم کا قدیم رویہ میں نے بالکل ترک کردیا ہے۔'' (پنج آہنگ)

> ''یوسف مرزا۔ کیوں کر لکھوں کہ تیرا باپ مرگیا۔ اور اگر لکھوں تو پھر آگے کیا لکھوں۔اب کیا کر۔ مگر صبر۔ یہ ایک شیوۂ فرسودہ ابنائے روزگار ہے۔تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں۔ کہ صبر کرو۔ ہائے ایک کا کلیجہ کٹ گیا اور لوگ اُسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ۔ بھلا کیوں کر نہ تڑپے گا۔ صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی۔ دعا کو دخل نہیں۔ دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا۔ پھر باپ۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سروپا کسے کہتے ہیں؟ تو میں کہوں گا یوسف مرزا کو............''

غالبؔ نے اپنے بارے میں خود کہا تھا کہ میں شاعر، انشاپرداز، مزاح نگار اور بلند مرتبت ہوں ۔

شاعرم منیثم ظریف و شریف

این اضافات چند را دارم

اسی لیے ان کے خطوں میں ظرافتی اسلوب مشخص ہے۔ ذیل میں چند خطوط کے اقتباسات پیش ہیں۔

۱۸۵۹ء میں دہلی میں وبا پھیلی۔ میر مہدی مجروحؔ اس وقت تک پانی پت ہی میں تھے۔ مرزا سے انھوں نے وبا کا حال دریافت کیا۔ مرزا نے جواب دیا کہ وبا یہاں نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ لکھی:

''وبا تھی کہاں جو میں لکھوں کہ اب کم ہے یا زیادہ۔ ایک چھیاسٹھ برس کا مرد اور ایک چونسٹھ برس کی عورت ان دونوں میں سے ایک بھی مرتا تو ہم جانتے کہ ہاں وبا آئی تھی تف بریں وبا۔''

میر مہدی نے آشوب چشم کی شکایت لکھی۔ مرزا نے جواب میں یہ توجیہ کی۔

''تمھاری آنکھوں کے غبار کی وجہ یہ ہے کہ جو مکان دلّی میں ڈھائے گئے اور جہاں جہاں سڑکیں نکلیں۔ جتنی گرد اڑی۔ اُس کو آپ نے از راہ محبت اپنی آنکھوں میں جگہ دی۔''

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے۔ مرزا نے اپنے مرنے کی تاریخ اپنی زندگی ہی میں کہہ لی تھی۔ جس کی رو سے ۱۲۷۷ھ تھے۔ ۱۲۷۷ھ میں دہلی میں وبا پھیلی۔ میر مہدی مجروحؔ نے مرزا کو لکھا کہ کہیے اب تو یہ سال بخیر گزر گیا۔ اس سلسلے میں آپ کیا فرماتے ہیں۔ مرزا نے جواب میں لکھا کہ:

''میاں ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی۔ مگر میں نے وبائے عالم میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسر شان

تھی۔ بعد رفع فساد ہوا سمجھ لیا جائے گا۔''

۱۸۶۲ء میں دلی میں اس زور کی برسات ہوئی کہ لوگ عاجز ہو گئے۔ سینکڑوں مکانات منہدم ہو گئے اور جو رہے وہ بھی بارش کی وجہ سے خراب و خستہ تھے۔ چھتیں ٹپکنے لگیں۔ سامان برباد ہو گئے۔ اسی عالم کا مرزا نقشہ کھینچتے ہیں:

''جولائی سے مینہ شروع ہوا۔ اور مینہ کی نئی صورت۔ دن میں دو چار بار برسے اور ہر بار اس زور سے کہ ندی۔ نالے بہہ نکلیں۔ بالا خانہ کا جو دالان میرے بیٹھنے، اٹھنے، سونے جاگنے۔ جینے مرنے کا محل ہے اگرچہ گرا نہیں۔ لیکن چھت چھلنی ہو گئی۔ کہیں لگن۔ کہیں چلمچی۔ کہیں اوگلدان رکھ دیا۔ کشتی نوح میں تین مہینے رہنے کا اتفاق ہوا۔ اب نجات ہوئی ہے۔''

ٹپکتی ہوئی چھت کی چھلنی سے تشبیہہ تو خیر ایک پُرانی تشبیہہ ہے مگر گھر کو کشتی نوح سے تشبیہہ دینا صرف غالبؔ کا حصہ تھا۔

مرزا ایک مدت تک رام پور رہنے کے بعد اپنے گھر آئے۔ تو مرزا تفتہ کو اپنے آنے کی اطلاع دی اور اسی اطلاع میں اپنے گھر پہنچنے کی تشبیہہ بھی دی۔ لکھتے ہیں:

''لو صاحب کھچڑی کھائی دن بہلائے۔ کپڑے پھاٹے گھر کو آئے۔ ۸/ جنوری ماہ و سال حال غضب الٰہی کی طرح اپنے گھر پر نازل ہوا۔''

میر مہدی کو لکھتے ہیں:

''مولانا غالب علیہ الرحمۃ ان دنو ں بہت خوش ہیں۔ پچاس ساٹھ جزو کی کتاب امیر حمزہ کی داستان۔ اور اسی قدر حجم کی ایک جلد بوستاں خیال کی آ گئی ہے۔ پندرہ بوتلیں بادۂ ناب کی

توشک خانہ میں موجود ہیں۔ دن بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں
رات بھر شراب پیا کرتے ہیں۔''

امراؤ سنگھ مرزا تفتہ کے دوست یا عزیز تھے۔ان کی دوسری بیوی کا انتقال ہوا۔ تفتہ نے مرزا کو بھی یہ حال لکھا۔ مرزا صاحب نے ان الفاظ میں تعزیت کی۔ اور تعزیت کے ساتھ ہی ایک لطیفہ بھی شامل کر دیا جس کو پڑھ کر کم سے کم تھوڑی دیر کے لیے رنج وغم ضرور دور ہو جاتا ہے۔

''امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں۔ اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے۔ تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے اس کو سمجھاؤ کہ تیرے بچوں کو میں پال لوں گا تو کیوں بلا میں پھنستا ہے۔''

مرزا حاتم بیگ مہر کی ایک محبوبہ کا گل حیات پژمردہ ہوا۔ مرزا کو خبر ہوئی تو ان الفاظ میں تعزیت کی۔

''سنو صاحب شعرا میں فردوسی، اور فقرا میں حسن بصری، اور عشاق میں مجنوں، یہ تین آدمی ہیں فن میں سر دفتر اور پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے۔ فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے۔ عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہو۔ لیلیٰ اس کے سامنے مری تھی۔ تمھاری محبوبہ تمھارے سامنے مری۔ تم اُس سے بڑھ کر ہوئے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں اور تمھاری معشوقہ تمھارے گھر میں مری۔ بھئی مغل بچے بھی

غضب ہوتے ہیں۔ جس پر مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں۔ عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی کہ زخم مرگ دوست کھائے ہوئے ہیں۔ مغفرت کرے چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے۔ باآنکہ یہ کوچہ چھٹ گیا۔ اس فن سے بیگانہ محض ہوگیا ہوں۔ لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔''

سرسید کے خطوط:

سرسید نے بے شمار خطوط لکھے جنھیں بعد میں سر راس مسعود، اسماعیل پانی پتی اور مشتاق حسین نے ایڈٹ کر کے شائع کروائے۔ سرسید نے بعض مقامات پر غالبؔ کے خطوط کی تقلید بھی کی۔ سرسید کے عموماً خطوں میں سادگی سلاست اور بیباکی ہوتی تھی جو ان کی فطرت اخلاق اور سیرت کا پرتو تھا۔ ان کے بعض خطوط جن میں علمی مباحث ہیں وہ طولانی اور سائنٹفک طور پر لکھے معلوم ہوتے ہیں۔ ہم یہاں حالی کو لکھے گئے مکتوب جس میں مسدس حالیؔ پر تبصرہ بھی ہے نمونہ کے طور پر پیش کرتے ہیں:

''جناب مخدوم ومکرم من!

عنایت نامجات مع پانچ جلد مسدس پہنچے۔ جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی، جب تک ختم نہ ہوئی، ہاتھ سے نہ چھوٹی اور جب ختم ہوئی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہوگئی اگر اس مسدس کی بدولت فن شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جاوے تو بالکل بجا ہے۔ کس صفائی اور خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے، بیان سے باہر ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ایسا واقعی مضمون جو مبالغہ، جھوٹ، تشبیہات، دور از کار ہے، جو مایہ ناز شعرا اور شاعری

ہے، بالکل مبرّا ہے، کیونکر ایسی خوبی وخوش بیانی اور موثر طریقے پر ادا ہوا ہے۔ متعدد بند اس میں ایسے ہیں جو بے چشم نم پڑھے نہیں جا سکتے۔ حق ہے، جو دل سے نکلتی ہے، دل میں بیٹھتی ہے۔ (دیباچے کی) نثر بھی نہایت عمدہ اور نئے ڈھنگ کی ہے۔ (نظم میں) پرانی شاعری کا خاکہ نہایت لطف سے اڑایا ہے یا ادا کیا ہے۔ میری نسبت جو اشارہ اس نثر میں ہے اُس کا شکر ادا کرتا ہوں اور آپ کی محبت کا اثر سمجھتا ہوں۔ اگر پرانی شاعری کی کچھ بو اس (کتاب) میں پائی جاتی ہے تو صرف اُنہی الفاظ میں ہے جن میں میری طرف اشارہ ہے۔ بے شک میں اس (نظم) کا محرک ہوا اور اس کو میں اپنے اُن اعمال حسنہ میں سمجھتا ہوں کہ جب (قیامت میں) خدا (مجھ سے) پوچھے گا کہ تو (اعمال میں سے) کیا لایا؟ میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوالایا ہوں، اور کچھ نہیں۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے اور قوم کو اس سے فائدہ بخشے۔ مسجدوں کے اماموں کو چاہیے کہ نمازوں میں اور خطبوں میں اسی کے بند پڑھا کریں۔ آپ نے یہ نہیں ارقام فرمایا کہ کس قدر کتابیں چھپی ہیں اور کیا لاگت لگی ہے اور فی کتاب کیا قیمت مقرر کی ہے۔ نہایت جلد آپ ان جملہ امور سے مجھے مطلع فرمائیے۔ یہ بھی لکھیے کہ بعد تقسیم یا فروخت کس قدر کتابیں اب تک موجود ہیں۔

آپ کے اس خیال کا کہ (کتاب کا) حق تصنیف (اشاعت) مدرسۃ العلوم کو دیا جاوے اور رجسٹری کرادی جاوے، میں دل سے شکر کرتا ہوں۔ مگر میں نہیں چاہتا کہ اس مسدس کو، جو قوم کے حال کا آئینہ اور یا اُن کے ماتم کا مرثیہ ہے، کسی قید سے مقید کیا جاوے۔ جس قدر چھپے اور جس قدر وہ مشہور ہو اور لڑکے ڈنڈوں پر گاتے پھریں اور رنڈیاں مجلسوں میں طبلے سارنگی پر گاویں، قوال درگاہوں میں گاویں، حال لانے والے اس سچے حال پر حال لاویں، اُسی قدر مجھ کو زیادہ خوشی ہوگی۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ دہلی میں ایک مجلس کروں جس میں تمام اشراف، (دہلی جمع) ہوں اور رنڈیاں

نچواؤں، مگر وہ رنڈیاں بھی مسدس گاتی ہوں۔ میں اس کل مسدس کو ''تہذیب الاخلاق'' میں چھاپوں گا۔ میرے اُن استفسار کا جواب، جن پر نشان درج کر دیا ہے بہت جلد مرحمت ہو۔

والسلام

خاکسار، آپ کا احسان مند تابعدار، سید احمد

شملہ پارک، ہوٹل، 10 جون 1879ء

غالبؔ کی تقلید کرنے کی کچھ ناکام کوشش جو اپنے قریبی دوست زین العابدین کے خطوط میں ہے ملاحظہ ہو:

> ''مکرمی زینو بھیاّ ابھی تمھارا خط پہنچا...... زبان کھجلاتی ہے اور کوئی یہاں نہیں ہے جس کو برا کہوں۔ دل میں غصہ آتا ہے اور کوئی یہاں نہیں ہے جس پر غصہ نکالوں۔ ہاتھ کھجلاتے ہیں اور کوئی یہاں نہیں ہے کہ جس کو ماروں۔ حقیقت میں تمھارے جانے سے مکان سونا نہیں ہوا بلکہ دل سونا ہو گیا۔ صبح اٹھ کر خدا یاد نہیں آتا مگر تم یاد آتے ہو۔''

میر انیس کے خطوط:

اردو کے چار بڑے شاعروں میں غالبؔ اور اقبالؔ کے اردو خط ہمیں ملتے ہیں۔ میر تقی میرؔ کا کوئی خط موجود نہیں، میر انیسؔ کے سات خط فارسی کے محفوظ رہے جس کا راقم نے اردو میں ترجمہ کیا اور یہ بتایا کہ اگرچہ اُس دور کے رسم کے مطابق خط فارسی میں لکھے گئے لیکن ان کے مطالب سے میر انیسؔ اور ان کے دور کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی

ہے۔

خطوط کے تراجم پیش کرنے کے بجائے ان کے نکات کو یہاں پیش کرتے ہیں۔

''میر انیس کے صرف سات خط ہمارے پاس موجود ہیں جبکہ میر انیسؔ کے بھائیوں اور فرزندوں کے کوئی ڈیڑھ سو خطوط صرف بنارس کے ان صاحبوں کے پاس موجود تھے جن سے اس خاندان کے روابط تھے اور ان خطوں کو ادیب کے کہنے پر مطلب حسین نے سید حسن ابراہیم فرزند سید صادق سے لے کر نقل کر لیا تھا۔

ا۔ یہ تمام خطوط فارسی میں ہیں

ب۔ ان سات خطوں میں پانچ دولہی پور ضلع بنارس کے دو بھائیوں سید علی اور سید صادق کے نام ہیں۔ ایک خط انیسؔ نے حیدر آباد سے اپنے چھوٹے بھائی مونس کو لکھا اور ایک مختصر خط علامہ مفتی میر محمد عباس شوستری کے نام ہے جو ان کی مثنوی من و سلویٰ کی تعریف میں لکھا گیا۔

ج۔ یہ خطوط صرف رسمی طرح پر لکھے گئے ہیں لیکن ان خطوں سے کچھ اطلاعات ملتی ہیں جو انیسؔ کی شخصیت اور حیات کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔

ا۔ دولہی پور ضلع بنارس کے رہنے والے دو حضرات سید علی اور سید صادق ہر سال اپنے باغ کے عمدہ آم

میر انیسؔ کو روانہ کرتے جنھیں میر انیسؔ اپنے رشتہ داروں میں تقسیم کر دیتے۔ ان کے باغ کے لنگڑا آم مشہور تھے۔

۲۔ میر انیسؔ آم کے شوقین تھے اور لنگڑا آم ان کا پسندیدہ تھا۔

۳۔ بعض لکھنؤ ریلوے کے ملازم آموں کی چوری کر لیتے تھے۔

۴۔ ان خطوں میں انیسؔ کی ان کے منجلے بھائی ''اُنس'' سے رنجش بھی ظاہر ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں: ''وہ آج کل انیسؔ کے بجائے مونسؔ کے مرثیے پڑھتے ہیں۔

۵۔ میر انیسؔ کے مرثیے غدر کے بعد چوری ہو گئے تھے۔

۶۔ آخری عمر میں بیماریوں کی وجہ سے مرثیہ نگاری میں فرق ہو گیا تھا۔

۷۔ وہ اچھا بنارسی گل بدن کپڑا اپنے دوستوں کو پیسے روانہ کر کے منگواتے تھے۔

۸۔ اپنے دوستوں کی مشکلات کو اپنی پریشانیاں سمجھ کر ان کی فکری مدد کرتے۔ بعض اوقات دوستوں کے خاندانی جھگڑوں میں صافی اور دوستی پیدا کرتے تھے۔ عورتوں کے حقوق کی پاسداری کی مثال ایسی

اس زمانے میں کہیں نظر نہیں آتی۔

۹۔ اگرچہ میر انیسؔ صرف ایک بار آخری عمر میں حیدر آباد دکن مرثیہ پڑھنے کے لیے گئے لیکن اس کے مفصل معتبر حالات ہمارے درمیان موجود ہیں۔ ارسطو صاحب کے کئی مفصل خطوں میں حیدر آباد کے سفر کی اطلاعات درج ہیں۔

علامہ اقبال کے خطوط:

علامہ اقبالؔ کے تقریباً ڈیڑھ ہزار خطوط مظفر برنی صاحب نے چار جلدوں میں شائع کئے ہیں۔ علامہ نے اردو انگریزی کے علاوہ ویگانسٹ کو جرمن میں المراغی کو ایک خط عربی میں اور سعید نفیسی کو دو خط فارسی میں تحریر کیے۔ علامہ کے خطوط اقبالیات کا ایک اہم حصہ ہیں۔ راقم نے علامہ کے (۲۵۱) خطوط سے جن میں وہ اپنی بیماریوں کا ذکر کرتے ہیں ایک کتاب ''چوں مرگ آید'' تدوین وتصنیف کی جس سے علاّمہ کی تمام جسمانی مسائل اور بیماریوں کا ہمیں علم ہوتا ہے۔ اس موقع پر کسی خاص خط کا حوالہ دیے بغیر یہی کہنا چاہتا ہوں کہ علاّمہ کے مستند خطوط سے بہت سے اقبالیات کے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ اقبال ۳۰ رمئی ۱۹۳۵ء کو انگریزی میں سر راس مسعود کو نواب آف بھوپال کا پانچ سو روپیہ وظیفہ ملنے پر لکھتے ہیں۔ (ترجمہ)

''میں کس زبان سے اعلیٰ حضرت کا شکریہ ادا کروں۔ انھوں نے ایسے وقت میں میری دستگیری کی جب کہ میں چاروں طرف سے آلام و مصائب میں محصور تھا۔ خدا تعالیٰ ان کی عمر و دولت میں برکت دے۔''

خواجہ حسن نظامی کے خطوط:

خواجہ صاحب نے خطوط نویسی میں خاصی روش استعمال کی۔ وہ اپنی تیرہ سالہ اکلوتی بیٹی ''حور بانو'' کو کئی قطعوں میں ظرافت اور خوش طبیعت کے اظہار کے ساتھ نصیحتیں کرتے ہیں۔ یہ خطوط بچوں کی تربیت کا نمونہ بن سکتے ہیں۔

جو خط بیوی کو لکھے۔ یہ ان کی دوسری بیوی کے نام ہیں جس کو حور بانو کی ماں کے انتقال کے بعد نکاح کیا۔ ہمارے کلچر میں بیوی شوہر کا نام نہیں لیتی چہ جائیکہ ایسی رومانی تحریریں لیکن خواجہ صاحب نے اسے شائع کر کے بتایا کہ اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ بیوی کو ہر ایک خط میں ایک نئے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ میری لیلا، تمھارا مجنوں، میری آنکھوں والی پتلی، میری چاندسی بٹیا، محرم راز من، مرے دل لینے والی لیلیٰ، میری مہتابی، میری دردسر کی صندل وغیرہ۔

سلطان باغ حیدر آباد

لیلیٰ جانی! آج صبح کی ڈاک میں اتوار کے سبب تمھارا خط نہیں آیا۔ شاید شام کو آئے گا۔

میں اس وقت ایک بہت ہی خوبصورت مقام پر ہوں، اس کا نام سلطان باغ ہے مگر درحقیقت یہ دل باغ ہے، نواب اقبال الدولہ بہادر سابق وزیر اعظم حیدر آباد کے پوتے نواب محمد ابوالفتح خاں اس میں رہتے ہیں۔ جنھوں نے آج مجھے یہاں مدعو کیا ہے۔ کھانا کھا کر گاناسن کر اوپر کی منزل پر آیا ہوں۔ سامنے پہاڑ ہیں، ندیاں نظر آتی ہیں۔ مگر یہ حسین ساگر تالاب کا نظارہ ہے۔ ندیاں نہیں ہیں، تم یہ دیکھتیں تو بہت خوش ہوتیں، میں نے

ابھی لیلیٰ کا قصہ قوالی میں سُنا ہے اس لیے اپنی لیلیٰ کو درِ دل سناتا ہوں۔

میری لیلیٰ۔ میری لیلیٰ۔ میں اس باغ میں سب کچھ پاتا ہوں، دنیا کی سب بہار اس میں ہے، مگر تم نہیں ہو تو کچھ نہیں ہے۔

یہ شہر سے آٹھ دس میل دور ہے اور جنگل میں میں بالکل اکیلا ہے، اگر دور نہ ہوتا تو میں ہمیشہ یہیں آ کر ٹھہرا کرتا۔

تمھاری یاد میں غمگین۔ حسن نظامی

مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط ''غبارِ خاطر'' میں:

خط کسی شخص کے کردار حیات کو صحیح طور پر معلوم کرنے کا عمدہ ذریعہ ہے۔ خط سے اس کی زندگی کے خدوخال نمایاں ہوتے ہیں۔ اس سے نہ صرف اندرونی کیفیات نمایاں ہوتی ہیں بلکہ ان کے نقطہ نظر سے آگاہی ہوتی ہے۔ غبار خاطر آزاد کے مکاتب کا مجموعہ ہے جو انھوں نے قلعہ احمد نگر کی جیل میں لکھے اور مکتوب الیہ ان کے دوست حبیب الرحمٰن شیروانی تھے جن کو وہ صدیق لکھتے تھے۔ یہ خطوط جمع ہوتے گئے اور جیل سے رہائی کے بعد اجمل خاں کے اصرار پر ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئے۔ آزاد جانتے تھے کہ یہ خطوط ابھی کوئی نہیں پڑھ رہا ہے۔ جس میں علمی ثقافتی اور نجی مسائل اور نظام الاوقات تھا۔ ان خطوں میں فرضی نام تھے لیکن ان کی تاریخی اہمیت تھی۔ جسے احمد نگر کی جیل کے سپرنٹنڈنٹ Sandek کا نام چیتیہ خان رکھا تھا جو چاند بی بی کے قلعے کا دربان حبشی تھا۔

لفظوں سے معنی نکالنے کے لیے بڑے چڑے کا نام جو بہادر تھا قلندر، جھگڑالو کا

نام مُلّا ،اور خاموش کا نام صوفی رکھا۔

مولانا کے خطوں کو پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ وہ بہت جلد سحر کو اٹھتے ،خود چائے بناتے اور چائے کے ساتھ سگریٹ کے کشوں کا نشہ ان ہی سے سنیے۔ ’’خوش باش دمی کہ زندگانی این است‘‘ خطوط تاریخی دستاویز ہے جوان کی زندگی کے بہت سے گوشوں کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ خط کی تحریر کیا ہے۔شعریت اور شاعری ہے نثر میں۔ انھوں نے تاریخ، فلسفہ دیگر رموز حیات کی عقدہ کشائی کی ہے۔بیسیوں اشعار عربی فارسی کے نظم کیے ہیں جس کو راقم نے تقریباً (۹۰۰) اشعار آزاد کی شعرفہمی کے تجمع آوری کی ہے۔

یہ ایک اہم سوال؟

کیا غبار خاطر خطوط کا مجموعہ ہے یا انشائیوں کا۔ بعض ادیبوں نے اسے انشائیہ کہا ہے جس میں دماغ کی ترنگ ہے جو شخصی جذبات اور احساسات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ یہاں جولانی ہے مگر گرمی نہیں۔ یہاں اشعار ہے مگر پراگندگی نہیں یہ دماغ سے زیادہ دل پر اثر کرتی ہے۔آزاد خود کہتے ہیں۔ بارہا ایسا ہوا کہ میں اپنے خیالات میں محو لکھنے میں مشغول ہوں اتنے میں کوئی دل نشیں بات نوک قلم پر آ گئی اور بے اختیار اس کی کیفیت کی خود رفتگی میں میرا سر وشانہ ہلنے لگا اور منہ سے ’ہا‘ نکل گیا۔یہی وہ کیفیت ہے جس کو Johson دماغی ترنگ کہتا ہے۔

خطوں کے متن یا انشائیہ پڑھیے اور سر دھنیے:

> ’’فرماتے ہیں۔‘‘ میں آپ کو یاد دلاؤں گا کہ انسان کا اصل عیش دماغ کا عیش ہے، جسم کا نہیں۔ میں لذتیت سے ان کا دماغ لے لیتا ہوں۔ جسم ان کے لیے چھوڑ دیتا ہوں۔ عیش و عشرت کی جن گل شگفتگیوں کو ہم چاروں طرف ڈھونڈتے ہیں اور نہیں

پاتے وہ ہمارے نہاں خانۂ دل کے چمن زاروں میں ہمیشہ کھلتے
اور مرجھاتے رہتے ہیں۔لیکن محرومی ساری یہ ہوئی کہ ہمیں
چاروں طرف کی خبر ہے مگر خود اپنی خبر نہیں وفی انفسکم
افلاتبصرون، جنگل کے مور کو کبھی باغ و چمن کی جستجو نہیں ہوئی۔
اس کا چمن خود اس کی بغل میں موجود رہتا ہے۔ جہاں کہیں اپنے
پر کھول دے گا ایک چمنستان بوقلموں کھل جائے گا۔

اب قوت سامعہ کی لطافت و نفاست کا اندازہ کیجیے ۔
''دوسرے دن صبح برآمدہ میں بیٹھا تھا کہ بلبل کے ترانے کی آواز
پھر اٹھی۔ میں نے ایک صاحب کو توجہ دلائی کہ سننا بلبل کی آواز
آ رہی ہے۔ایک دوسرے صاحب جو صحن میں ٹہل رہے تھے کچھ
دیر کے لیے رک گئے اور کان لگا کر سنتے رہے پھر بولے کہ ہاں
قلعہ میں کوئی چھکڑا جا رہا ہے۔ اس کے پہیوں کی آواز آ رہی
ہے۔سبحان اللہ ذوق سماع کی دقت امتیاز دیکھیے بلبل کی نواؤں
اور چھکڑے کے پہیوں کی ریں ۔ ریں میں یہاں کوئی فرق
محسوس نہیں ہوتا۔ (مکتوب ۴۳۔۲۔۳)

خطوں میں عاشقی کے خطوط سے کون واقف نہیں۔'' خط لکھ دے ساونیا کے نام بابو'' ایک دیہاتی لڑکی کا نغمہ آج بھی فضاؤں میں گونج رہا ہے۔ پہلے زمانے میں عاشق کے خطوط یا رقعے جو عطر میں بھیگے ہوتے یا پنکھڑیوں سے رنگین ہوتے کبوتروں کے ذریعے عاشق کے پیغام کو معشوق تک لے جاتے تھے۔ دو شعر پر یہاں اکتفا کرتا ہوں۔

خط کبوتر کس طرح لے جائے بام یار پر
پَر کترنے کو لگیں ہیں قینچیاں دیوار پر

خط کبوتر اس طرح لے جائے بام یار پر
خط کا مضموں ہو پروں پر، پَر کٹیں دیوار پر

غداروں کے خطوط جس سے اردو ادب متاثر ہوا:

- انگریز 1600ء میں تاجروں کے روپ میں ہندوستان میں داخل ہوئے اور انھوں نے رفتہ رفتہ رسوخ حاصل کیا۔
- 1765ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان کے کئی علاقوں سے لگان وصول کرنے کے اختیارات مل گئے۔
- اہل ہندوستان کی بدقسمتی یہ رہی کہ مفاد پرست لوگ انگریزوں کا آلہ کار بنتے رہے۔
- 1756-57 بنگال میں سراج الدولہ کے سپہ سالار میر جعفر کی غداری سے پلاسی کی جنگ میں شکست۔
- غلام علی قاسم علی میر صادق کی غداری سے ٹیپو کو شکست ہوئی۔
- 1803 میں مرہٹوں کو شکست دے کر تخت دہلی پر قبضہ کر کے بادشاہ شاہ عالم کی پنشن (Pension) مقرر کردی اور انگریز King of the Soil ہوگئے۔ 1837 میں شاہ ظفر کو نام نہاد بادشاہ بنایا۔ 1843 میں سندھ 1849 میں پنجاب، 1856 میں اودھ اور پھر دہلی کی حکومت کا خاتمہ۔

غداروں کے خطوط ، انڈیا آفس لائبریری ریکارڈ میں موجود ہیں۔ یہ خطوط Robert Montagmery کے کاغذات میں ہیں۔ یہ اردو خطوط کے تراجم ہیں اور دس خط اردو میں بھی عمدہ کاغذ پر لکھے موجود ہیں۔ ہوتا یہ تھا کہ مخبروں کے خطوں کو انبالہ روانہ کیا جاتا تھا جہاں جارج لیون انھیں انگریزی میں ترجمہ کروا کر چیف کمشنر

لارنس کے پاس بھیجتا جو اپنے نوٹس کے ساتھ پنجاب کے جوڈیشنل کمشنر Sir Robert Montagmery کو بھیجتا۔

خطوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مخبروں اور غداروں کی تعداد طویل ہے۔ جو آزادی کے متوالوں کو خاک میں ملانے کے پلان بناتے تھے۔ایسے مخبر تھے جو ایک طرف آزادی خواہوں اور دوسری طرف انگریزوں کے ایجنٹ تھے۔ان میں قابل توجہ الٰہی بخش، رجب علی، گوری شنکر اور جیون لال کے نام سرفہرست ہیں۔

جو کچھ اب تک بیان کیا گیا وہ خطوط نگاری کی تاریخی، علمی، ادبی، ثقافتی، تخلیقی اور تنقیدی داستان تھی جس میں زیب داستان کے طور پر مشاہیر اُردو شعر وادب کے خطوط کے نمونے اور ان پر مختصر جامع تبصرے بھی پیش کیے گئے تاکہ خطوط نگاری کی مستحکم روایت کی اہمیت معلوم ہو سکے۔

آج کی اکیسویں صدی کے ٹکنالوجی کے دور میں جہاں الیکٹرونک میڈیا نے گلوبل ویلیج میں نئی نئی ایجادات کے ذریعے زندگی کے ہر شعبے کو بڑی حد تک بدل دیا ہے چنانچہ اُردو شعر وادب میں خصوصاً خطوط نگاری بھی شدت سے متاثر ہو چکی ہے۔ آج کل خطوط سے وابستہ محکمے بھی مشکلات سے دوچار ہیں۔صدیوں سے ہر ملک اور مقام پر خطوط نگاری کا روٹی روزگار سے رشتہ جڑا ہوا تھا، خط لکھنے والے سے خط پہنچانے والے تک ہر گام پر افراد کی ضرورت ہوتی اس طرح روزگار کی سہولتیں اور شہر کی رونقوں میں اضافہ ہوتا۔ چنانچہ جہاں تک برصغیر کا تعلق ہے ہزار سال قبل شیر شاہ سوری کے دور میں شہروں کے درمیان اچھی اچھی سڑکیں ہر چالیس پچاس کوس پر چوکیں جہاں ہرکارے اور تازہ دم گھوڑے خطوں کو ایک شہر سے دوسرے شہر بہت کم عرصے میں حفاظت کے ساتھ پہنچا دیتے تھے۔آج کل ڈیجیٹل اور انگلی کی حرکت سے کمپیوٹر کے پردے پر متن اور مطلب سیکنڈ میں بھیجا جاتا ہے۔یہی نہیں بلکہ اسی ثانیے

اس کا جواب بھی موصول ہو جاتا ہے۔اس جدیدیت اور وقتی انقلاب کی وجہ سے لوگوں سے یہ امید رکھنا بے سود ہے کہ وہ روایتی خطوط نگاری جس میں متن کے ساتھ ساتھ علمی ادبی ظرافتی چاشنی ہوتی تھی اب اُس طرف کون توجہ کرے گا۔روایتی خطوط نگاری میں مشاہیر نے اپنا اپنا جدا اسلوب بنایا۔اب ایسا تخلیقی خط کون لکھے گا اگر کسی نے اس طرف توجہ خاص بھی کی تو وہ روایت اب رسم نہیں ہو سکتی چنانچہ اردو خطوط نگاری کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ اکابرین اس طرف متوجہ ہوں۔

ایک اور اہم مسئلہ رسم الخط کا برصغیر اور اردو کی نئی بستیوں میں ناپید ہونا بھی ہے۔اب اردو کانوں کی زبان ہو کر رہ گئی ہے۔آنکھوں کی زبان باقی نہیں رہی۔عوام اردو سمجھ سکتی ہے لیکن پڑھ اور لکھ نہیں سکتی۔چنانچہ خطوط نگاری اس کے بغیر ممکن نہیں۔یہ صحیح ہے کہ آج کے دور میں بھی خط یا لیٹر مستند تحریر ہے اس لیے آج بھی علمی، ادبی، سماجی اور قانونی کاروائیوں میں اس کا استفادہ ہے۔چنانچہ کمپیوٹر کے پردے کے عکس کے علاوہ مطبوعہ خط کی اصلی شکل جس کو ہارڈ کاپی کہتے ہیں معتبر مانی جاتی ہے جس میں محرمانہ مطالب محفوظ کیے جا سکتے ہیں اور ڈیجیٹل پردے کی طرح ان میں تبدیلی ممکن نہیں۔

شعر و ادب ہر دور میں کچھ کھوتا ہے اور کچھ پاتا ہے لیکن قدرتی چشمہ کی طرح پہاڑوں کو کاٹتا اور سنگلاخ ویرانوں سے گزر کر نخلستان کو شاداب کرتا رہتا ہے اس لیے تشویش کے ساتھ یہ بھی تشفی ہوتی ہے کہ اگر خطوط نگاری مراسلے کے طور پر کم ہو جائے تو شاید تخلیقی مکالمے کی طرح اشعار، افسانوں، کہانیوں، انشائیوں اور نجی مراسلوں میں باقی رہے اور جو خطوط نگاری کا خزینہ ہمارے ادبا، شعرا اور حکما نے یادگار چھوڑا ہے صدیوں تک معلومات کے ساتھ فکر و ذوق کا منبع بنا رہے۔

آج ضرورت ان خطوط کی جمع آوری اور حفاظت کی ہے۔آج بھی سینکڑوں خطوط پراگندہ اور غیر محفوظ لوگوں کے پاس ہیں۔جدید دور میں خط کی فوٹو کاپی یا عکس

بڑی بات نہیں۔ کئی عمدہ اور مستند خطوط مخطوطات میں دبے پڑے ہیں۔ ان کی شناخت، تحقیق اور تنقید میں مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔ کئی خطوط فارسی میں موجود ہیں جن کا اردو شعروادب سے تعلق ہے کیونکہ متقدمین اردو میں تو شعر کہتے تھے لیکن فارسی میں مکتوب نگاری کرتے تھے۔ ان خطوں کا سلیس اردو میں ترجمہ ضروری ہے۔

قدیم کتابوں، گلدستوں، اخباروں، مجلوں اور رسالوں میں ادب فہم ادب پرور اور مشاہیر شعروادب کے خط شائع ہوئے ہیں۔ یہ خطوط بڑی اہمیت کے حامل ہیں کیوں کہ بعض خطوں میں اہم علمی اورادبی وشعری مسائل پر عالمانہ گفتگو ہے۔ حالات حاضر پر تبصرہ ہے۔ یہی خطوط ہیں جن سے مطالب چن کر اردو کی تاریخ لکھّی جاسکتی ہے۔

اگر جدید ٹکنالوجی کی مدد سے آسان اردو ٹائپ بن جائے جس میں انگریزی ٹائپ کی طرح کی تیزی اور سہولت ہو اور اردو رسم الخط کو عام کیا جائے۔ اردو کی بنیادی تعلیم گھروں اور مدرسوں میں دی جائے تو ممکن ہے اردو خط کمپیوٹر کے پردوں، صفحوں اور کتابوں میں جگہ پاتا رہے۔ ہاں بالکل سچ ہے۔ اب اس میں وہ رومانی عشقیہ متن جو محرمانہ ہوتا تھا کیسے لکھّا جائے۔ اب اس میں وہ گلاب کی سوکھپتیاں کس طرح رکھّی جائیں، اب اس میں وہ عطر ومشک کی خوشبو کس طرح بھری جائے شاید اس کا جواب نفی میں ہو۔

میں ممنون وشکر گزار ہوں جموں یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سرپرست پروفیسر شہاب عنایت ملک کا جن کی عنایت سے خطوط نگاری کا یہ شاندار سمینار برگزار ہوا، جس کی روشنی ہمیں خطوط نگاری کے خط پر باقی رہنے کی رہنمائی کرتی رہے گی۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

☆☆☆

'مکاتیبِ سرسید' کی عصری معنویت

______پروفیسر صغیر افراہیم

حضرت مخدوم اشرف الدین یحییٰ منیری کے مکتوبات کا مجموعہ ''مکتوباتِ صدی'' تقریباً چھ سو سال قبل قلمی صورت میں بالخصوص اُردو اور بالعموم تمام ہندوستانیوں کے لیے ایک نمونے کی حیثیت سے سامنے آچکا تھا۔ اسی کے تتبع میں غالبؔ کے ہم عصر صوفی اور ادیب وشاعر مولانا قیام اصدق کے مکتوبات کا مجموعہ ''مکتوبات اصدقی'' کے نام سے شائع ہوا۔ مکتوباتِ غالبؔ کی جو مقبولیت اُردو ادب میں ہے اُس سے تو سبھی واقف ہیں۔ رجب علی بیگ سرور، خواجہ غلام غوث بےخبر، نواب واجد علی شاہ، سرسید احمد خاں، شبلی نعمانی، امیر مینائی، داغؔ دہلوی، محسن الملک اور محمد حسین آزادؔ کے خطوط کے مجموعے غالبؔ کے عہد کی یاد تازہ کرتے رہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے مکتوبات کا مجموعہ ''غبارِ خاطر'' بیسویں صدی کی دین ہے اور اس کے بعد مسلسل اُردو مکتوبات کے متعدد انتخابات شائع ہوکر منظر عام پر آتے رہے۔

فی زمانہ مکتوبات نگاری کو باضابطہ ایک صنف قرار دیا جاچکا ہے اور اس موضوع پر ناقدین ادب مفصل گفتگو کر چکے ہیں۔ مکتوبات پر کی گئی اس تفصیلی گفتگو کے پس منظر میں عرض ہے کہ مکتوب نگاری بیک وقت حالِ دِل بیان کرنے کا ذریعہ بھی ہے اور اظہارِ علم کا منبع و ماخذ بھی۔ دل کی کیفیت بیان کرنے کے سلسلے میں مجازؔ کی بہن اور جاں نثار اختر کی اہلیہ صفیہ اختر کے مجموعے مکتوبات ''زیرِ لب'' کا ذکر کیا جاسکتا ہے

اورعلم کے اظہار کے لیے ذریعہ بنانے کا بہترین نمونہ مولانا ابوالکلام آزادؔ کا مجموعہ مکتوبات ''غبارِ خاطر'' کومثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہےاور دونوں کیفیات کی مِلی جُلی شکل فیض احمد فیضؔ کے مجموعہ مکتوبات ''صلیبیں مرے دریچے میں'بطور خاص قابل ذکر ہے۔

مختصراً یہ کہ اُردو میں مختلف النوع کے مکتوبات کا مجموعے موجود ہیں۔ ان سب کوسامنے رکھتے ہوئے بہ آسانی کہا جاسکتا ہے کہ مکتوب نگاری میں پہلی شرط یہ قرار پاتی ہے کہ سامنے کوئی موجود یعنی مخاطِب اور مخاطَب دونوں کا ہونا اشد ضروری ہے۔مکتوب نگاری کے ضمن میں یہ اتنی اہم بات ہے کہ ''غبارِ خاطر'' جیل میں لکھے گئے مکتوبات کا مجموعہ ہے اور مولانا آزاد جانتے تھے کہ یہ مکتوبات ،مکتوب الیہ تک پہنچ نہ پائیں گے۔نتیجتاً وہ خطوط لکھتے جاتے تھے اور اپنے پاس محفوظ کرتے جاتے تھے۔اس کے باوجود انھوں نے ایک مکتوب الیہ ضرور منتخب کرلیا تھا۔'مخاطِب اور مخاطَب' دونوں کی موجودگی کے بعد دوسری اہم شرط مکتوب نگاری کی یہ ہے کہ بیان بے تکلفانہ اور فطری ہو،اس میں شعوری طور پر کی گئی کدو کاوش شامل نہ ہو۔'زیرِ لب'' 'صلیبیں ،مرے دریچے میں' اور پنڈت جواہر لعل نہرو کا مجموعہ'' باپ کا خط بیٹی کے نام'' اسی بے تکلفی اور فطری اظہار کا حامل ہے۔ ہر چند کہ مولانا ابوالکلام آزادؔ کے خطوط میں یہ بے تکلفی اور فطری اظہار دستیاب نہیں ہے اس کے باوجود مولانا ابوالکلام آزاد کے یہاں بھی شعوری طور پر کی گئی کوشش کا سُراغ لگانا مشکل ہے کیونکہ مولانا قید خانے میں خط لکھ رہے تھے اور ظاہر ہے وہاں علم کے اظہار کے لیے حوالہ جاتی کُتب دستیاب نہیں تھیں۔انھیں جو یاد آتا گیا وہ سب لاشعوری طور پر ضبط تحریر میں آتا گیا۔خواہ معاملہ کسی علمی بحث کا ہو یا اشعار کا۔

اس طرح اب تک تین اہم نکات (۱۔مخاطِب اور مخاطَب کی موجودگی ۔۲۔ بے

تکلف فطری اظہار اور ۳۔ لاشعوری سلسلہ تحریر)۔ سامنے آئے۔ ان بنیادی نکات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مکتوبات کے ذریعے مکتوب نگار کی شخصیت کا نفسیاتی مطالعہ بھی قدرے آسان ہو جاتا ہے۔ مثلاً شبلیؔ نعمانی کے خطوط اُن کی علمی شخصیت کے گونا گوں پہلوؤں کے علاوہ ان کی جمالیاتی حِس کو بھی نمایاں کرتے ہیں ۔مولانا ابوالکلام آزادؔ کے مکتوبات مولانا کو پر ایک انا پسند شخص کے طور پر متعارف کراتے ہیں، جب کہ غالبؔ ایک ایسے قلندر کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں جس کی زندگی پر مشکلات کا سایہ ہے مگر جو اپنے پر بھی ہنسنے کا فن جانتا ہے اور دوسروں کو بھی چٹکیوں میں اُڑاتا رہتا ہے۔ دوسری طرف فیضؔ ایک بُردبار، موقع شناس مگر وہ وابستہ (Committed) آدمی بن کر اُبھرتے ہیں اور صفیہ اختر کے مکتوبات سے ایک ایسی خاتون کی تصویر اُبھر کر سامنے آتی ہے جو محبت کرنے والی اور شوہر کا حوصلہ بڑھانے والی بیوی کے ساتھ ساتھ انتہائی شفیق ماں اور پیاری بہن بھی ہے۔

اس وقت مکتوباتِ سرسید ہمارے پیش نظر ہیں جو بیک وقت حالِ دل بھی بیان کرتے ہیں۔ اپنے عہد سے روشناس بھی کراتے ہیں۔ اور بغیر کسی قافیہ پیمائی کے علم کے اظہار کا ذریعہ بھی بن جاتے ہیں۔ جیسا کہ گذشتہ صفحات میں کہا جا چکا ہے کہ کسی بھی عبقری شخصیت کی مدبرانہ اور قائدانہ صلاحیتوں کے تجزیہ و تفہیم میں اُس کے مکاتیب کا مطالعہ کلیدی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ مکتوب محض اطلاعات و خبروں کا مجموعہ ہی نہیں ہوتا بلہ اس کے توسط سے مکتوب نگار کی علمی و فکری بلوغت، ذہنی کیفیت قوم وملت کے تئیں احساسات وجذبات، بزرگوں سے عقیدت، چھوٹوں سے شفقت ومحبت کے علاوہ اُس عہد کی تاریخ، تہذیب وتمدن اور ثقافت سے کما حقہ واقفیت بھی ہو جاتی ہے۔ اسی لیے مکتوب نگار کو نصف ملاقات سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اُردو میں غالب کی خطوط نگاری اس کی بہترین مثال پیش کرتی ہے۔ جس میں عزیز، دوستوں

کو اپنے حالات سے آگاہ بھی کیا گیا ہے۔دوسری طرف غدر کے بعد آشوب وابتلاء کا جو سلسلہ شروع ہوا اُس کی اجمالی روئداد بھی غالبؔ کے خطوط میں ہمیں مل جاتی ہیں۔

سرسید کی شخصیت کثیر الجہات اور مجموعہ صفات تھی۔وہ ایک ہمدرد، مصلح ،مستند مورخ ،صاحبِ طرز انشا پرداز ،معتبر سیرت نگار اور خطیب کے علاوہ منفرد مکتوب نگار بھی تھے جن کے مکاتیب کی معنویت اکیسویں صدی میں بھی مسلم ہے۔سرسید کے مکاتیب ان کی قومی وملی، تاریخی وتہذیبی ،علمی وادبی اور صحافتی کارناموں کے بیش قیمت دستاویز ہیں جن کے مطالعے سے ہم سرسید کے افکار ونظریات اور اُن کے مشن تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ مکاتیبِ سرسید پر خاطر خواہ کام نہیں ہوسکا ورنہ اس بحر زخار سے بہت سارے گوہر آبدار قوم وملت اور علم وادب کو میسر آتے جو ہماری تہذیب وثقافت کا اہم سرمایہ ثابت ہوتا۔

مکتوباتِ سرسید کی ترتیب وتدوین کا آغاز یوں تو اُن کی زندگی میں ہی ہوگیا تھا لیکن اس سلسلے میں سنجیدگی نہیں برتی گئی ۔خواجہ الطاف حسین حالی سے لے کر عہد حاضر تک جتنے مجموعے شائع ہوئے اُن میں نہ تو تاریخی تسلسل ہے اور نہ ہی مستند اور معتبر اشارے قلم بند کیے گئے ۔ چند حواشی بھی ہیں تو آدھے ادھورے۔ مجھے اس بات کا اعتراف کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ سرسید کے مکاتیب پر دلجمعی ،یکسوئی اور تحقیقی طریقِ کار کے پیش نظر کام کیا جاتا تو یقیناً مثبت نتائج سامنے آتے اور کئی اہم حقیقتوں کے دریچے وا ہوتے۔

اس سے قبل کہ سرسید کی مکتوب نگاری کی انفرادیت ،معنویت اور موز ونکات کا معروضی تجزیہ پیش کیا جائے مناسب ہوگا کہ سرسید کے مکاتیب کے چند اہم مجموعوں کا اجمالی جائزہ پیش کردیا جائے۔اب تک کی تحقیق کے مطابق اس جانب پہلی

کوشش حکیم احمدالدین نواسۂ سرسید احمد خاں کی ہے۔جنھوں نے اپنے نانا کے ایک سو بائیس خطوط کو ان کی وفات (۲۷/مارچ ۱۸۹۸ء) سے پہلے ہی یکجا کرنا شروع کر دیا تھا۔اس ذخیرہ میں ایک خط ہمشیرہ (عجتہ النساء جنھیں حالیؔ نے صفیتہ النساء لکھا ہے (کے نام،ایک خط پوتی (احمدی بیگم) کے نام،تین سید حامد کے نام اور بقیہ ایک سو سترہ خطوط خود اُن کے نام ہیں۔مجموعہ کی اشاعت کب ہوئی،اس کے شواہد نہیں ہیں۔البتہ یہ نسخہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری کے اُردو مخطوطات کے سیکشن میں کلکشن نمبر ۱۰۰ پر موجود تھا جسے ایک عرصہ بعد (فروری ۱۹۹۵ء) ڈاکٹر نسرین ممتاز بصیر نے ایک مبسوط مقدمہ کے ساتھ ''خطوطِ سرسید'' کے نام سے شائع کرایا۔وہ اس کا تعارف کراتے ہوئے لکھتی ہیں۔

''سرسید کے خطوط کا زیرِ نظر نادر مجموعہ قلمی صورت میں ہے اور خطی نسخے کی اہمیت رکھتا ہے۔یہ مخطوط ۱۴۶ اوراق پر مشتمل ہے۔اس کا سائز ۱۳ X۲۱ ،۱۳ X۱۳ ،۱۰ ہے۔اس کے مرتب حکیم احمدالدین صاحب ہیں جو بقولِ خود سرسید احمد خاں کے نواسے ہیں۔اس مجموعے کی ابتداء میں انھوں نے لکھا (میں سرسید مغفور کا نواسہ ہوں اور اسی تعلق سے میرے نام جو شفقت نامہ مغفور کے قلم کے یاد ستخطی آئے ہیں،ان کی یہ جلد بندی ہے)''۔(ص:۹)

دوسرا مجموعہ سرسید احمد خاں کے لٹریری سیکریٹری مولانا وحیدالدین سلیم کا ہے جنھوں نے اپنے پیرومرشد (سرسید احمد خاں) کی وفات کے بعد اسے مرتب کیا اور حالی پریس پانی پت سے غالباً ۱۹۰۱ء میں شائع کرایا۔۵۵ رقعات پر مشتمل یہ مجموعہ اب نایاب ہے تاہم اس کا ایک نسخۂ حیات بوسیدہ شکل میں آصفیہ لائبریری حیدرآباد میں موجود ہے جس پر تاریخ وسنہ اشاعت درج نہیں ہے۔زمانی اعتبار سے تمام خطوط ۱۸۶۹ء سے ۱۸۹۱ء کے درمیان لکھے گئے ہیں۔

تیسرا مجموعہ محمد عثمان مقبول کا قرار دیا جاسکتا ہے جنھوں نے سرسید اور محسن الملک کے مابین خط وکتابت کو موضوع بنا کر ''مکاتبات الخلان فی اصول التفسیر وعلوم القرآن'' کے عنوان سے ترتیب دیا جو رشید احمد انصافی کے زیر اہتمام مطبع احمدی علی گڑھ نے ۱۹۱۵ء میں شائع کیا۔

سرراس مسعود نے ۲۴۹ خطوط پر مشتمل مجموعہ ''خطوطِ سرسید'' کے نام سے ۱۹۲۴ء میں نظامی پریس بدایوں سے شائع کرایا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۳۱ء میں زیورطبع سے آراستہ ہوا۔ مذکورہ مجموعہ میں مرتب نے مکتوب الیہم کا مختصر مگر جامع تعارف بھی پیش کیا ہے۔

شیخ عطاء اللہ نے سرسید کے چالیس خطوط پر مشتمل مجموعہ ''انتخاب خطوط سرسید'' کے عنوان سے ۱۹۵۸ء میں ۳۴۲ خطوط کے ساتھ منظر عام پر آیا۔ زمانی اعتبار سے اس میں ۱۸۴۹ء سے ۱۸۹۰ء کے مابین لکھے گئے خط شامل ہیں پھر دیگر مطبوعہ اور غیر مطبوعہ رقعات کو یکجا کر کے دوسرا حصہ جون ۱۹۷۶ء میں شائع کیا۔ اس میں ٦٦٥ خطوط شامل ہیں۔ رقعات کے اس ضخیم مجموعہ پر ناظم مجلس ترقی ادب لاہور، احمد ندیم قاسمی نے اپنے مقدمہ میں مدلل گفتگو کی ہے۔

مکاتیبِ سرسید کی اس کڑی میں مشتاق حسین بھی شامل ہیں۔ جنھوں نے دوجلدوں پر مبنی ۱۳۹ خطوط کا مجموعہ ''مکاتیبِ سرسید احمد خاں'' کے نام سے اکتوبر ۱۹٦۰ء میں یونین پرنٹنگ پریس دہلی سے شائع کرایا۔ ڈاکٹر سید عابد حسین تعارف کے طور پر اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں۔

''مولوی مشتاق حسین صاحب کا کارنامہ صرف یہی نہیں ہے کہ انھوں نے سرسید مرحوم کے بہت سے خطوط جواب تک کسی مجموعے میں شائع نہیں ہوئے تھے، نادر اخباروں اور رسالوں سے اور نایاب کتابوں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر یکجا کر دیئے

بلکہ انھوں نے متن کی صحت اور مفید حواشی کے اضافے میں بڑا اہتمام کیا ہے جس کی وجہ سے ان لوگوں کے لیے جوان خطوط کو مسلمانانِ ہند کی اُنیسویں صدی کے نصف آخر کی تعلیمی اور ذہنی تاریخ کے خام مواد کے طور پر استعمال کرنا چاہیں، خاصی آسان ہوگئی ہے''۔(ص۔۵)

خطوط کی ترتیب وتدوین کا یہ سلسلہ ہنوز برقرار ہے تاہم اعداد وشمار کے اعتبار سے کوئی جامع اور مستند کلیات مکاتیب سرسید کی اشاعت منظر عام پر نہیں آسکی۔ اب تک جتنے مجموعے شائع ہوئے ہیں، ان میں مکاتیب کی تعداد ایک ہزار تک پہنچتی ہے۔

سرسید احمد خاں نے جس قومی نصب العین کے لیے اپنی زندگی وقف کردی تھی ،اُس کی تمام جھلکیاں اُن کے لیے خطوط میں موجود ہیں،علاوہ بریں ان مکاتیب میں سوانح اور سیرت کے بعض اہم پہلوؤں کے علاوہ ان کے خاندانی حالات کا عکس بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ بہن، بیٹے، بہو اور نواسے کے نام لکھے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید قوم کے ساتھ ساتھ اہل وعیال کی ذمہ داریوں سے بھی کبھی غافل نہیں ہوئے۔ وہ خاندان کے افراد اور رشتہ داروں کا بھی خیال رکھتے تھے۔ ان کے دُکھ سُکھ میں شریک رہتے اور ہر ممکن مدد کرتے تھے۔ کوچہ والی نانی، بُو اصاحبہ، ہمشیرہ صاحبہ اور احمدی بیگم کے نام درجنوں خطوط میں رقم ارسال کرنے کی تفصیلات موجود ہیں۔ اس نوعیت کے بیش تر خطوط میں رقم ارسال کرنے کی تفصیلات موجود ہیں۔ اس نوعیت کے بیشتر خطوط حکیم احمد دین کے نام ہیں جو سرسید احمد خاں کے نواسے تھے اور دہلی میں واقع سرسید کی حویلی کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔ سرسید نے مدرسہ کے لیے بہت سی چیزوں کی حصولیابی بھی ان ہی کے سپرد کر رکھی تھی۔ لکھتے ہیں۔

''۔۔۔۔ سو روپیہ کا منی آرڈر تمہارے نام بھیجا گیا ہے۔ اس میں سے پچاس روپیہ سید حامد کے گھر میں دے دو اور پچاس روپیہ ہمشیرہ صاحب کو بابت تنخواہ دے

دو۔۔۔‘‘(بنام احمد الدین ۴/جنوری ۱۸۸۴ء)۔

سید حامد کی علالت اور گرتی ہوئی صحت کی طرف سے فکر مند ہوتے ہوئے احوال دریافت کرتے ہوئے کچھ روپے بھی ارسال فرماتے ہیں۔

’’سید حامد کی علالت طبع سے نہایت تردّد ہے۔امید ہے کہ اب طبیعت اچھی ہوگی اور تمہارے خط سے جو کل تک آجاوے گا،مفصل حال معلوم ہوگا ۔تم روز خط ان کے مزاج کے حال کا لکھتے رہو۔روپیہ وصول کر کے دوسو روپیہ سید حامد کو دے دو اور اسی روپیہ ہمیشہ ہمشیرہ عجبتہ النساء بیگم پاس پہنچادو۔‘‘۔

(خطوط سر سید،مرتبہ نسرین ممتاز،ص۔۵۹)۔

اپنی پوتی احمدی بیگم کے تعلق سے نواسے لکھتے ہیں:

’’بوا صاحب سے کہہ دینا کہ میں نے دوتھان زربفت کے اور دوتھان مشروع کے اور ایک سرخ دوشالہ احمد بیگم کے لیے لیا ہے، بہت اچھا ہے مگر احمدی بیگم کے کام میں یہ چیزیں آویں تو لیتا آؤں، ورنہ نہ لاؤں۔‘‘۔

(خطوط سر سید،مرتبہ نسرین ممتاز،ص۔۵۲)۔

ایک اور خط ملاحظہ ہو۔

’’کیا یہ سچ ہے کہ میاں ابراہیم نے جو حویلی اور دیوان خانہ ہم سے خرید لیا تھا،اس کو وہ فروخت کرنا چاہتے ہیں۔اگر یہ بات سچ ہو تو میں اس کو احمدی بیگم کے لیے خریدنا چاہتا ہوں۔‘‘۔

(خطوطِ سر سید،مرتبہ نسرین ممتاز،ص۔۸۶)۔

امداد الدین کے نام لکھا ایک اور خط ملاحظہ ہو۔

''۔۔۔سو روپیہ کا منی آرڈر مرسل ہے۔ اس کا روپیہ وصول کر کے سید حامد کی بیوی کو دے اور اُن کو سمجھا دو کہ جب تک سید حامد رخصت پر ہیں اور اپنی نوکری پر نہیں جاتے ۔ پچاس روپیہ مہینہ میں ان کو گھر کے خرچ کے بھی بھیجتا رہوں گا۔۔''۔

سرسید کو ترا ہا بیرم خاں پر واقع اپنا آبائی مکان بے حد عزیز تھا۔ جب علی گڑھ اُن کا اپنا گھر اور قوم اولاد بن گئی تب بھی وہ گھریلو ذمہ داریوں سے غافل نہیں ہوئے۔ دہلی والے مکان کا محل وقوع، بناوٹ اور آرائش وزیبائش کے بارے میں تمام تر تفصیلات ''خطوطِ سرسید'' میں محفوظ ہیں۔اُس گھر میں سب کے ساتھ چھٹیوں کے دن گزارنے کی خواہش بھی نیم بند دریچوں سے نظر آتی ہے۔

''عزیزی حکیم احمد الدین سید حامد کی طبیعت کا حال لکھو کہ کس طرح ہے۔ باری کے دن ان کو بخار آیا کہ نہیں۔ اسے کہہ دینا کہ ماہ نومبر میں سب لوگ دہلی آویں گے اور محمود بیگم کا ارادہ ہے کہ مسعود کی دودھ چھوٹنے کی شادی کریں گے۔ پس اس مکان میں جس میں تم رہتے ہو، تمہارے ساتھ سب رہیں گے۔ محمود بیگم نے کہا کہ میں تو جس قدر روپیہ کہیں گی ان کو یعنی عجبتہ النساء بیگم صاحبہ کو دے دوں گی۔ ان کو اختیار ہوگا جس طرح چاہیں کریں وہی بڑی ہیں اور وہی سب کچھ کریں گی۔''

(۱۶/ نومبر ۱۸۹۴ء)۔

اٹھارہ سو ستاون سے قبل ایک ذہین اور باشعور شہری کی طرح سرسید اپنے اہل وعیال کے روشن مستقبل کے خواب دیکھ رہے تھے لیکن اس ذہنی انقلاب نے سوچنے ،سمجھنے اور عمل کرنے کے زاویہ کو بدل دیا۔ دانشوارانہ بصیرت نے اجتہادی نظریے

کوفروغ دیا۔ پھرانھوں نے اپنی باقی ماندہ زندگی ملک اورقوم کی خوشحالی اورسربلندی کے لیے وقف کردی جوکہ ''عمدہ تعلیم وتربیت ہی قومی عزت اورقومی ترقی کا اصل ذریعہ ہے''۔۱۲/ جون ۱۸۶۹ء کولندن سے محسن الملک کولکھتے ہیں۔

''میں ہردم اپنے ملک کی بھلائی کے خیال میں ہوں اورعنقریب کچھ نہ کچھ انشاء اللہ تعالیٰ مشتہرکرناشروع کرتاہوں''۔

ہندوستانی کی کسمپرسی، بے بسی اور بدحالی کی کراہ سید حامد کی موت پر بھیجے گئے تار کے جواب میں بھی ملتی ہے۔

''مخدومی ومکرمی نیازاحمدخاں صاحب!۔

آپ کا تارہمدردی کا پہنچا۔جودلی محبت اورعنایت آپ کی مجھ ناچیزپر ہے اس کا میں صرف شکرگزارہی نہیں ہوں بلکہ میں اس کونہایت محبت اورقدرسے دیکھتا ہوں۔اگرچہ سید حامدمرحوم کے انتقال سے سخت صدمہ ہواہے لیکن خدانے صبردیاہے کہ قومی بھلائی کے کام میں زیادہ مصروف رہوں، کیوں کہ وقت موت معلوم نہیں ہے اورتوبھی جلدآنے والااوردنیااورعزیزقوم کوچھوڑنے والاہے۔پس قومی بھلائی میں زیادہ کوشش کرو''۔

فقط والسلام

خاکسارسیداحمد

علی گڑھ ۳۱/ جنوری ۱۸۹۴ء

قوم کے لیے کچھ کرگُزرنے کی للک اورتڑپ ۲۱/فروری ۱۸۷۰ء کے اُس خط سے بھی محسوس کی جاسکتی ہے جوانھوں نے لندن سے ایک اورخط میں محسن الملک کے نام لکھاتھا۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''افسوس کہ مسلمان ہندوستان کے ڈوبے جاتے ہیں اور
کوئی ان کا نکالنے والا نہیں ۔ہائے افسوس امرت تھوکتے
اورزہر اُگلتے ہیں اور مگر کے منہ میں ہاتھ دیتے ہیں۔اے بھائی
مہدی !فکر کرو اور یقین کرلو کہ مسلمانوں کے ہونٹوں تک پانی
آگیا ہے۔اب ڈوبنے میں بہت کم فاصلہ باقی ہے''۔

اُن کے قومی ہمدردی کے جذبے کو جو لوگ ڈھونگ سمجھتے ،اُن پر پھبتی کستے ،تہمت لگاتے ،سرسید اُن سے بھی بھلائی کی اُمید رکھتے تھے۔

''پنجاب کے بعض دوستوں نے مجھ سے بہت اصرار کیا کہ
اگر تم اپنی ذات کے لیے انتقام نہیں لینا چاہتے تو مدرسۃ العلوم کی
نسبت جو مخالفین اتہام لگاتے ہیں ان کا انتقام ضرور لو۔میں بھی
کچھ لکھتا ہوں اور کسی قدر قانون سے بھی واقف ہوں۔میں
خوب جانتا ہوں کہ میں انتقام لے سکتا ہوں اور قانونی سزا
دلا سکتا ہوں مگر میرے لیے کیا یہ مناسب ہوگا کہ جس قوم کے
ساتھ میں ہمدردی کرنا چاہتا ہوں اور جس قوم کو اپنی
گود میں بٹھانا چاہتا ہوں اس کو قانون کے حوالے کردوں''۔
(مکاتیب سرسید احمد خاں ،جلد اول ،ص۔۱۶۰)۔

سرسید قوم کو منجدھا میں چھوڑنے والے نہیں تھے۔انھوں نے اسباب وعلل تلاش کیے اور قوم کو جدید تعلیم کی طرف راغب کیا۔مدرسۃ العلوم قوم کو بھنور سے نکالنے والا بیڑہ ثابت ہوا۔اُس کی خوش حالی کے لیے ہر پل ہاتھ پھیلاتے اور دعا کرتے رہتے۔علی گڑھ سے ۳/مئی ۱۹۹۵ء کو نواب عماد الملک کو لکھے گئے خط سے ان کی ملی تڑپ ظاہر ہے۔

''آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۲۵/اپریل پہنچا اور میرے جان ومال اور روح

کا باعثِ افتخار ہوا۔۔اگر خدا کو مسلمانوں کے حق میں کچھ بہتر کرنا ہے تو یہ مدرسہ قائم اور سرسبز رکھے گا ورنہ جو خدا کی مرضی۔۔۔جہاں تک ہم سے ہوسکتا ہے قوم کی بھلائی اور بہتری میں کوشش کرتے ہیں۔آئندہ اس کا قائم رہنا خدا کے اختیار میں ہے۔آپ کا یہ کہنا بالکل سچ ہے کہ قوم اس کی کچھ قدر نہیں کرتی اور نہیں جانتی کہ کیا کچھ اس کی بہتری کے لیے ہورہا ہے۔اگر قدر کرتی تو ہم کو روپے کی بابت کسی سے کچھ پروانہیں رہتی اور نہ کبھی اس بابت تردّد ہوتا کہ نواب سرسالار جنگ مرحوم کی جاگیر کا روپیہ، جو بند ہوگیا، وہ کمی ہم کیوں کر پوری کریں۔''۔

والسلام مع الاکرام

کمترین شما، سید احمد

سرسید ہمیشہ عالمی سطح پر مسلمانوں کی صورتحال کو سامنے رکھتے تھے اوران کے توسط سے ہندوستانی مسلمانوں کو خبردار کرتے رہتے تھے۔ان کی اس وسیع النظری کا ثبوت نواب سید علی حسن کے نام لکھے ایک خط سے بھی عیاں ہے۔

''محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس اب کے سال الہٰ آباد میں ہوگا۔۲۸، ۲۹ اور ۳۰/ دسمبر تو رارخ اجلاس مقرر ہوئی ہیں۔ پہلے اجلاس میں وہ امور تنقیح پاویں گے جو بحث کے لیے پیش ہوں گے مگر تمام بحثیں تعلیم مسلمانانِ سے متعلق ہوں گی۔نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی غالبًا اسباب تنزل مسلمانان پر لیکچر دیں گے۔ ہمارے کالج کے ایک نہایت قابل اور عالم پروفیسر انگریز مسٹر آرنلڈ چین اور جاوہ میں اسلام کی ترقی اور وہاں کے مسلمانوں کی حالت پر لیکچر دیں گے''۔

(از علی گڑھ ۲۰/نومبر ۱۸۹۰ء)

تعلیمی میدان میں ہونے والی تبدیلیوں پر سرسید احمد خاں گہری نظر رکھتے تھے اور دشواریوں پر احتجاج بھی کرتے رہتے تھے۔سید حسین بلگرامی کے نام لکھے خط کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

''حال یہ ہے کہ گورنمنٹ شمال مغرب نے حکم دیا ہے کہ کل گورنمنٹ کالجوں اور ایڈڈ کالجوں میں،جیسا کہ ہمارا کالج ہے،کالج کلاس کے طالب علموں کی فیس میں اضافہ کردیا جائے۔۔۔اس وقت ہمارے کالج کی کلاسوں میں ایک سو پچھتر سے زائد طالب علم صرف مسلمان ہیں لیکن فیس کے اضافے کے بعد شاید بمشکل صرف نصف طالب علم باقی رہیں گے اور وہ بھی اس صورت میں کہ وظیفہ یا اسکالرشپ سے ان کی اعانت کی جائے۔۔۔''۔

اس دور میں جدید تعلیم کی طرف مسلمانوں کا رجحان بہت ہی کم تھا۔انھیں مغرب میں ہونے والی نت نئی تبدیلیوں کی طرف راغب کرنا ایک مشکل امر تھا۔پھر سود وزیاں سے مبرا ہو کر تعلیمی مشن کو آگے بڑھانا اور بھی دشوار تھا لیکن سرسید جہدِ پیہم میں لگے رہے۔مغرب کی برق رفتار ترقی کا ذکر اُن کے کئی خطوط میں ہے۔۱۰/ستمبر ۱۸۶۹ء کو محسن الملک لکھتے ہیں۔

''۔۔۔یہاں کا حال دیکھ دیکھ کر اپنے ملک اور اپنی قوم کی حمایت اور بے جا تعصب، وتنزل موجودہ اور ذلتِ آئندہ کے خیال سے رنج وغم زیادہ بڑھ گیا ہے اور کوئی تدبیر اپنے ہم وطنوں کے ہوشیار کرنے کی نہیں معلوم ہوتی''۔

سرسید کو اپنے اس اصلاحی و تعلیمی مشن جس کو علی گڑھ تحریک کے نام سے یاد کیا جاتا

ہے، عملی جامہ پہنانے میں سخت مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ کبھی بھی مخالفین کے اعتراضات پر مشتعل نہیں ہوئے۔ اُن میں برداشت اور درگزر کی بے پناہ قوت تھی۔ منشی سراج الدین کو لکھے گئے خط کا یہ اقتباس ثبوت کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

"۔۔۔۔میں نے آپ کا اخبار مورخہ ۸/ جنوری پڑھا۔
بلا شبہ میں آپ کی محبت کا، جو آپ کو مجھ ناچیز سے ہے، بوجہ جوشِ
محبت معذور سمجھا ہوں ۔مگر جانے دو، جس کا جو دل چاہے
کہے، ہمارا کیا بگڑتا ہے، اگر ہمارے بُرا کہنے سے ان کا دِل خوش
ہوتا ہے، خوش کر لینے دو تم بھی اس بُرا کہنے سے خوش ہو کیوں کہ
وہ ہمارے دھوبی ہیں، ہم کو گناہوں سے پاک کرتے ہیں"۔

عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اکبرالہٰ آبادی نے علی گڑھ تحریک کی سخت مخالفت کی لیکن رقعات کے مطالعہ سے یہ بھی پتا چلا ہے کہ سرسید نے چندہ جمع کرنے کے لیے ہندوستان کے مختلف شہروں کا دورہ کیا تھا اور انھیں اس سلسلہ میں حیدرآباد میں خاطرخواہ کامیابی حاصل ہوئی جس پر اکبرالہٰ آبادی نے اپنی مسرت کا اظہار کیا تھا اور انھیں ایک تفصیلی خط لکھا۔ سرسید کا جواب ملاحظہ ہو۔

"مخدومی و مکرمی منشی اکبرحسین خاں بہادر

آپ کا نوازش نامہ پہنچا۔ آپ نے جو کامیابی حیدرآباد کی مبارکباد پر دی ہے اُس کا دِل سے شکرگزار ہوں۔ یہ مبارک بادی درحقیقت قوم کی مبارکبادی ہے جس میں آپ بھی شامل ہیں، پس میں آپ کو بھی مبارکبادی دیتا ہوں۔۔۔۔

خاکسار

سید احمد

۱۰/ جون ۱۸۷۹ء کو شملہ سے لکھے ایک خط سے حالی سے تعلقِ خاطر اور ادبی

پذیرائی واضح ہوتی ہے۔

''جناب مخدوم ومکرم من ا

عنایت نامہ بمع پانچ جلد مسدس پہنچے۔جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی، جب تک ختم نہ ہوئی، ہاتھ سے نہ چھوٹی، اور جب ختم ہولی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہوگئی۔ اگر اس مسدس کی بدولت فنِ شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جاوے تو بالکل بجا ہے۔کس صفائی اورخوبی اورروانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے۔بیان سے باہر ہے۔ ۔۔۔میری نسبت جو اشارہ اس نثر میں ہے اُس کا شکر ادا کرتا ہوں اور آپ کی محبت کا اثر سمجھتا ہوں۔۔۔''۔

سرسید کے رفیق خاص نواب وقار الملک کواُن کی ملازمت کے دوران ایک انگریز ڈپٹی کمشنر نے عدالت کے اوقات میں جماعت کے ساتھ ظہر کی نماز کی ادائیگی کے لیے منع کیا تھا۔وقار الملک نے سرسید کو یہ واقعہ لکھتے ہوئے مشورہ طلب کیا۔موصوف کا جواب ملاحظہ ہو۔

''بھائی مشتاق حسین!

۔۔۔تم کو پہلے ہی اپنی طرف سے ایسا طریقہ اختیار کرنا تھا جو کبھی اس قسم کی بحث نہ آتی۔اور جب ایسا طریقہ نہیں کیا تھا تو پھر لجلجانا اور گڑ گڑانا کیسا۔''حضور رخصت ہی دیں''،''تنخواہ کاٹ لیں''۔کہنا واہیات تھا۔تڑاق سے استعفا دے دینا تھا اورصاف کہہ دینا تھا کہ''میں اپنے خدائے عظیم الشان''قادر مطلق کے حکم کی اطاعت کروں گا نہ کہ آپ کی،'' کیا ہوتا،نوکری نہ میسر ہوتی، فاقے سے مر جاتے؟ نہایت اچھا ہوتا۔

والسلام

خاکسار۔سید احمد

از بنارس،۹/جنوری ۱۸۷۵ء

تاریخ گواہ ہے کہ سر سید نے ایم۔اے او کالج کی بہتری کے لیے اپنا سب کچھ نثار کر دیا تھا اور اپنی تمام تر صلاحیتیں اس کی آبیاری کے لیے وقف کر دی تھیں۔طلبہ کے داخلے، وظائف ،ان کی تعلیم ،تربیت اور صحت کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ ، تدریسی اور غیر تدریسی عملہ کی تقرری پر بھی وہ گہری نظر رکھتے تھے۔ایک لائق استاد کو کالج میں لانے کے جتن کی کہانی سنیے:

''مُشفقی منشی حافظ سعید احمد صاحب!

مولوی عبداللہ صاحب کا خط جو آپ نے بھیجا، میں نے نہایت خوشی سے پڑھا۔قبل اس سے کہ میں اس کا جواب دوں ، اپنے خیالات کا ظاہر کرنا مناسب سمجھتا ہوں ۔سب سے اول یہ ہے کہ جس مقصد کے لیے ہم ایک بزرگ اور مقدس شخص کو بورڈنگ ہاؤس میں رکھنا چاہتے ہیں وہ ایسا ہو کہ درحقیقت اس کام میں اُس کو مالی فائدے پر نظر نہ ہو اور نہ مالی فائدے کو مقدم سمجھے بلکہ ان کا اصلی مقصد اور ان کی سچی نیت خالصتاً یہ ہو کہ مدرستہ العلوم ایک ایسی جگہ ہے جہاں کثرت سے مسلمان نوجوان جمع ہیں ۔ان میں نیکی اور اخلاق محمدیؐ اور محبت اسلامی اور پابندیٔ فرائض مذہبی کو پھیلانا اور ان کے دِلوں کو نرمی اور اخلاق سے۔۔۔نیکی کی طرف مائل کرنا ایک مذہبی اور ثواب کا کام ہے۔۔۔پس یہ مقصد ایسے ہی شخص سے حاصل ہوسکتا ہے جس کی نیت اور ارادہ خالصتاً بلا کسی قسم کے لالچ اور دنیاوی طمع کے اس کام کے کرنے کا ہو اور یہ سمجھے کہ میں اسلام کی خدمت کرتا ہوں۔پس اگر مولوی عبداللہ صاحب اِسی نیت سے یہاں آنا چاہیں تو ہماری عین خواہش اور خوشی ہے۔''۔

خاکسار

سید احمد

(علی گڑھ،۵/ جون ۱۹۹۳ء)

ہوسٹل میں رہنے والے طلبہ کی صحت اوران کے ناشتہ اورکھانے پرسرسید کی سخت نگاہ رہتی تھی۔ چنانچہ ایک اچھے باورچی کے لیے احمد الدین کو لکھتے ہیں۔

"۔۔۔بورڈنگ ہاؤس کے لیے ایک باورچی درکار ہے ۔تنخواہ چھ روپیہ ماہواری اور کھانا ہے۔ کام سالن پکانا اور کبھی پلاؤ پکادینا ہے، مگر سالن یا پلاؤ بیس سیر سے کم نہیں پکتا۔ سالن دونوں وقت اسی قدر پکانا ہوگا۔"۔

قوم کے اس آشیانے کو سجانے سنوارنے کا ایک اور قصہ سُنیے۔

"مجبی ومکرمی مولوی ممتاز علی صاحب

۔۔۔اُمید ہے کہ میرے پاس رہنے سے تمہارا دِل خوش رہے گا اور سب توہمات دُور ہوجاویں گے۔میری کوٹھی ظاہراً خوش فضا ہے۔ ہمیشہ دو کمرے عمدہ مع تمام ضروریات متعلقہ کے خالی رہتے ہیں۔سب چیز تمہارے آرام کی موجود ہے۔۔۔بعض میرے نہایت دلی دوست خصوصاً مولوی زین العابدین میرے مکان کے نہایت متصل رہتے ہیں۔آپ ان سے مل کر نہایت خوش ہوں گے اور آپ کا دِل خوش رہے گا۔مولوی محمد شبلی صاحب بھی اسی طرح قریب رہتے ہیں۔۔۔۔آپ علی گڑھ کو بلاتکلف اپنا گھر سمجھیں گے اور کسی قسم کا خیال دِل میں نہ لاویں گے۔"۔(از علی گڑھ ۱۸/ دسمبر ۱۸۹۱ء)۔

سرسید کی بے حد فعال اور متوازن شخصیت کا نقش اُن کے مکاتیب کے مطالعہ سے اور بھی گہرا ہوجاتا ہے۔ حالانکہ اُن کے متعدد خطوط ضائع ہوگئے کیوں کہ وہ خود بھی بہت سے ذاتی خطوط کو چاک کرنے کی ہدایت دیا کرتے تھے(یہ الگ بات ہے کہ چاک کرنے کی ہر وصیت پر عمل نہیں ہوا جس کی وجہ سے نہایت قیمتی سرمایہ محفوظ رہ گیا۔)۔۹/نومبر ۱۸۸۵ء کو اپنے نواسے سید احمد الدین کو لکھتے ہیں۔

''مرزا سرور حسین کل یہاں سے دہلی جاویں گے۔وہ کہتے تھے کہ میں سید حامد کو اپنے ساتھ مدارس لے جاؤں گا۔تم سید حامد کو یہ خط دکھا دواوران سے کہہ دو کہ مرزا سرور حسین صاحب کتنا ہی اصرار کریں،وہ ہرگز ہرگز مدارس جانا قبول نہ کریں۔ کسی طرح پراُن کے ساتھ جانے پر رضامند نہ ہوں۔ہرگز ہرگز نہ جاویں۔اس خط کو دکھلانے کے بعد چاک کر دو''۔

سرسید کے یہ خطوط اُنیسویں صدی کے سیاسی اور سماجی پس منظر کو نمایاں کرتے ہیں۔اُس کے آئینہ خانہ میں وہ تمام حالات وحادثات اوراُن کے نشیب وفراز نظر آتے ہیں،جن سے قوم دوچار ہوئی۔یورپ کا قیام،تہذیب الاخلاق،انسٹی ٹیوٹ گزٹ،محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس،سائنٹفک سوسائٹی وغیرہ کے منصوبے کن کن مراحل ومنازل سے گزرے،جاں فشانی اورصبر آزما لمحات کا سامنا کرنا پڑا،یہ سب تفصیل اِن خطوط میں موجود ہے۔انگریزی زبان وادب کے اثرات،اُردو نثر کو مافوق الفطرت کرداروں اورمحیرالعقل باتوں سے آزاد کرنے کا جتن،تصانیف وتراجم کے احوال، تبادلوں اورسفرناموں کے کوائف،ذاتی دلچسپی،شوق،پسند ناپسند سب کا ذکر مکتوبات میں موجود ہے۔باہمی افتراق،جذب وخیال،اختلافات،نوک جھونک،من مٹاؤ کے ساتھ مختلف افراد کے نقطہ نظر،تاریخی حالات وکوائف اورجدید رجحانات کا عکس بھی ان خطوط میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔خصوصاً کالج کی تعمیر کے سلسلہ میں بہت سی اہم معلومات رقعات میں درج ہیں مثلاً قوم کی سربلندی اورعلم سے سرفرازی کے خواب کو حقیقت میں بدلتے ہوئے دیکھنا بلکہ اس کی تعمیر میں ہرچھوٹی بڑی چیز کا باریک بینی سے خیال رکھنا اور یہ خیال محض نقش ونگار اور درودیوار کی پائیداری پر ہی منحصر نہیں بلکہ آرائش وزیبائش کے لیے ستون،پتھر،فرش،آئینہ جات،لیمپ وغیرہ کیسے ہوں اورانھیں کم سے کم قیمت پر کہاں سے خریدا جائے،ان سب کی روداد بھی مکاتیب

سر سید میں ملتی ہے۔ چند خطوط کے اقتباسات ذیل میں درج ہیں۔

''۔۔۔۔میں مدرستہ العلوم کے لیے سو لیمپ اسی طرح کے، جس میں معمولی تیل جلنے بنوانے چاہتا ہوں۔ٹین کے لیمپ تو بعینہ اسی قطع کا اور صرف چمنی اس میں ہو ۔۔۔ہانڈی کی ضرورت نہیں۔بس تم وہاں کے کاریگروں سے پوچھو کہ بنا دیں گے ؟اور فی لیمپ کیا دام لیں گے۔۔۔''۔

(بنام احمد الدین ۵/نومبر ۱۸۸۹ء)۔

''۔۔۔تم نے جو ستون بھیجے ہیں اسی ساتھ کے دو ستون اور درکار ہیں۔اس لیے کہ سہدری کی جگہ پنج دری بنائی جاوے گی۔۔۔پس جس قدر جلد ممکن ہو اسی ساتھ کے دو ستون اور بنوا کر جلد بھیج دو۔۔۔''۔

(بنام احمد الدین ۲۵/نومبر ۱۸۹۳ء)۔

''۔۔۔عزیزی احمد الدین۔۔۔رام لال سنگتراش تمہارے پاس پہنچتا ہے۔اس کو ساتھ لے جا کر جامع مسجد دکھا دو۔اس کو جامع مسجد کے اگلے در اور اس کے پائے دیکھنے ہیں کہ کس صورت کے بنے ہوئے ہیں۔شاید کوئی شخص اس کو مسجد میں جانے نہ دیتا ہے۔اسی لیے تم کو رقعہ لکھا ہے کہ تم اپنے ساتھ جا کر دکھا دو۔۔۔''۔(۱۵/جنوری ۱۸۹۴ء)۔

''۔۔۔کواڑوں کے آئینوں کا حال لکھو کہ ان کی تیاری کا بندوبست ہو گیا۔۔۔اور کب تک تیار ہو کر آجاویں گے۔۔۔''۔

(بنام احمد الدین ۶/ستمبر ۱۸۹۴ء)۔

مکاتیب کے توسط سے جہاں مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے کمالات ظاہر ہو رہے

ہیں وہیں اسباب پر بھی روشنی پڑ رہی ہے کہ علی گڑھ تحریک کا بنیادی مقصد حب الوطنی اور انسان دوستی کے ساتھ ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کو جدید علوم وفنون سے روشناس کرنا بھی تھا۔گذشتہ ایک صدی سے اس موضوع پر کام ہو رہا ہے لیکن یہ گوشہ اب بھی تشنہ ہے۔اور خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔تاریخی، سیاسی، سماجی، اصلاحی، ادبی ،صحافتی،نفسیاتی ،انفرادی اور رسمی جیسے عنوانات کے تحت مکتوبات کی شیرازہ بندی کی جاسکتی ہے۔مثلاً تاریخی اعتبار سے لندن سے محسن الملک کے نام یا پھر نواب صدیق حسن خاں کے صاحبزادے نواب سید محمد علی حسن خاں کو لکھے گئے خطوط تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔سیاسی اعتبار سے بدرالدین طیب جی یا ریاست کے حکمرانوں کو لکھے گئے خطوط آج بھی بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔قومی یکجہتی پر بھی اُن کے کئی خطوط ہیں۔انھوں نے گنگا جمنی تہذیب کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ حدیث تشبہ کے سلسلے میں اُٹھائے گئے ایک سوال کا جواب وہ اِن الفاظ میں دیتے ہیں۔

''کیا ہم دیوالی، دسہرہ میں اپنے ہندو دوستوں سے اور نوروز میں اپنے پارسی دوستوں سے اور بڑے دن میں اپنے عیسائی دوستوں سے مل کر اور معاشرت وتمدن کی خصوصیت حاصل کرکے کافر ہوجائیں گے۔نعوذ باللہ منہا''۔ (مکتوبات سرسید، جلد دوم،ص۔۳۵۴)۔

محبت،مروت ، بھائی چارے، پاسداری اور خیر سگالی جیسے جذبات واحساسات سے اُن کے خطوط بھرے پڑے ہیں۔رفیقِ خاص مولوی سمیع اللہ سے کسی بات پر اختلاف بڑھا جس کی وجہ سے انھیں تکلیف پہنچی۔نواب محسن الملک کے نام لکھے خط سے جذبۂ دوستی اور تکلیف دونوں کا احساس جلوہ گر ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو۔

''میں تو اس شخص کو کافر و بے ایمان سمجھتا ہوں جو دوست کی نسبت یہ خیال کرے کہ اس نے خلاف دوستی ومحبت کے کوئی

بات کی یا کہی ، میں تو دوست کو گالی دینے اور بُرا کہنے کو بھی دوستی
پر محمول کرتا ہوں ۔مگر جب کہ حقیقت میں خلاف محبت اور دوستی
کے کوئی بات ہو تو پھر شیشہ محبت جو نہایت نازک ہے کس طرح
ثابت نہیں رہ سکتا۔۔۔مولوی سمیع اللہ خان کو اب بھی میں اپنے
بھائی سے کم نہیں سمجھتا مگر جو ملال کہ میرے دِل میں ہوا وہ اب
تک کم نہیں ہوا۔ پھوٹ جاوے وہ آنکھ جو کسی کو دیکھے اس نگاہ
سے جو اُس کے دِل میں نہیں ہے ۔گل جاوے ،وہ زبان جو وہ
کہے جو اُس کے دِل میں نہیں ہے ۔ٹوٹ جاوے وہ ہاتھ جو وہ
لکھے جو اُس کے دِل میں نہیں''۔

(مکتوبات سرسید، جلد اول ۔ص ۴۴۵)۔

سفارشی، رسمی، دوستی اور خیر سگالی کے متعدد ایسے خطوط ہیں جو ادبی چاشنی سے لبریز ہیں، سید زین العابدین کو لکھا ایک خطہ ملاحظہ ہو۔

''مکرمی زینو بھیاّ!

ابھی تمہارا خط پہنچا۔ کچھ پتہ نہیں کہ تم کو مجھ سے جُدا ہونے کا ایسا ہی رنج ہے جیسا کہ تم نے لکھا ہے، مگر تم تو اس رنج کو کسی قدر لکھ بھی سکے، مگر مجھ کو تمہارے جانے سے جو رنج ہے وہ لکھا بھی نہیں جا سکتا۔ زبان کھجلاتی ہے اور کوئی یہاں نہیں کہ اس کو بُرا کہوں۔ دِل میں غصہ آتا ہے اور کوئی یہاں نہیں ہے جس پر غصہ نکالوں۔ ہاتھ کھجلاتے ہیں اور کوئی یہاں نہیں ہے جس کو ماروں، حقیقت میں تمہارے جانے سے مکان سونا نہیں ہوا بلکہ دِل سونا ہو گیا''۔(مکتوبات سرسید، جلد اول ۔ص ۔۲۱۹)۔

محسن الملک کو لکھے گئے خط کا انداز ملاحظہ ہو۔

''۔۔آپ خیال کیجئے کہ محبت اور دوستی ایسی سخت اور مضبوط

چیز ہے کہ کسی طرح نہیں ٹوٹ سکتی اور کوئی اس کو نہیں توڑ
سکتا مگر وہ انزک بھی ایسی ہے کہ باریک سے باریک شیشے
اورحباب کو بھی اس سے نسبت نہیں ہے ۔وہ ہتھوڑوں
اور ہزار صدموں سے نہیں ٹوٹتی اور ایک ادنیٰ سی خلاف محبت
بات کرنے سے ٹوٹ جاتی ہے اور جوں جوں محبت زیادہ بڑھتی
ہے اس کی نزاکت زیادہ ہوتی جاتی ہے۔''

(مکتوبات سرسید، جلد اول۔ص۔۴۴۵)۔

مکتوبات کو بھی دیکھنے اور پرکھنے کے مختلف زاویے ہو سکتے ہیں۔ایک آسان طریقہ ان کی درجہ بندی کا ہے۔دراصل اس موضوعاتی درجہ بندی سے انسانی نفسیات ،تعمیری خواہشات ،ملی جذبات اور قومی خدمات کے مختلف گوشوں تک رسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔یہ کام مشکل ہے مگر اس سے سرسید کی اہمیت اور معنویت پوری طرح واضح ہو سکے گی۔لایعنی گفتگو سے گریز کرتے ہوئے محض کام کی باتیں لکھنے والا یہ مصلح قوم اپنے خطوط کے توسط سے کوئی نیا طرز ایجاد نہیں کرنا چاہتا تھا مگر لاشعوری طور پر مکاتیب سرسید ہماری ادبی ،سیاسی ،تہذیبی اور ثقافتی زندگی کا دستاویزی حوالہ بن گئے ہیں۔ان میں سادگی ،اختصار اور جامعیت ہے ۔انگریزی الفاظ کے ساتھ روزمرہ محاورات اور ضرب الامثال کا برمحل استعمال ہے جس کی وجہ سے کہا جانے لگا کہ سرسید نے غالب کی طرح بے ساختہ براہ راست اور بے تکلف انداز اختیار کیا اور اس مصنف کو قطعیت ،زبان کی سادگی اور تخاطب کے خلوص سے آشنا کیا۔حشو و زوائد سے پاک سرسید کے خطوط میں نہ تو انشاء پردازی ہے نہ مبالغہ آرائی اور نہ ہی شاعرانہ تعلّی ۔دِل سے نکلنے اور دِل پر اثر کرنے والا یہ انداز اُن کے عہد کو کچھ اس طرح بھا گیا کہ علی گڑھ تحریک کے بانیوں کی تحریروں میں عبارت آرائی کم سے کم ہوتی گئی۔تکلف

اور تخیل کی جگہ سادگی اور حقیت نے لے لی نتیجتاً براہ راست بات کہنے کا رُجحان بڑھا جو اُردو نثر کے فروغ میں ممد و معاون ثابت ہوا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ تاثر اور بھی قوی ہوتا جارہا ہے کہ ''مکاتیبِ سرسید'' کی قدر و قیمت کے صحیح تعین کی روشنی میں، ہم سرسید اور اُن کے عہد کو اور بھی قریب سے دیکھ سکتے ہیں۔ ذہنی سراسیمگی اور بے اطمینانی کو جان سکتے ہیں۔ صارفیت اور عالمگیریت کے اس دور میں تعلیم و تربیت کے جو معیار سامنے آرہے ہیں ان کے تناظر میں علی گڑھ تحریک کو کس طرح مشعلِ راہ بنایا جاسکتا ہے، یہ خطوط اس جانب بھی رہنمائی کرسکتے ہیں اور مذکورہ تحریک کے تازہ دم اور تازہ کار ہونے کے ضامن بن سکتے ہیں۔

مکتوب نگاری اور مکتوباتی افسانہ نصیر اور خدیجہ

پروفیسر عارفہ بُشریٰ
صدر شعبہ اُردو، کشمیر یونیورسٹی

مرزا غالب نے مراسلہ کو مکالمہ بنایا، یہ ان کا کارنامہ ہے لیکن راشد الخیری نے ''نصیر اور خدیجہ'' کے عنوان سے مراسلہ کو افسانہ بنایا یہ بھی کسی کارنامے سے کم نہیں۔ دراصل خط یا مکتوب ایک ایسی تحریر کا نام ہے جس کے اندر افسانہ، انشائیہ، مضمون اور خاکہ جیسی کئی نثری اصناف کے امکانات موجود رہتے ہیں۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ خط یا مکتوب سے مُراد وہ ''مخاطباتی تحریر'' ہے جو مخاطِب، مخاطَب کو اپنے کسی ذاتی اور شخصی سوچ یا فکر، رنج یا راحت میں شریک کرنے کے لیے لکھتا ہے۔ خط لکھنے کا آغاز کب سے ہوا اور پہلا خط کس نے کب لکھا کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ اس سلسلے میں اب تک صرف مفروضات ہی قائم کئے گئے ہیں۔ یہ تحقیق کا ایک الگ موضوع ہے لیکن اب تک اُردو سمیت مختلف زبانوں میں مکتوبات کا جو سرمایہ دستیاب ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خط یا مکتوب کی کوئی مخصوص، ہیئت نہیں ہوتی اور نہ طے شدہ اسلوب یا موضوع ہوتا ہے۔ کسی بھی ہیئت اور اسلوب میں خط لکھا جا سکتا ہے لیکن فارسی، مکتوبات میں القاب و آداب اور آغاز و اختتام کے برتاؤ کے حوالے سے بعض اصول ضرور سامنے آتے ہیں۔ اُردو میں مکتوب نگاری کے حوالے سے مرزا غالب کے خطوط کا ذکر لازمی طور پر آتا ہے۔ مرزا کا دعویٰ کہ میں نے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا غلط

نہیں ہے لیکن غالب کے خطوط میں شگفتہ اور پُرمزاح نثر کے علاوہ اکثر خطوط میں مثلاً اپنے دوست اور شاگرد ہرگوپال تفتہ کے نام لکھے گئے چند ایک خطوط میں افسانہ کی طرح بیانیہ بھی قائم ہوتا ہوا نظر آتا ہے اور آگے جا کر جب ہم اُردو افسانہ کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اُردو کا پہلا افسانہ ،راشدالخیری کا ''نصیراور خدیجہ'' خط کی تکنیک میں لکھا گیا ہے ۔ مرزا حامد بیگ نے اپنی تصنیف ''اُردو افسانے کی روایت'' میں لکھا ہے۔

''راشدالخیری کا اُردو زبان کا پہلا افسانہ ''نصیراور خدیجہ'' خط کی تکنیک میں لکھا گیا ہے اور یہ تکنیک اس دور کے فکشن کی مقبول ترین تکنیک کہی جا سکتی ہے۔ انگریزی ادب میں سموئل رچرڈسن (۱۶۸۹ء۔۱۷۶۱ء) نے اس تکنیک کو اپنے تمثیلی قصّے ''پامیلا'' میں برتا اور ریو لیپے نے اس تکنیک میں آٹھ خطوط پر مشتمل اپنا افسانہ ''آئینہ'' مکمل کیا''۔راشدالخیری عالمی سطح پر اس تکنیک کو برتنے والے تیسرے تخلیق کار ہیں۔

انہوں نے ''نصیراور خدیجہ'' (مطبوعہ ۱۹۰۳ء) کے بعد یہ تکنیک اپنے دس دیگر افسانوں میں برتی ۔ان کا تیسرا طبع زاد افسانہ ''عصمت وحسن'' (مطبوعہ: ''مخزن'' لاہور ۱۹۰۶ء) ''کثرت ازدواج'' (مطبوعہ ''مخزن'' لاہور ۱۹۰۸ء۔نند کا خط بھاوج کے نام (مطبوعہ :عصمت دہلی جون ۱۹۰۸ء) اور افسانوی مجموعہ ''مسلی ہوئی پتیاں (طبع اول ۱۹۳۷ء) میں شامل کُل گیارہ افسانے (زمانہ تخلیق ۱۹۰۳ء تا ۱۹۱۹ء) اسی تکنیک کے حامل ہیں''۔(اُردو افسانے کی روایت: مرزا حامد بیگ۔ص۔۱۶۰)

خط کی تکنیک پر لکھے گئے راشدالخیری کے افسانے اس قدر مقبول ہوئے کہ اُردو کے کئی دیگر افسانہ نگاروں نے خط کی تکنیک پر افسانے لکھے۔سجاد حیدر یلدرم اُردو کے ابتدائی افسانہ نگاروں میں اہم مقام رکھتے ہیں۔راشدالخیری ،پریم

چنداور سلطان حیدر جوش وغیرہ ان کے ہم عصر افسانہ نگار تھے۔سجاد حیدر یلدرم نے تُرکی افسانہ نگار احمد حکمت اوغلو کے ایک افسانے کا اُردو میں ترجمہ کیا جو''صحبت ناجنس'' کے نام سے''مخزن''لاہور کے فروری ۱۹۰۶ء کے شمارے میں شائع ہوا۔خطوط پر مبنی اس ترکی افسانے کی تکنیک سے سجاد حیدر یلدرم اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے ایک کے بعد ایک کئی افسانے خط کی تکنیک میں لکھ ڈالے۔ یلدرم نے خط کی تکنیک میں متعدد طبع زاد افسانے لکھے۔مثلاً!''دوست کا خط''(مطبوعہ:''مخزن''،لاہور۔ اکتوبر۔ ۱۹۰۶ء)۔''گمنام خط''(مشمولہ:''حکایات واحتساسات''مطبوعہ ۲۷۔۱۹۲۸ء)۔

چونکہ''نصیراور خدیجہ وغیرہ'راشدالخیری کے مکتوباتی افسانوں میں ایک عہد کے سماجی،معاشی اوراخلاقی اقدار و مسائل کی ترجمانی کی گئی تھی اس وجہ سے عام قارئین نے ان کے افسانوں کو سرآنکھوں پر بٹھایا۔اس افسانہ میں سیدھے سادھے بات ، بات چیت کے انداز میں دلی کے ایک مصیبت زدہ مسلم گھرانے کی دو یتیم اور بے سہارا بیٹیوں کی کہانی بیان کی گئی ہے ۔کہانی میں چار کردار اہم ہیں خدیجہ جو کہانی کا مرکزی کردار ہے ،صادقہ جو خدیجہ کی بہن تھی لیکن کچھ عرصہ قبل وہ دو بچوں کو چھوڑ کر انتقال کر گئی تھی۔نصیر خدیجہ اور صادقہ کا بھائی ہے اور اپنی بیوی بچوں کے ساتھ دوسرے شہر میں خوشحال زندگی گذار رہا ہے لیکن نصیر نہ تو خدیجہ کی خیر خبر لیتا ہے اور نہ اپنی مرحومہ بہن کے بچوں کی اسے کوئی فکر ہے۔ خدیجہ کی والدہ کا انتقال ہو چکا ہے اور والد حج کو چلے گئے ہیں۔نصیر خط لکھ کر بھی کسی کی خیریت نہیں پوچھتا۔ خدیجہ خود غربت کی شکار ہے پھر بھی مرحومہ بہن کے بچوں کی کفالت کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے لیکن جب حالات کی وجہ سے خدیجہ کے لیے بہن کے بچوں کیلئے کچھ کرنا دشوار ہو گیا تو خدیجہ مجبور ہو کر اپنے خود غرض بھائی کو خط لکھ کر اپنی پریشانیوں کا ذکر بھی کرتی ہے اور بھائی نصیر کو غیرت بھی دلاتی ہے۔خط کی تکنیک میں لکھے گئے

اس افسانے کے ابتدائی جملے ہی بڑے جھنجھوڑنے والے ہیں خدیجہ، خط کی شروعات میں ہی لکھتی ہے۔

''شاباش بھائی نصیر، شاباش: چھوٹی بہن مر کے چھوٹی بہن کو جیتے جی چھوڑا۔ غضب خدا کا تین تین چار چار مہینے گزر جائیں اور تم کو دو حرف لکھنے کی توفیق نہ ہو ۔۔۔نصیر میاں، بہن بھائیوں کا رشتہ تو بڑی محبت کا ہوتا ہے۔۔۔۔کسی کو دیکھ کر تو کچھ سیکھا کرو۔ایک وہ بھائی (سلیم) بہنوں کو آنکھوں پر بٹھایا، بھانجا بھانجی کی شادیاں کیں، بھانجوں کو پڑھا لکھا کر نوکر کرایا۔ ایک تم بھائی ہو، کس کا بھانجہ اور کیسی بہن۔چاہے کوئی مرے یا جئے۔تمہاری بلا سے۔میں تو تمہارے روپیہ پیسہ کی بھوکی نہیں خالی محبت اور میٹھی زبان کی خواستگار ہوں۔صادقہ مرتے مرگئی اور تمہاری صورت دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔اماں نہیں رہیں، ابا ادھر چلے گئے۔۔۔اب تمہارا دلی میں کون بیٹھا ہے جس کو خط لکھو''۔

خدیجہ کے خط کے اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں بڑی سچائی کے ساتھ دلی جذبات کا بے ساختہ اظہار کیا گیا ہے۔خط یا مکتوب کی خوبی بھی یہی ہوتی ہے کہ خط لکھنے والا بے ساختہ اور بے محابہ کسی تصنع اور آرائش کے بغیر اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔غالب کے خطوط میں بھی یہی بے ساختگی نظر آتی ہے لیکن راشد الخیری کے مکتوباتی افسانہ ''نصیر اور خدیجہ'' میں غالب کے اکثر و بیشتر خطوط میں فرق یہ ہے کہ ''نصیر اور خدیجہ'' کی نثر میں ناصحانہ اور اخلاقی سنجیدگی ہے جو قاری کے اندر نیک جذبات تو پیدا کرتی ہے لیکن قاری کو جمالیاتی مسرت کم ہی حاصل ہوتی ہے لیکن غالب کے خطوط میں ویسی سنجیدگی نہیں بلکہ انشائیہ کی طرح خیالات کی آزاد ترنگیں ملتی ہیں۔جس میں جمالیاتی محاسن کی دلکشی بھی ہے۔اسی لئے غالب کو اُردو میں جدید مکتوب نگاری کا بانی قرار دیا جاتا ہے جبکہ نصیر اور خدیجہ میں مکتوب نگاری کی سوچ

اور فکر ایک سیدھی لکیر پر آگے بڑھتی ہوئی منطقی انجام کو پہنچتی ہے اور یہی چیز ''نصیر اور خدیجہ'' کو افسانہ بناتی ہے۔

دوسری بات یہ کہ خط یا مکتوب میں نجی اور ذاتی جذبات و کیفیات کا بیان ہوتا ہے جس سے مکتوب نگار کی شخصیت کے مختلف پہلو بھی سامنے آتے ہیں اس کی عمدہ مثالیں غالب کے خطوط میں ملتی ہیں۔ ''نصیر اور خدیجہ'' میں بھی ذاتی جذبات و کیفیات بیان کی گئی ہیں لیکن ان کا تعلق خدیجہ کی ذات سے زیادہ خط یا افسانہ کے دیگر کرداروں ،نصیر ،صادقہ اور صادقہ کے بچوں کے حالات سے اور یہ چیز راشد الخیری کی اس خط کی شکل میں لکھی گی تحریر کو افسانہ بناتی ہے۔ ادب کے حوالے سے ایک بات یہ بھی ہے کہ ادبی تحریر کسی بھی شکل میں کیوں نہ سامنے آئے اس میں لکھنے والے کے ماحول کی سماجی ، تہذیبی اور اخلاقی قدروں کی عکاسی بھی ضرور ہوتی ہے۔ مرزا غالب اور حالی ، علامہ اقبال اور فیض احمد فیض کے خطوط میں بھی ، بلا واسطہ یا بالواسطہ طور پر ان کے زمانے کی سماجی اور اخلاقی قدریں نظر آتی ہی ہیں اسی طرح راشد الخیری کے مکتوباتی افسانہ ''نصیرت اور خدیجہ'' میں بھی ،اختصار کے ساتھ ہی بیسویں صدی کے اوائل میں ملک وقوم کے زوال کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ خدیجہ اپنے گھر کی حالیہ بدحالی اور ماضی کی خوشحالی کا ذکر کرتے ہوئے بھائی نصیر کو لکھتی ہے۔

> ''۔۔۔۔دادا جان ذکر کیا کرتے تھے کہ ''غدر'' سے اس مکان پر ہاتھی جھولتا تھا۔ آج جا کر دیکھو ، بے کُنڈی کا ایک کواڑ چڑھا ہوا ہے اور چکنی مٹی کی ایک دیوار چُنی ہوئی ہے۔ بڑے نواب کی آنکھ کا بند ہونا تھا کہ گھر میں جھاڑو پھر گئی۔ میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے مسعود کے بیاہ میں صادقہ کی ساس کو گنگا جمنی پنکھے جھلے جا رہے تھے۔ لونڈیاں مامائیں گوندنی کی طرح زیور

میں لدی ہوئی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے کچھ ایسا زمانہ پلٹا کہ آج
پانی پینے کا کٹورہ بھی نہ رہا''۔

غرض یہ کہ راشد الخیری کا افسانہ ''نصیر اور خدیجہ'' خط کی تکنیک میں لکھا گیا ایک ایسا افسانہ ہے جسے اُردو مکتوب نگاری کا ایک نیا موڑ قرار دینے میں کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیئے۔ سچ تو یہ ہے کہ مرزا غالب نے ''مراسلہ کو مکالمہ بنا کر مکتوب نگاری میں جدت پیدا کی تھی اسی طرح راشد الخیری نے ''نصیرت اور خدیجہ'' لکھ کر مراسلہ کو افسانہ بنانے کا کارنامہ انجام دیا ہے جس کے لیے انہیں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

اُردو کے اہم مکتوب نگار (غالب کے علاوہ)

ڈاکٹر محمد ریاض احمد
شعبۂ اُردو جموں یونی ورسٹی، جموں

مخاطب یا مکتوبِ الیہ تک اپنے جذبات واحساسات یا تجربات و کیفیات کی ترسیل کی تحریری صورت کو ''مکتوب'' کہتے ہیں۔جو بات ہم اپنی زبان کے ذریعے دوسروں تک نہیں پہنچا سکتے ہیں وہی بات ہم مکتوب کے ذریعے دوسرے تک منتقل کر سکتے ہیں۔مکتوب ہر انسان کی رسائی میں ہے کسی انسان کو اُس کی گفتگو کی وجہ سے مہذب کہا جاتا ہے۔لیکن اس سے بڑی چیز جو کسی کو مہذب اور شائستہ بناتی ہے وہ سلیقہ مند مکتوب نگاری ہے۔مکتوب نگار جتنا با سلیقہ ہوگا اُس کی مکتوب نگاری اتنی ہی مہذب اور شائستہ کہلائے گی۔خط کی ایجاد ذہنِ انسانی کے دورِ ارتقاء کی ایک اہم ایجاد ہے۔مکتوب یا خط نگاری کی شروعات بھی انسان کی ضرورتوں کے تحت ہوئی۔اس ایجاد کی ترقی میں انسانی کوشش کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔شروع شروع میں مکتوب نجی اور ذاتی ضرورتوں تک محدود تھا۔لیکن جوں جوں زندگی اور زمانے نے کروٹ بدلی تو مکتوب نگاری بھی ایک فن کی حیثیت اختیار کر گئی۔مکتوب نگاری بڑا ہی کار آمد فن ہے۔اس کے رموز سے واقف ہونے کے بعد مکتوب نگاروں نے اس فن سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا۔اسی وجہ سے مکتوب نگاری، نثر نگاری کی ایک باقاعدہ صنف بن گئی۔مکتوب نہ صرف مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے رازہائے دروں کو اُجاگر کرنے میں

مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ بلکہ مکتوب کے ذریعے شخصیت و کردار کی مکمل عکاسی بھی ہوتی ہے۔مکتوب نگاری ایک ایسی صنف ادب ہے۔ جو بچوں اور بڑوں کو بیک وقت لطف اندوز کرتی ہے۔اس صنف سے ہر شخص لطف اُٹھا سکتا ہے۔مکتوب کی بھی کئی قسمیں ہیں جن میں ذاتی ، سیاسی ، دفتری ،تجارتی ،اطلاعتی،علمی ،معلوماتی ،شخصی اور خیالی وغیرہ اہم ہیں ۔ خط خواہ کسی بھی قسم کے ہوں ان سے علمی،ادبی اور معلوماتی فائدے حاصل ہوتے ہیں ۔ پرانے خطوں کی اہمیت بہت زیادہ ہے کیونکہ پرانے خطوں سے تاریخی اور سوانحی مواد حاصل ہوتا ہے ۔ ویسے تو ہر خط اپنی جگہ دلچسپ ہوتا ہے مگر ادبی و علمی مطالعے کی حیثیت سے خطوط کی اہمیت اس چیز پر بھی ہے کہ خطوط لکھنے والا کون ہے اور یہ خط کس کو لکھے گئے ہیں ۔اس طرح مکتوب نگاری کا فن ایک شخص ہونے کے ساتھ ساتھ شخصیتوں کا فن بھی بن جا تا ہے ۔مکتوب نگاری کے فن میں وہی شخص کامیاب ہوسکتا ہے جس کو قدرت نے اظہار و بیان کی صلاحیت عطا کی ہے ۔ لیکن مکتوب نگار کو اس بات کا شعور ہونا چاہئے کہ اسے کن باتوں کا اظہار کرنا چاہئے اور کن باتوں کے بیان سے پرہیز کرنا چاہئے ۔اسی لئے مکتوب نگاری کو ایک نازک فن کہا گیا ہے۔اس ضمن میں ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> ''کہ خط بڑا ہی نازک فن ہے ۔ یہ کاری گری بھی ہے آئینہ سازی بھی ، یہ مختصر اور محدود بھی اور وسیع اور بیکراں بھی ہے ۔ یہ حد سے زیادہ شخصی بھی ہے مگر اس کے باوجود آفاقی اور اجتماعی بھی ۔ اس میں دانش بھی ہے اور بینش بھی ۔ یہ بظاہر کچھ بھی نہیں مگر اس کا ہر ورق پھر بھی دفتر ہے ۔معرفت کردگار اور معرفتِ انسان دونوں کا ۔ یہ لکھنے والے کے لیے تو محض عرض سخن ہے مگر پڑھنے والے کے لیے گنجینۂ فن بھی ہوسکتا ہے۔غرض خط ایک جہانِ راز

ہے جس کے راز اگر سر بستہ رہیں تو سینوں کو گہر ہائے معنی دفینے
بنا دیں اور آشکار ہو جائیں تو جذبے کی ساری دنیا مشق زار بن
جائے۔''

(سید عبداللہ، نقوش، مکاتیب نمبر، ص،۲۴)

خط نگاری ایک ایسی صنف ادب ہے جسے نہ ٹھوس اصول وضوابط کی قید میں جکڑا جا سکتا ہے، اور نہ خیال کی لیکن بعض جمالیاتی تقاضوں کا لحاظ ضرور رکھا جاتا ہے۔ موضوع چھوٹا ہو یا بڑا آپ خط لکھ سکتے ہیں۔ کسی بھی خیال کی آمد پر کسی بھی سوچ اور فکر کو دائرہ نظر میں رکھ کر خط لکھا جا سکتا ہے خطوط کہیں سے بھی شروع اور کہیں پر بھی آغاز وانجام کی پرواہ کئے بغیر ختم کئے جا سکتے ہیں۔

دراصل چند معلومات کو پیغام کی شکل میں تحریر میں لا کر مکتوب الیہ تک پہنچانا خط نگاری کا مقصد ہے۔ مکتوب نگاری کا اولین مقصد ادب پیدا کرنا نہیں لیکن انسانی ذہن نے اس کو تہذیب وتکمیل کے اُس درجے تک پہنچا دیا ہے کہ آج یہ باضابطہ ایک فن بن گیا ہے۔ لہٰذا اُردو ادب کی تاریخ میں اعلیٰ خطوط بھی ادبی شاہکاروں کے پہلو بہ پہلو رکھے گئے ہیں۔

کہنے کی ضرورت نہیں کہ اُردو ادب میں اس صنف کا باقاعدہ آغاز مرزا غالب کے خطوط سے ہوتا ہے۔ مرزا غالبؔ کی قائم کردہ خطوط نگاری کی روایت کو آگے لے جانے والوں میں سر سید احمد خان، مولانا الطاف حسین حالیؔ، علامہ شبلی نعمانی، محمد حسین آزادؔ، ڈاکٹر محمد اقبالؔ، مولوی عبدالحق، سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزادؔ، امیر مینائی، اکبر آلہ آبادی، مہدی افادی، سعادت حسن منٹو، پریم چند، پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی، جوش ملیح آبادی، نیاز فتح پوری، سجاد ظہیر، پروفیسر گیان چند جین اور رشید حسن خاں وغیرہ کے نام سرفہرست ہیں۔ سب کا تو نہیں لیکن ان میں سے چند مکتوب

نگاروں کا قدرے تفصیل سے ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

سرسید کے مکاتیب کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اُن کے خطوط کا پہلا مجموعہ سرراس مسعود نے ''خطوطِ سرسید'' کے نام سے ۱۹۲۴ء میں شائع کیا۔ علاوہ ازیں شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی نے ''مکتوباتِ سرسید'' کے عنوان سے ۱۹۵۹ء میں شائع کیا۔ اس کے بعد مذکورہ مجموعوں کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

سرسید نے بیشتر خطوط اپنے رفقائے کار نواب محسن الملک، مولانا محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، مولوی سید امداد علی، سید شرف الدین اور مولوی زین العابدین وغیرہ کے نام لکھے ہیں۔ سرسید بنیادی طور پر مدعا اور مقصد کے حامی ہیں۔ اس لئے ان کے خطوط میں بھی اُن کی ادبی تحریک کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ وہ مکتوب نگاری میں بھی صرف کام کی باتیں کہنا چاہتے ہیں۔ ان کے خطوط میں تنہائی کم اور اجتماعی زندگی کا ہنگامہ وشور زیادہ ہے۔ کیونکہ وہ اپنی تحریک کے معاملات میں جوش و خروش سے کام لیتے ہیں اور یہی سرسید کی روزمرہ زندگی کا عام رنگ بھی ہے۔ ان کے خطوط کا دائرۂ موضوع بھی اُن کی ادبی و اصلاحی تحریک کے اردگرد ہی رہتا ہے۔ اُنھوں نے اپنے خطوط میں تفسیر القرآن، مذہبی خیالات، علی گڑھ کالج کا نظام، ہاسٹل کا نظم و ضبط، کالج کے متعلق انگریزوں کے عزائم، تہذیبی، اخلاقی اور علمی موضوعات کو جگہ دی ہے۔ سرسید کے خطوط کی نمایاں خصوصیت سادہ اور ان کا بے تکلفانہ انداز ہے۔

سرسید کے بعد محمد حسین آزادؔ نہ صرف انشا پردازی میں ایک اہم مقام ومرتبہ رکھتے ہیں بلکہ اُردو مکتوب نگار کے بھی جانے جاتے ہیں۔ آزادؔ کے خطوط کا پہلا مجموعہ ''مکتو باتِ آزادؔ'' کے نام سے ۱۹۰۷ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ مولانا آزاد کی خطوط نویسی پر مرزا غالب کا انداز نمایاں دکھائی دیتا ہے بلکہ اُن کے بعض خطوط میں یہ فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ مولانا کے خطوط ہیں یا غالبؔ کے۔ آزاد اپنے خطوط میں جہاں

ایک طرف غالب کی طرح صاف ،شُستہ سلیس زبان کا استعمال کرتے ہیں وہیں دوسرے طرف وہ غالبؔ کے طرز پر ہی القاب وآداب کی پرواہ کیے بغیر بعض اوقات مکتوب الیہ سے براہ راست مخاطب ہوتے ہیں۔وہ خطوط میں کبھی کبھار اپنے آپ کو غائب فرض کر لیتے اور خط کے خاتمہ پر کبھی بندہ ،کبھی نیاز مند،کبھی صرف محمد حسین عفی عنہ یا دعا کامحتاج بندہ آزاد وغیرہ لکھتے ہیں۔آزادؔ نے مرزا غالبؔ کے انداز کو اس قدر اپنایا کہ اُن کے یہاں سادگی وروانی کسی بھی طرح غالبؔ سے کم نہیں ہے۔ایسا لگتا ہے جیسے آزاد نے شعوری طور پر غالب کے اندازِ بیان کی پیروی کی کوشش کی ہے۔مثلاً ایک خط میں اپنے دوست کو لکھتے ہیں:

''جناب من! ہزار لعنت ہے مجھ پر کہ تم جیسے شخص کو ایسے اضطراب میں ڈالتا ہوں۔اور لاکھ لاکھ لعنت ہے میرے اعمال و اشغال پر کہ مجھے ایسے عالم میں ڈال رکھا ہے کہ جو چاہتا ہے اور جو واجب وفرض عینی ہے وہ کر نہیں سکتا ، بھائی ! تم تو سچے ۔مگر تمہیں میرے حال کی بھی خبر ہے؟۔''

(مولوی محمد حسین آزاد مکاتیبِ آزاد،مجلس ترقی ادب ، لاہور ص،۱۳۳)

آزاد کے خطوط اُن کی طبیعت اور مزاج کے بھی عکاس ہیں ۔ان کے خطوط میں خود اُن کی اپنی ذات سانس لیتی ،چلتی پھرتی اور باتیں کرتی نظر آتی ہے۔ایک خط میں میجر سید بلگرامی کو لکھتے ہیں:

''جن جن نسخوں کے لیے آپ نے ارقام فرمایا ہے۔بے شک حصول مقاصد اور مطلب براری کا رستہ یہی ہے ،مگر کیا کروں کہ طبیعت ایسی واقع نہیں۔میں ہمیشہ یک رُخی بازی کھیلا

ہوں اور خدا چاہے تو یہی چال چلوں گا، جیت ہار خدا کے ہاتھ ہے۔کبھی تو ہمارا پانسہ بھی سیدھا پڑے گا۔''

(مولوی محمد حسین آزاد مکاتیبِ آزاد مجلس ترقی ادب، لاہورص،۱۳۱)

خط کے اس اقتباس سے آزاؔد کی قناعت پسندی ،خودداری اور اصول پرست طبیعت کا بخوبی اندازلگایا جاسکتا ہے۔مولانا آزاد نے زندگی بسر کرنے کے جوانداز اپنے خطوط میں اپنائے ہیں وہ ہماری تہذیب کا انمول ورثہ ہیں۔

مولانا الطاف حسین حالی کا شمار بھی عہد سرسید کے اہم مکتوب نگاروں میں ہوتا ہے ۔مولانا حاؔلی نے اپنا پہلا خط ۸فروری ۱۸۷۹ء میں مولوی محمد یعقوب مجدی کے نام لکھا ۔حاؔلی کے خطوط'' مکتوباتِ حالی'' کے عنوان سے تین جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ مکتوباتِ حالی حصہ اول ودوئم ۱۹۲۵ء میں پانی پت سے شائع ہوئے جبکہ تیسرا مجموعہ ''مکاتیبِ حالی'' کے نام سے شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے مرتب کیا ہے۔سرسید کی طرح حاؔلی بھی اپنے خطوط میں مدعا نگاری اور خوش مزاجی کے ساتھ ساتھ مکتوب الیہ کے مقام ومرتبہ کا خاص لحاظ رکھتے ہیں۔ان کے خطوط میں دوسرے مکتوب نگاروں کی طرح خودنمائی کاعنصر کم اور خاکساری کی جھلک زیادہ نظر آتی ہے، جواُن کی طبیعت کا خاصہ ہے۔کیونکہ حاؔلی ایک دردمند اور مخلص انسان تھے،ان کا ذاتی اخلاص ان کے خطوط میں ہی نہیں بلکہ اُن کی دوسری تحریروں میں بھی جا بجا نظر آتا ہے۔

حاؔلی کے خطوط اپنے عزیزوں،دوستوں کے علاوہ مختلف علمی وادبی شخصیات کے نام ہیں،جن میں آزاد،شبلی ،مولانا ظفر علی خاں،مولوی حبیب الرحمٰن شیروانی اور اُن کے فرزند خواجہ سجاد حسین وغیرہ شامل ہیں۔ان خطوط میں علمی،ادبی اور عصری معلومات کے علاوہ کتب وجرائد کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔جن سے اس عہد کی ادبی سرگرمیوں اور

رجحانات وتحریکوں تک رسائی بھی حاصل ہوتی ہے جو خطوط انہوں نے اپنے عزیز واقارب کو لکھے ہیں وہ زیادہ تر قیامِ لاہور کے دنوں کے ہیں، جب وہ پنجاب گورنمنٹ پریس میں ملازمت کرتے تھے۔اس کے علاوہ انہوں نے پانی پت، علی گڑھ اور قیامِ دہلی کے زمانے میں بھی کئی خطوط لکھے ہیں جن میں زیادہ تر ان کی ذاتی اور نجی باتوں کا ذکر ملتا ہے۔علاوہ ازیں مولانا حالی کے معمولاتِ زندگی اور ان کی اپنی اولاد سے محبت بھی واضح طور پر نظر آتی ہے۔وہ اپنے فرزند خواجہ سجاد حسین کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''تم کو یہاں سے روانہ ہوئے آج پانچواں روز ہے۔ہر روز انتظار کیا جاتا ہے مگر ابھی تک نہ تم نے اپنی خیریت لکھی اور نہ نانو خاں نے کچھ لکھا جس نے کہا تھا کہ میں ایک خط گجرات سے اور دوسرا راولپنڈی سے فوراً روانہ کروں گا۔طبیعت کو ہر وقت خلجان رہتا ہے چاہئے کہ اپنی خیر و عافیت سے جلدی مطلع کرو۔''

(مکتوباتِ حالی، حالی پریس پانی پت، ۱۹۲۵ء، ص،۲۸۹)

مولانا حالی چونکہ اپنے عہد کی اہم علمی وادبی شخصیت تھے اسی لیے ان کے عہد کے تمام اہم مشاہیرِ ادب کے ساتھ ان کی خط وکتابت تھی لیکن ایک اہم اور حیران کن بات یہ ہے کہ حالؔی کے مخلص استاد مرزا غالب اور ہم نوا سرسید کے نام ان کے خطوط موجود نہیں ہیں۔اس سلسلے میں محترمہ صالحہ عابد حسین حیرانگی سے لکھتی ہیں:

''یقین غالب ہے کہ ان بزرگوں سے حالی کی جو خط وکتابت ہوئی وہ کئی لحاظ سے بہت زیادہ اہم اور قابلِ قدر ہوگی۔ غالؔب سے ادبی اور شعری نکات پر اکثر تبادلہ خیالات ہوا کرتا تھا اور سرسید سے تو ہر مسئلے پر بات چیت اور خط وکتابت ہوتی تھی

لیکن افسوس کہ ان بزرگوں کے نام خطوط ضائع ہو گئے اور داب
کے شائقین کے ہاتھوں نہ پہنچ سکے۔''

(صالحہ عابد حسین، یادگارِ حالی، ص، ۲۴۷)

البتہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے ''مکا تیبِ حالی'' کے نام سے جو مجموعہ مرتب کیا ہے اُن میں ایک فارسی خط غالب کے نام ضرور ملتا ہے لیکن جہاں تک سرسید کا تعلق ہے تو اُن کے آٹھ خطوط مولانا حالؔی کے نام ملتے ہیں جو ''مکتوباتِ سرسید'' کی جلد اول میں موجود ہیں لیکن حالؔی کا کوئی بھی خط سرسید کے نام اب تک دستیاب نہیں ہو سکا۔

اُردو کے مکتوباتی ادب میں مولانا شبلی کا نام بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ان کی اُردو مکتوب نگاری کا آغاز اُن کے قیامِ علی گڑھ کے دوران ہوا۔ شبلی کی وفات کے بعد اُن کے شاگرِ عزیز سیلمان ندوی نے اپنے اُستاد کے خطوط کو ''مکاتیبِ شبلی'' کے نام سے دو جلدوں میں شائع کیا۔ ''مکاتیبِ شبلی''، میں شامل خطوط مختلف پچاس شخصیات کے نام لکھے گئے ہیں جن میں مولانا شبلی کے عزیز، دوست، اور شاگرد بھی شامل ہیں۔ ان خطوط میں علمی، مذہبی اور اصلاحی معلومات کے علاوہ شبلی کی زندگی کے کئی پنہاں پہلو بھی روشن ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ شبلی کے خطوط کا ایک اور مجموعہ ''خطوطِ شبلی'' کے عنوان سے محمد امین زبیری نے ۱۹۳۵ء میں شائع کیا۔ اس مجموعہ میں کل ۸۲ خطوط ہیں جو صرف دو خواتین عطیہ بیگم فیضی اور زہرا بیگم فیضی کے نام لکھے گئے ہیں۔ شبلی کی مکتوب نگاری کا کمال یہ ہے کہ وہ تنقید اور روک ٹوک کی پرواہ کیے بغیر خط لکھتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے یہاں تنقید و طنز کا عنصر بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد کے بارے میں مہدی افادی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''آزاد کی کتاب آج ہی آئی۔ جانتا تھا کہ وہ تحقیق کے
میدان کا مرد نہیں۔ تاہم وہ اِدھر اُدھر کی گپیں بھی ہانک دیتا ہے تو

وحی معلوم ہوتی ہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ گیارہ لکچر تک اس نے
میری سرحد میں قدم بھی نہیں رکھا۔ بارہویں میں یہ میدان میں
اُترا ہے ۔لیکن زور پہلے صرف ہو چکا تھا۔ اس لئے یوں ہی
سرسری چکر لگا کر نکل گیا۔ میرے لیے بہت وسعت ہے۔ بہ
حالتِ مجموعی کتاب براؤن کی کھتونی سے کہیں بہتر ہے۔''

(مکاتیبِ شبلی، ۱۹۳۸ء ص،۲۱۲)

تنقید وطنز کے باوجود شبلی کے خطوط میں علمیت اور ادبیت کی کمی نہیں ہے اُن کے یہاں ایک وقار، سکون، صبر وتحمل اور محبت وخلوص بھی ملتا ہے۔

مہدی افادی کا شمار اُردو کے صاحبِ طرز انشا پردازوں کے ساتھ ساتھ اہم مکتوب نگاروں میں بھی ہوتا ہے۔اُن کے خطوط ''مکاتیبِ مہدی'' کے نام سے منظر عام پر آچکے ہیں۔مضامین اور انشائیوں کی طرح مہدی کے خطوط میں بھی لطافت اور خوش نمائی نظر آتی ہے۔ مہدی افادی کی اہلیہ جوانی میں ہی فوت ہو گی تھیں اُس کی اطلاع ایک خط کے ذریعے میر ناصر علی کو یوں دیتے ہیں:

''پیارے جناب! میں ادھر ہفتہ عشرہ آپ کی طرف سے
کچھ غافل رہا لیکن اس کی وجہ نہایت دلچسپ ہے۔آپ سے
زیادہ کوئی نہیں جانتا کہ دنیا میں کسی کو چاہنا غضب ہے لیکن اس
سے زیادہ قیامت یہ ہے کہ کہیں سے آواز آئے کہ ''تو مجھ پہ مرتا
ہے تو میں بھی تجھ پر جان دیتی ہوں۔'' پہلے پہل آنکھیں کھولیں
مدت ہوئی ایک رفیق زندگی مل گیا تھا تو خواب بغلی و آرزوے
شباب پہلو میں تھی۔ زندگی کا بہترین حصہ اس کی پرستش میں
گزرا۔لیکن اس نے ترکِ رفاقت کی آج تک داغ دل میں

موجود ہے۔

یہ سینے میں تا زندگانی رہے گا
تیرا داغ دل میں نشانی رہے گا ''

(مہدی بیگم، ۱۹۳۸ء، مکاتیبِ مہدی، ص، ۱۵۱)

مہدی مرزا غالب کی طرح مکتوب نگاری کے تقاضوں سے پوری طرح واقف تھے۔شاید اسی باعث اُن کی رنگینی اور زندہ دلی میں بھی متانت اور سنجیدگی نظر آتی ہے۔

مولوی نذیر احمد کے خطوط کا مجموعہ ''موعظہ حسنہ'' کے نام سے شائع ہوا۔اُنہوں نے بیشتر خطوط اپنے فرزند مولوی بشیر الدین کے نام لکھے ہیں۔جن میں ناصحانہ اور واعظانہ انداز ملتا ہے۔وہ بشیر الدین سے کبھی تو محبت و ہمدردی سے اور بعض اوقات سختی اور ناراضگی سے پیش آتے ہیں۔وہ اپنے بیٹے کو نصیحتیں کرتے ہوئے تعلیم اور مقاصد کے حصول پر زیادہ زور دیتے ہیں۔اپنے بیٹے کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''بشیر اگر تم پڑھنا نہیں چاہتے یا پڑھنا اگر تمہاری قسمت میں نہیں تو مجھ کو تم سے لڑنا منظور نہیں۔تم جانو تمہارا کام۔لیکن اے خدا مجھے اس مصیبت جھیلنے کو زندہ مت رکھیو کہ ایک اللہ آمین کا بیٹا اور وہ بھی جاہل۔''

(نذیر احمد، موعظہ حسنہ، ص، ۱۳۸)

مولوی نذیر احمد اپنی دوسری تحریروں میں پند و نصائح اور اصلاح کے حامی نظر آتے ہیں۔شاید یہی وجہ ہے ویسا ہی انداز و اسلوب اُن کے مکتوبات میں بھی نظر آتا ہے۔

امیر مینائی نے بھی اپنے شاگردوں، دوستوں اور عزیزوں کو کئی خطوط لکھے ہیں جن کو ان کے شاگرد احسن اللہ خاں ثاقبؔ نے مرتب کر کے ۱۹۱۰ء میں شائع کیا۔ان خطوط میں امیر مینائی کے خاندان، شاگردوں کی رہبری و رہنمائی اور معاصرین سے

اُن کے تعلقات کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔امیر مینائی کے خطوط کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں زبان،قوائداورفن عروض کی معلومات کا بیش بہاخزانہ موجود ہے ۔ان کے خطوط میں علمیت کے ساتھ ساتھ بہترین انشا پردازی کے نمونے بھی ملتے ہیں کیونکہ وہ نہ صرف شاعری میں اپنا منفرد مقام رکھتے تھے بلکہ لغت نویسی اور تذکرہ نگاری کے حوالے سے بھی ان کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

باباۓ اُردومولوی عبدالحق نے انشاپردازی کے ساتھ مکتوب نگاری میں جو ہر دکھائے ہیں۔اُن کے اکثر خطوط محمّد خان ، ذاکرحبیب اُلنساء ،منظور احمد،نفیس سلیم تمنائی ،جلیل مانک پوری کے علاوہ کئی دوسرے اساتذۂفن کے نام ملتے ہیں۔بعض لوگوں کے مطابق مولوی صاحب نے اپنی ستر سالہ ادبی زندگی میں کم ازکم پچاس ہزار چھوٹے بڑے خطوط تو ضرور لکھے ہوں گے۔ان کے خطوط میں موضوعات کا تنوع ہے ۔ان کے یہاں توحیدوتقدیر،عقیدہ اوراعتقاد،کُتب ورسائل کا ذکر،زبان وادب کی اہمیت،مختلف اسفار ،مثلاً اورنگ آباد سے دلّی اور دلّی سے پاکستان انجمن کی منتقلی کا بھرپوراحوال ملتاہے۔نمونہ کےطور پرایک خط پیش خدمت ہے۔

’’میں ابھی اورنگ آبادوغیرکےدورے سےواپس آیاہوں۔آپ کا خط یہاں ملا۔آپ اپنامقالہ شعرائے اُردوکےتذکروں کےمتعلق بھیج دیجیے،توجہ کےساتھ رسالہ اردومیں شائع کردیاجائے گا۔براہِ کرم اطلاع فرمائیں کہ آپ کی یونیورسٹی میں گرمی کی چھٹیاں کب ہونی ہیں۔آپ کی تصنیف کےمتعلق وقتاًفوقتاًاطلاع دیتارہوں گا۔پرسوں دہلی روانہ ہوجاؤں گا‘‘۔

(مکتوباتِ عبدالحق مرتب جلیل قدوائی مکتبہ اسلوب کراچی اشاعت ۱۹۴۶ءص،۳۳)

مولوی عبدالحق اپنے عہد کے ایک بلند قامت مبصر،محقق،ناقد راور خطیب رہے

ہیں۔انہوں نے بے شمار علمی اور ادبی محفلوں اور جلسوں میں بڑی کامیاب تقاریر کیں۔ دکنی ادب کو فروغ دینے کے لئے انہوں نے نہایت اہم مضامین اور مقالات تحریر کئے۔ سنجیدہ تحریر کے ساتھ ساتھ طنز ومزاح لکھنے میں بھی شہرت حاصل کی۔اردو زبان وادب کی خاطر ان کی ہمہ جہت قربانیوں اور کوششوں کے ساتھ ان کی مکتوب نگاری کو بھی کبھی فراموش نہیں کیا جائے گا۔

علامہ اقبال ایک عظیم شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ غیر معمولی نثر نگار بھی ہیں اور نثر نگاری میں ان کے خطوط خاص اہمیت رکھتے ہیں۔اگر چہ ان کو جو مقام شاعری میں حاصل ہوا وہ مکتوب نگاری میں نہیں مل سکا لیکن اس کے باوجود انہوں نے مکتوب نگاری کی روایت کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔اقبال کے خطوط کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں،ان میں سے چند درج ذیل ہیں۔

۱۔شاد اقبال (مرتبہ) پروفیسر محی الدین قادری زور،۱۹۴۲

۲۔اقبال نامہ،حصہ اول،مرتبہ،شیخ عطاءاللہ،ایم اے۔۱۹۴۵

۳۔اقبال نامہ،حصہ اول،مرتبہ،شیخ عطاءاللہ،ایم اے۔۱۹۴۵

۴۔مکاتیب اقبال بنام نیاز الدین خان مرحوم (مرتبہ) بزم اقبال،۱۹۸۴

۵۔مکتوباتِ اقبال بنام سید نذیر نیازی مرحوم (مرتبہ) سید نذیر نیازی،۱۹۵۷

۶۔انوارِ اقبال (مرتبہ) بشیر احمد ڈار۔۱۹۴۷

۷۔Letters & writings of Iqbal (مرتبہ) محمد عبداللہ قریشی۔۱۹۴۷

۸۔مکاتیب اقبال بنام گرامی (مرتبہ) محمد عبداللہ قریشی،۱۹۴۹

۹۔خطوط اقبال (مرتبہ) رفیع الدین ہاشمی،۱۹۴۷

۱۰۔روح مکاتیب اقبال (مرتبہ) محمد عبداللہ قریشی۔۱۹۷۷

۱۱۔خطوط اقبال بنام عطیہ،انگریزی۔۱۹۴۷

اقبال نے اپنے خطوط میں مختلف علمی، تاریخی، معاشی اور فلسفیانہ مسائل پر بحث کی ہے اور اپنے مکتوب الیہ کے ساتھ قرآن، حدیث، فقہ، تصوف اور دین اور شریعت کے مختلف پہلوؤں پر تبادلہ خیال کیا ہے۔ کئی خطوط میں نظریہ خودی، تصور شاہین اور تصوف وغیرہ کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔ نیز انہوں نے اپنے خطوط میں بعض اشعار و افکار کی تشریح بھی کی ہے۔

''غبارِ خاطر'' کے تمام خطوط بظاہر خطوط ہیں اور خطوط کی نیت سے ہی لکھے گئے ہیں لیکن درحقیقت یہ مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی کے درد و غم ہیں جو منتشر طور پر خطوط کی شکل میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اگر ان منتشر حالات کو ترتیب کے ساتھ اکٹھا کر لیں تو صحیح معنوں میں مولانا کی خودنوشت سوانح عمری بن سکتی ہے۔ ان خطوط میں مولانا آزاد کی شخصیت کی انفرادیت، انانیت، مذہبیت، سیاسی بصیرت، قومیت اور وطنیت اور فکر و فلسفہ وغیرہ کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ مولانا کی نجی زندگی کے واقعات، ان کی شخصیت کے تضادات، ان کے حالات کی نیرنگیاں، ان کی خوشیاں، غم، کھانے پینے کے شوق اور عادات و اطوار سب کچھ دکھائی دیتے ہیں۔

''غبارِ خاطر'' میں شامل خطوط کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان خطوط میں اشعارِ کثرت سے استعمال کیے گئے ہیں۔ ہر دوسری تیسری سطر کے بعد شعر ضرور لکھا گیا ہے اس سے نثر کے حسن میں دل آویزی اور دل کشی پیدا ہوگئی ہے۔ قلعہ احمد نگر کے اکثر خطوط میں یہی شان نظر آتی ہے۔ گویا مولانا نے نثر میں شاعری کی ہے اور جس مطلب کو ادا کیا ہے اس میں اپنے تخیل کی جولانیاں خوب دکھائی ہیں۔ مولانا آزاد بنیادی طور پر شاعر نہیں تھے لیکن ان کی نثر میں جو شعریت ملتی ہے وہ شاعری سے کچھ کم نہیں ہے۔ نثر اور نظم کے امتزاج نے مولانا آزاد کے خطوط کے حسن کو اور بھی دو بالا کر دیا ہے۔

''غبارِ خاطر'' اور مولانا آزاد کی ایک اہم خصوصیت ان کی مذہبی رواداری ہے۔ مولانا خاندانی عالم تھے ،قران ، فقہ واحادیث کے رموز و اسرار سے واقف تھے۔ لیکن اس کے باجود وہ کٹر مولوی یا ملا نہیں تھے۔

''غبارِ خاطر'' کے ایک خط میں جو چڑیا چڑے کی کہانی پیش کی گئی ہے۔اس سے مولانا کے زورِ بیان کا اندازہ ہوتا ہے۔الفاظ کی دل کشی ، واقعات کا مشاہدہ ، ذاتی تجربہ،طبیعتوں کا جائزہ غرض کہ اس داستان میں ایک صاحبِ دل اور ایک صاحبِ نظر کی پرچھائیں دکھائی دیتی ہے۔ایک فلسفی کس طرح قدرتی مناظر کو دیکھتا اور ان کا لطف لیتا اور رنگینی کے ساتھ انہیں بیان کرتا ہے۔اس کا بہترین نمونہ ''غبارِ خاطر'' کے سوا شاید ہی کہیں اور مل سکے۔

''غبارِ خاطر'' کے مطالعہ کے بعد مولانا آزاد کے حافظے کی داد دینی پڑتی ہے۔ جس کی مدد سے انہوں نے اپنے خطوط میں عربی ، فارسی ،اور اُردو کے اشعار اور فقروں وجملوں وغیرہ کو جس طرح جا بجا برمحل نقل کیا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔

''غبارِ خاطر'' میں مولانا آزاد کے محققانہ عنصر بھی صاف نظر آتے ہیں۔قلعہ احمد نگر پر جب لکھا تو انہوں نے چند صفحوں میں وہاں کی ساری تاریخ بیان کر دی۔ وہ چائے کا بیان کرنے پر آئے تو اس کی تاریخ ،قسمیں ، پینے کے طریقے سب اس انداز میں بیان کیے کہ چاہے نہیں پینے والا بھی پورا لطف لے سکتا ہے۔

'' غبارِ خاطر'' میں رومانیت کا رنگ بھی صاف دیکھا جا سکتا ہے۔''غبارِ خاطر'' میں ہر مشاہدہ خوبصورت تخلیقی تجزیہ کے سانچے میں ڈھلا ہوا نظر آتا ہے۔ پھولوں پر گفتگو ہو رہی ہو یا درختوں اور پودوں پر، پرندوں پر اظہارِ خیال کیا جا رہا ہو یا جانوروں پر، ہر جگہ مولانا کے مشاہدے کی داد دینی پڑتی ہے۔

''غبارِ خاطر'' میں مکتوب الیہِ برائے نام ہے یہ خطوط کہیں شعری انداز میں ہیں تو

کہیں افسانوی انداز میں، عبارت کہیں دقیق علمی ہے تو کہیں سادہ اور سلیس۔ان کے خطوط میں خطیبانہ انشا پردازی بھی ہے اور حیات وکائنات کے حوالے سے فلسفیانہ نکتہ رسی بھی۔ان کے خطوط سے ہمیں یورپ کے فلسفیوں اور ایشاء کے قدیم مفکروں کے خیالات سے آگاہی ہوتی ہے۔خوشی کے فلسفہ پر مولانا اس طرح روشنی ڈالتے ہیں کہ اصل خوشی جسم کی نہیں دماغ کی ہے۔ جو قید خانے میں بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''قید خانے کی چار دیواری کے اندر بھی سورج ہر روز چمکتا ہے اور چاندنی راتوں نے کبھی قیدی اور غیر قیدی میں امتیاز نہیں کیا۔''

مجموعی طور پر''غبارِ خاطر'' مولانا آزاد کی اُردو نثر پر غیر معمولی قدرت کا ثبوت ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مختلف اسالیب کو حسبِ ضرورت استعمال کرنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔اس میں مولانا کے خطوط کے موضوع الگ الگ ہیں اور ہر موضوع کا تقاضہ بھی الگ الگ ہے۔اس لئے موضوع کی مناسبت سے تحریر کے بھی مختلف اسلوب اختیار کیے گئے ہیں۔غرض کہ''غبارِ خاطر'' میں کہیں آسان و عام فہم زبان ہے تو کہیں فارسی آمیز علمی زبان کہیں شعریت کا غلبہ اور کہیں طنز وظرافت کی چاشنی ہے۔

مولوی عبدالحق کی طرح رشید حسن خاں کا نام بھی اُردو محققین میں شمار ہوتا ہے۔ لیکن انہوں نے بھی ایک ہزار سے زائد خطوط لکھے ہیں۔رشید حسن خاں کے خطوط کا مجموعہ''رشید حسن خاں کے خطوط'' کے عنوان سے ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا نے ۲۰۱۱ء میں شائع کیا ہے۔رشید حسن خاں کے خطوط کی اہمیت صرف اس لئے نہیں ہے کہ یہ ایک محقق یا ناقد کے خطوط ہیں بلکہ ان کے خطوط سے بھی اصولِ تحقیق اور اس کے طریقۂ

کار پر روشنی پڑتی ہے اور بعض اوقات قاری یوں محسوس کرتا کہ وہ خطوط کا نہیں بلکہ فنِ تحقیق پر لکھی گئی کسی مستند تصنیف کا مطالعہ کر رہا ہے۔ ایک خط میں تسلیم غوری بدایونی کو لکھتے ہیں:

''مجھے مسرت ہے کہ آپ نے ایک اچھے موضوع کو اختیار کیا۔ اس بنا پر اگر میں یہ توقع کروں کہ آئندہ آپ ایسے ہی موضوعات کو منتخب کریں تو بے جا نہ ہوگا البتہ یہ ضرور چاہوں گا کہ آئندہ آپ ایسے ہی موضوعات کی نسبت سے ہمیشہ اولین ماخذ سے کام لیجئے۔ ثانوی ماخذ مقامی لکھنے والے جذبۂ طرف داری سے عموماً خالی نہیں ہوتے، اس لیے ایسی تحریروں سے استفادہ بہت احتیاط کا طلب گار ہوتا ہے۔ جب تاریخیں موجود ہیں تو پھر ثانوی تحریروں سے کیوں کام لیا جائے۔ اس سے میرا مطلب آپ کی ہمت شکنی نہیں ...... میرا مقصد طریقہ کار کی طرف متوجہ کرنا تھا۔ تحقیق کی اصطلاح میں اوّلین ماخذ کے ہوتے ہوئے ثانوی ماخذ قابلِ قبول نہیں ہوتے۔''

ٹی۔آر۔رینا۔رشید حسن خاں کے خطوط ص،۲۸۸

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ رشید حسن خاں کے خطوط اُن کی زندگی کے حالات اور ذاتی تعلقات کو ہی سامنے نہیں لاتے بلکہ اصولِ تحقیق کے تقاضوں کو بھی اُبھارنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ رشید حسن خاں نے اپنے بیشتر خطوط جن مصائب، دوست اور ادیب کے نام لکھے ان میں ارجمند آرا، اسلم پرویز، اسلم محمود، اصغر عباس، اطہر فارقی، تسلیم غوری بدایونی، ٹی۔آر۔اینا، جگن ناتھ آزاد، جمیل الدین عالی، حنیف نقوی، خلق انجم، راج بہادر گوڑ، رفیع الدین ہاشمی، شارب ردولوی، شہر

یار،ظہورالدین، عابد سہیل،علی احمد فاطمی، گیان چند جین، مرزا خلیل احمد بیگ، ممتاز احمد خاں، نثار احمد فاروی، محمد انصاراللہ اور محمد عقیل رضوی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

اسی طرح سعادت حسن منٹو نے بھی اپنی زندگی میں بہت سارے خطوط اپنے احباب،عزیزوں اور دوستوں کو لکھے۔ان میں سے کچھ بہت ضروری خطوط منظر عام پر آئے ہیں، خاص طور پر اُن کے وہ خطوط جو انہوں نے مشہور شاعر اور افسانہ نگار ''احمد ندیم قاسمی'' کو لکھے ہیں۔منٹو کے خطوط کا مجموعہ اسلم پرویز نے ''منٹو کے خطوط'' کے نام سے ۲۰۱۲ء میں شائع کیا۔منٹو کی خط و کتابت کا آغاز اس زمانے سے ہوتا ہے جب انہوں نے ۸ جنوری ۱۹۳۷ء میں اختر شیرانی کو ایک خط لکھا اور خط لکھنے کا سلسلہ اُس وقت بند ہو جاتا ہے۔جب انہوں نے ۱۷ جنوری ۱۹۵۵ء کو اپنی موت سے ایک دن قبل مہدی علی خان کو ایک سفارشی خط ارسال کیا۔

پہلے بھی ذکر ہوا کہ منٹو کے بیشتر خطوط احمد ندیم قاسمی کے نام ہیں۔منٹو اور احمد ندیم قاسمی کے درمیان مراسلت کا آغاز جنوری ۱۹۳۷ء میں اور ختم فروری ۱۹۴۸ء میں ہوتا ہے۔یعنی ان کی خط و کتابت گیارہ سال کے عرصے پر محیط ہے۔اس کے بعد ۱۹۵۵ تک منٹو نے جن دوسرے دوستوں کے نام خطوط لکھے ان میں عبدالوحید، محمد طفیل ،ہاجرہ مسرور، محمد یوسف، ممتاز شریں، ڈاکٹر محمد باقر، عزیز احمد، نصیر انور، مہدی علی خان وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔لیکن ان احباب و اقارب کے ساتھ منٹو کی خط و کتابت کا سلسلہ ویسا نہیں تھا جیسا احمد ندیم قاسمی کے ساتھ تھا بلکہ ان کے نام منٹو نے اکا دُکا خط لکھے ہیں۔منٹو نے پچیس سال کی عمر میں پہلا خط لکھا اور آخری خط تینتالس برس کی عمر میں اُس وقت لکھا جب وہ شہرت و مقبولیت کی بلندی پر تھے۔

منٹو نے احمد ندیم قاسمی کو جو پہلا خط لکھا اس میں افسانہ ''بے گناہ'' کی بے حد تعریف کی۔احمد ندیم قاسمی خود حیران ہوئے کہ آخر اس افسانے میں منٹو نے کیا دیکھا

جو اتنی تعریف کر رہے ہیں۔منٹو قاسمی کے افسانے کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''آپ کا افسانہ ''بے گناہ'' وقعتہً بے حد پسند کیا ہے۔سچ تو یہ ہے کہ اس قسم کے جذبات میں ڈوبے ہوئے افسانے اُردو ادب میں بہت کم شائع ہوئے ہیں آپ کے ہاتھ پلاسٹک ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ افسانے کے موضوع کو آپ نے نہ صرف محسوس کیا ہے بلکہ چھو کر بھی دیکھا ہے۔ یہ خصوصیات ہمارے ملک کے افسانہ نگاروں کو نصیب نہیں۔میں آپ کو مبارک باد دنیا چاہتا ہوں کہ آپ میں یہ خصوصیات بہ درجہ اتم ماجود ہے۔''

(سلم پرویز (مرتب) آپ کا سعادت حسن منٹو ۲۰۱۲ء ص،۲۷)

منٹو جہاں ایک طرف احمد ندیم قاسمی کو ''بے گناہ'' جیسے اور افسانے لکھنے کی ترغیب دیتے ہیں وہیں دوسری طرف افسانہ نگاری کے فن سے بھی آ گاہ کرتے ہیں منٹو، قاسمی منٹو، قاسمی کو یہ بھی بتاتے ہیں کہ فلموں کے لیے کس قسم کے افسانے لکھنے چاہئے اور انہیں لکھتے ہوئے کون سی باتیں مدِ نظر رکھنی چاہئے۔اس طرح سے منٹو اپنے پہلے ہی خط میں قاسمی کے لیے خضرِ راہ بن جاتے ہیں۔اور یہ سلسلہ گیارہ سال تک جاری رہتا ہے۔

اگر چہ منٹو کی شخصیت ان کے افسانوں، خاکوں اور ڈراموں میں اپنی مختلف صورتوں میں جگمگاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔لیکن خطوط میں ان کی جو شخصیت سامنے آتی ہے وہ بالکل مختلف ہے۔ان پر ہمیشہ افسردگی کی کیفیت طاری رہتی ہے اس کا انداز وہ احمد ندیم قاسمی کے ایک خط میں کرتے ہیں۔

''میری زندگی ایک دیوار ہے جس کا پلستر میں ناخنوں سے کھرچتا رہتا ہوں۔کبھی چاہتا ہوں کہ اس کی تمام اینٹیں پراگندہ

کردوں۔کبھی یہ جی میں آتا ہے کہ اس ملبے کے ڈھیر پر ایک نئی
عمارت کھڑی کردوں۔اسی ادھیڑ بن میں لگا رہتا ہوں۔دماغ
ہروقت کام کرنے کے باعث تپتا رہتا ہے میرا نارمل درجہ حرارت
ایک ڈگری زیادہ ہے۔جس سے آپ میری اندرونی تپش
کا اندازہ لگا سکتے ہیں......اگر کوئی صاحب میرے ساتھ وعدہ
کریں کہ وہ میرے دماغ میں سے سارے خیالات نکال کر
ایک بوتل میں ڈال دیں گے تو منٹو آج مرنے کو تیار ہے۔منٹو،
منٹو کے لیے زندہ نہیں ہے......مگر اس سے کسی کو کیا؟......منٹو
ہے کیا بلا؟......چھوڑیئے اس فضول قصے کو......آیئے کوئی اور
بات کریں۔''

(اسلم پرویز (مرتب) آپ کا سعادت حسن منٹو ۲۰۱۲ء
ص ۵۸،۵۹)

اس طرح منٹو کے خطوط ان کے باطن اور قلب و ذہن کے نہاں خانوں کو آشکار کرتے ہیں۔ان کے خطوط کے آئینے میں جو شخص نظر آتا ہے وہ بے حد نرم دل دردمند دل، دردمند مخلص، بے ریا اور یاروں کا یار ہے۔منٹو اپنے خطوط میں دوستوں سے راز کی ساری باتیں کہہ دیتے تھے۔خاص کر قاسمی صاحب سے کبھی کسی چیز کی پردہ پوشی نہیں کی جو بھی دل میں بات ہوتی تھی فوراً قاسمی کو خط میں لکھ دیتے تھے۔منٹو کا نکاح جب صفّیہ سے ہوتا ہے۔تو قاسمی صاحب کو لکھتے ہیں۔

''میری شادی؟......میری شادی ابھی مکمل طور پر نہیں ہوئی
ہے ''نکا حیا'' گیا ہوں۔میری بیوی لاہور کے ایک کشمیری
خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔اس کا باپ مر چکا ہے میرا باپ بھی

زندہ نہیں۔وہ چشمہ لگاتی ہے، میں بھی چشمہ لگاتا ہوں۔وہ گیارہ
مئی کو پیدا ہوئی، میں بھی گیارہ مئی کو پیدا ہوا تھا، اس کی ماں
چشمہ لگاتی ہے، میری والدہ بھی چشمہ لگاتی ہے۔اس کے نام کا
پہلا حروف ایس ہے، میرے نام کا پہلا حرف بھی ایس ہے۔ہم
میں اتنی چیزیں (Common) ہیں۔ بقایا حالات کے متعلق
کچھ نہیں جانتا۔ پہلے وہ پردہ نہیں کرتی تھی مگر جب سے اُس پر
میرا حق ہوا ہے۔اُس نے پردہ کرنا شروع کر دیا ہے صرف مجھ
سے۔''

(سلیم پرویز (مرتب) آپ کا سعادت حسن منٹو ۲۰۱۲ء
ص،۴۶)

منٹو ماہر نفسیات بھی تھے۔عورت اور اس کی زندگی ان کا محبوب موضوع رہا ہے۔ان کے بہت کم ایسے افسانے ہیں جن میں عورتوں کی نفسیات پر تبصرہ نہ ہو۔اور عورتوں کے باطن کو ٹٹول کر نہ دیکھا ہو۔گویا منٹو نے عورتوں کی فطری نسوانیت کو بڑی میات کے ساتھ بے نقاب کیا۔احمد ندیم کو ایک خط میں عشق و محبت اور عورت کے حسن و جمال کے بارے میں اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''عشق محبت کے متعلق سوچتا ہوں تو صرف شہوانیت ہی نظر
آتی ہے عورت کو شہوانیت سے الگ کر کے میں یہ دیکھتا ہوں کہ
وہ پتھر کی مورتی رہ جاتی ہے۔مگر یہ ٹھیک بات نہیں، میں جانتا ہو
ں ،نہیں میں جاننا چاہتا ہوں، کہ پھر آخر کیا ہے؟......کیا ہونا
چاہیے؟......اگر یہ نہیں تو پھر اور کیا ہوگا۔لیکن میں عورت کے
بارے میں کچھ وثوق سے کہہ بھی تو نہیں سکتا۔ مجھے اُن سے ملنے کا

اتفاق ہی کہاں ہوا ہے۔عورت کا وہ تصور جو ہم لوگ اپنے دماغ
میں قائم کرتے ہیں ٹھیک نہیں ہوسکتا......کس قدر افسوس ناک
چیز ہے کہ عورتوں کے ہمسائے ہوکر بھی ان کے بارے میں ہم کو
ئی رائے قائم نہیں کر سکتے۔لعنت ہے ایسے ملک پر جو عورتوں کو ہم
سے ملنے کے لئے روکنے!......مگر......مگر کیا......؟ کچھ بھی نہیں!
سب بکواس ہے۔''

(سلیم پرویز (مرتب) آپ کا سعادت حسن منٹو ۲۰۱۲ء
ص،۵۵)

بحیثیتِ مجموعی منٹو کے خطوط کا طرزِ بیان ان کی باقی دوسری تحریروں سے الگ ہے ان کے خطوط کی اہمیت وافادیت یہ ہے کہ ان سے منٹو کی شخصیت اور فن کے ایسے پہلو اُبھر کر سامنے آئے ہیں۔جو ان کے خطوط کے سوا اور کہیں نہیں ملتے۔ان کے بے لوث خلوص، حساس اور درد مند باطن کو نمایاں کرتے ہیں۔خطوط سے منٹو کے پختہ تنقیدی شعور اور فلمی کہانیوں کی تکنیک پر کامل عبور کا بھی پتہ چلتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ منٹو کی جسمانی صحت، ذہنی اضطراب اور معاشی حالت کے متعلق بھی جانکاری ملتی ہے۔اس اعتبار سے منٹو کے خطوط میں ان کی دائمی افادیت اور اہمیت کا راز پنہاں ہے۔

پطرس بخاری مزاح نگار کی حیثیت سے اُردو ادب میں مقبول ہوئے۔لیکن ان کے خطوط کا مجموعہ ''پطرس کے خطوط'' کے عنوان سے پہلی بار ۱۹۹۴ء میں اعجاز پبلشنگ ہاوس د، ہلی سے شائع ہوا۔اس میں عبدالمجید سالک، مولانا غلام رسول مہر، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، سید ہاشم رضا، سید امتیاز علی تاج، حکیم یوسف حسن، کلیم الرحمٰن، حامد علی خان اور بیگم فیض احمد فیض وغیرہ کے نام خطوط شامل ہیں۔ان خطوط میں لاہور اور پنجاب یونیورسٹیوں کی سرگرمیوں پر بھی تبصرہ ملتا ہے۔تاریخی اور ادبی اعتبار سے پطرس کے

خطوط کو اہمیت کے حامل ہیں۔

ان کے علاوہ اکبرالہ آبادی، محمد علی ردلوی، محمد علی جوہر، عبدالماجد دریا آبادی، نیاز فتح پوری، غلام رسول مہر، پروفیسر رشید احمد صدیقی، سجاد ظہیر، علی سردار جعفری۔ ظفر علی خان اور حسرت موہانی وغیر کے خطوط کے مجموعے بھی منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ان خطوط میں ادبی دلکشی کے ساتھ تاریخی اور سوانحی مواد بھی موجود ہیں۔

اُردو میں مکتوب نگاری کی روایت، مزاج اور معیار کو بلندی عطا کرنے والے اور بھی ہیں لیکن یہاں وقت کی کمی کی وجہ سے صرف چند اہم مکتوب نگاروں کی مکتوب نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔

دراصل اُردو کے مذکورہ بالا مکتوب نگاروں کے مکتوبات ان کی شخصیت کے ہی نہیں اُن کے عہد کے شعر و ادب کے رجحانات، انفرادی اور اجتماعی زندگی کے سیاسی اور ثقافتی مسائل اور حقائق کے بھی آئینے ہیں۔ ان آئینوں میں ۱۸۵۷ء سے لے ۱۹۴۷ء اور اس کے بعد عصر حاضر تک کے بدلتے ہوئے حالات کی تصویریں رقصاں نظر آتی ہیں۔

برج پریمی کے خطوط۔ایک جائزہ

ڈاکٹر چمن لال بھگت
اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اُردو جموں یونی ورسٹی

خطوط نگاری کی روایت دُنیا کی کم و بیش ہر زبان میں اس زمانے سے ملتی ہے جس دور میں تحریر کا سِلسلہ شروع ہوا۔ خطوط کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ ان کے مطالعے سے اُس زمانے کے سیاسی، ادبی، علمی، تاریخی، ثقافتی، معاشرتی، تہذیبی، ذاتی، اخلاقی، جغرافیائی، عشقی، فلسفی، اجتماعی وغیرہ حالات و وسائل کا بخوبی پتہ چلتا ہے کہ جس زمانے میں لکھے گئے ہوں۔ خطوط کئی قسم کے ہوتے ہیں مثلاً نجی و ذاتی، ادبی و علمی، تاریخی و ثقافتی، تہذیبی و تمدنی، سیاسی و سماجی، سرکاری و غیر سرکاری، تنقیدی و تحقیقی، اخلاقی و مذہبی، اصلاحی و کاروباری وغیرہ وغیرہ۔ اُردو میں بہت سے ایسے اُدباء و شعراء پیدا ہوئے ہیں کہ جنھوں نے نہ صرف اس روایت کو پروان چڑھانے میں اہم رول ادا کیا بل کہ اپنی پہچان بھی منوائی۔ ان شعراء و ادباء میں غالبؔ، محمد حسین آزادؔ، خواجہ الطاف حسین حالیؔ، شبلی نعمانی، سر سیّد احمد خان، ڈپٹی نذیر احمد، عبدالحلیم شررؔ، مہدی افادیؔ، علامہ اقبالؔ، خواجہ حسن نظامیؔ، اکبرالہ آبادیؔ، پریم چند، سیّد سلیمان ندویؔ، سجاد ظہیرؔ، مولانا ابوالکلام آزادؔ، کرشن چندر، سعادت حسن منٹوؔ وغیرہ کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ریاست جموّں و کشمیر میں جن مشاہیرِ ادب نے خطوط نگاری کی روایت کو آگے بڑھانے میں اپنا نام کمایا ان میں برج پریمیؔ کی شخصیت بھی کسی تعارُف کی

محتاج نہیں۔

برج پریمی جن کا اصلی نام برج کرشن ایمہ ہے نے جب شعور کی آنکھ کھولی تو ترقی پسند تحریک زوروں پر تھی۔ چناں چہ وہ بھی اس ملک گیر تحریک سے متاثر ہوئے اور اپنے افسانوں اور تنقیدی و تحقیقی کارناموں سے اپنے معاصرین میں ایک مخصوص جگہ بنانے میں کامیاب ہوئے۔ کشمیریات کے موضوع پر ان کا کام معتبر تصوّر کیا جاتا ہے۔ ان کی شخصیت کا ایک اور پہلوان کی خطوط نگاری ہے۔ وہ اپنی شہرت یافتہ تصنیف ''منٹو کتھا'' (سن ۱۹۹۴ء، ص ۱۱۵) میں خطوط نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

> ''خطوط کو گھر کا آنگن کہا جاتا ہے۔ ان میں انسان کا سارا ظاہر اور باطن، محسوسات و جذبات، خلوص اور ریّا ظاہر ہوتا ہے۔ ان میں ان لمحات کا بھی عکس ملتا ہے جن میں انسان خود کلامی کرتا ہے اور ان لمحات کا بھی جن میں اُس کا ذہن خالی ہوتا ہے۔ خطوط میں اُس کا پیار، اُس کی نفرت، اُس کی بُری اور اچھی خواہشات اور آرزوئیں، اُس کی ذہنیت، اُس کا کرب، اُس کا کھوکھلا پن اور سارا جو ہر سب کچھ آئینہ ہو جاتا ہے۔''

برج پریمی کے احباب و اقارب کا حلقہ کافی وسیع تھا۔ موتی لال ساقی، ویریندر پٹواری، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، محمد منظور احمد، افتخار امام صدیقی، مسعود منظر، احمد وصی، پروفیسر سیف الدین سوز، مظہر امام، پروفیسر آل احمد سرور، احمد ندیم قاسمی، پروفیسر احمد فاروقی، اوپندر ناتھ اشک، ابوسعید قریشی، ڈاکٹر تارا چرن رستوگی، پروفیسر مسعود حسین خان، پروفیسر عنوان چشتی، عصمت چغتائی، پروفیسر عبدالقادر سروری، پریم ناتھ بزاز، ڈاکٹر مغنی تبسم، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر قمر رئیس، کشمیری لال ذاکر، سوم ناتھ سادھو، حبیب کیفوی، مخمور بدخشی، مانک ٹالا، اعجاز صدیقی، اکبر جے پوری، ایم سرودیا،

امریک آنندؔ، بلراج کوملؔ، گوپی چند نارنگؔ، پشکر ناتھؔ، تنویر احمد علویؔ، تیج بہادر بھانؔ، جعفر رضاؔ، حفیظ الرحمٰن احسنؔ، دیوان بریندر ناتھ ظفر پیامیؔ، حامدی کاشمیریؔ، راج نرائن رازؔ، رشید امجدؔ، رنبیرؔ، سلام مچھلی شہریؔ، سروانند کول پریمیؔ، سہیل عظیم آبادیؔ، سیّد محمد عقیلؔ، سیلمان اطہر جاوید، سردار دیوان سنگھ مفتونؔ، شکیل الرحمٰن، صابر آفاقیؔ، صفیہ منٹوؔ، ضیاء عظیم آبادیؔ، ظہیر احمد صدیقیؔ، علی سردار جعفریؔ، علاوالدین مظہرؔ، علی محمد لونؔ، فکر تونسویؔ، قرۃ العین حیدرؔ، قیصر سرمستؔ، کالی داس گپتا رضاؔ، کلام حیدریؔ، گیان چند جینؔ، لطیف کاشمیریؔ، مجروح سلطان پوریؔ، محمد امین ظفرؔ، محمد حسنؔ، مخمور سعدیؔ، محمد طفیلؔ، کوثر چاند پوریؔ، محمد منظور احمدؔ، نصیر انورؔ، نعیم صدیقیؔ، وحید انورؔ، محمد یوسف ٹینگؔ، وزیر آغا اور یوسف سرمستؔ وغیرہ کے ساتھ برج پریمیؔ کا نہ صرف قلمی رابطہ تھا بل کہ گہرے مراسلات بھی تھے۔ علاوہ ازیں سلیمان ادیبؔ، کشور کیلاش پوریؔ، اکمل حیدر آبادیؔ، رام رتن شرماؔ، قمر جلال آبادیؔ، راجندر کرشن وغیرہ کا شمار برج پریمیؔ کے قلمی دوستوں میں ہوتا ہے۔

دورانِ تحقیق راقم الحروف کو برج پریمی کے جو تین سو خطوط (غیر مطبوعہ) ان کے صاحب زادے پریمی رومانیؔ سے دستیاب ہوئے ہیں ان میں ایک سو چودہ (۱۱۴) خطوط ایسے ہیں جو اُنھوں (برج پریمی) نے معروف کشمیری ادیب موتی لال ساقیؔ کے نام ۱۹۵۶ء سے لے کر ۱۹۹۰ء تک تحریر کیے ہیں۔ ۲۰۱۰ء میں پریمی رومانیؔ نے ''مشاہیرِ ادب کے خطوط۔ برج پریمیؔ کے نام'' کے عنوان سے مکاتیب کا جو مجموعہ مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ اس میں ابو سعید قریشیؔ، اکبر جے پوریؔ، پریم ناتھ بزازؔ اور مانک ٹالا کے پانچ پانچ، احمد ندیم قاسمیؔ، امریک آنند، تنویر احمد علویؔ، جگن ناتھ آزادؔ، حفیظ الرحمٰن احسنؔ، سہیل عظیم آبادیؔ، سیّد محمد عقیلؔ، صفیہ منٹوؔ، ضیاء عظیم آبادیؔ، عنوان چشتیؔ، کلام حیدری، مغنی تبسم، اور محمد یوسف ٹینگ کے دو دو، اعجاز صدیقی، ایم سرودیا،

گوپی چند نارنگ، پشکر ناتھ، تیج بہادر بھان، جعفر رضا، خواجہ احمد فاروقی، دیوان بریندر ناتھ ظفر پیامی، حامدی کاشمیری، رنبیر، سلام مچھلی شہری، سروانند کول پریمی، سردار دیوان سنگھ مفتون، ظہیر احمد صدیقی، عصمت چغتائی، علی سردار جعفری، علاوالدین مظہر، علی محمد لون، قرۃ العین حیدر، قیصر سرمست، کالی داس گپتا رضا، گیان چند جین، مجروح سلطان پوری، مخمور سعدی، محمد طفیل، مسعود حسین خان، کوثر چاند پوری، نصیر انور، وزیر آغا اور یوسف سرمست کے ایک ایک، اوپندر ناتھ اشک کے اکتالیس بلراج کومل، فکر تونسوی، محمد حسن اور وحید انور کے چار چار، حبیب کیفوی کے نو، راج نرائن راز، رشید امجد، سلیمان اطہر جاوید، محمد امین ظفر اور نعیم صدیقی کے تین تین، شکیل الرحمٰن، صابر آفاقی، کشمیری لال ذاکر اور محمد منظور احمد کے سات سات، عبدالقادر سروری کے گیارہ، قمر رئیس کے چھ اور لطیف کاشمیری کے دس خطوط شامل ہیں ۔۲۱۲ مکاتیب پر مشتمل مجموعے ''مشاہیرِ ادب کے خطوط ۔ برج پریمی کے نام'' کے بارے میں پریمی رومانی (ص ۷) یوں لکھتے ہیں:۔

> ''یہ اُن مکاتیب کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً برصغیر ہندو پاک کے معروف ادیبوں اور دانشوروں نے میرے والد مرحوم کے استفسارات کے جواب میں تحریر کئے ہیں ۔ ان میں سے بعض خطوط ان کے دوستوں اور چاہنے والوں کے ہیں، جن میں کوئی نہ کوئی علمی وادبی بحث چھیڑی گئی ہے ۔ مکاتیبی ادب کی اپنی ایک خاص اہمیت ہے ۔ یہ مختلف اداروں کے سیاسی، سماجی، ادبی، ثقافتی یا نجی زندگی کے آئینہ دار ہوتے ہیں ۔''

برج پریمی بچپن سے جن گھریلوں پریشانیوں اور مالی مشکلات میں مُبتلا رہے ہیں ان کا بخوبی اندازہ اُن کے ان خطوط سے لگایا جاسکتا ہے جو اُنھوں نے وقتاً فوقتاً اپنے

قریبی دوستوں کو تحریر کیے ہیں۔ ۲۹ نومبر ۱۹۵۷ء کو لکھے گئے ایک خط میں اپنے عزیز دوست موتی لال ساقؔی کو یوں لکھتے ہیں:۔

''مالی پریشانیاں کافی بڑھ گئی ہیں۔ فارم اور فیس بھرنے کی آخری تاریخ بھی جارہی ہے دیکھتا ہوں کیا ہوگا، جواہر کا ایک خط آ گیا تھا لیکن اُس نے پیسوں کا ذکر نہیں کیا تھا۔ میں خود مانگ بھی نہیں سکتا۔ حالات بڑے عجیب ہیں، اسکول کا کوئی چالیس روپے قرضہ ہے جس کے لیے ساٹھ روپے ایک آدمی سے مانگ لئے ہیں، کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ کتابوں کے لیے پیسے نہیں، اپنے اور بچّوں کے لیے گرم کپڑے نہیں، یہ مشکلات اور دقتیں میں ازل سے لے کر آیا ہوں، عمر بھر تڑپتا رہوں گا اور یہی حسرت لے کر اس دنیا سے چل بسوں گا اور میری چِتا کے ایک طرف لکھا جائے گا،''یہاں آرزوؤں اور کلپناؤں کا مزار ہے''۔''

برج پریمؔی چوں کہ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔ اس لئے ان کے بعض خطوط میں افسانویت کا یہ پہلو شباب پر ہے۔ ۲۷ اپریل ۱۹۵۷ء کو موتی لال ساقؔی کے نام ایک خط کا آغاز یوں کرتے ہیں:۔

''آج کی رات کتنی دردناک ہے! فضا سسکیاں لے رہی تھی۔ اندھیارے لپک لپک کر چیخ رہے تھے، ہواؤں کی ساری ہمت ٹوٹ چکی تھی، میں بڑبڑا کر جاگ پڑا، میرے سرہانے رکھی برٹش ہسٹری منہ بسورے سو گئی تھی، باہر بھیانک اندھیارا تھا۔۔۔۔۔بجلی کے لیمپ کی روشنی بجھنے لگی اور پھر کیا ہوا پھر؟ میرا دِل بیٹھ گیا۔۔۔۔اور میری گلی کے نکڑ پر لگے ہوئے کھمبے

پروہ روتا ہوا لیمپ یک لخت ٹوٹ گیا۔''

اپنے تحقیقی اور تنقیدی سفر کے دوران برج پریمی نے مُلک اور بیرونی ممالک کے نامور ادباء اور شعراء کو جو خطوط لکھے ہیں ان کے مطالعے سے اس بات کا بخوبی علم ہو جاتا ہے کہ وہ کسی مضمون کو لکھنے سے پہلے کس قدر چھان بین اور دوڑ دھوپ کر کے معلومات حاصِل کرتے۔ ۲۹ جون ۱۹۷۰ء کو پروفیسر عبدالقادر سروری کو ایک خط میں یوں رقمطراز ہیں:۔

''کل حاضر نہیں ہو سکا۔ کرشن چندر صاحب کے ہاں چلا گیا تھا۔ تین طویل ملاقاتیں ہوئیں، بڑی تفصیل سے باتیں پوچھ لیں اور اُنھوں نے ہر سوال کا جواب بڑے خلوص اور بڑی محبت سے دیا۔ آپ کے پاس حاضر ہو کر اس کی رپورٹ پیش کروں گا۔''

ستمبر ۱۹۸۸ء میں بھاری بارشوں کی وجہ سے دریائے توی میں اس قدر سیلاب آ گیا کہ پانی حصار کو توڑتا ہوا شہر میں داخل ہو گیا۔ جمّوں یونی ورسٹی کا اولڈ کیمپس بھی طوفان کی زد میں آیا جس کی وجہ سے شعبۂ اُردو میں کتابوں کا ایک بڑا اور قیمتی سرمایہ سیلاب کی نذر ہو گیا۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۸۸ء کو ایک خط میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو یوں لکھتے ہیں:۔

''محترم آزاد صاحب! تسلیم!

ابھی ابھی معلوم ہوا کہ جمّوں یونیورسٹی کا اولڈ کیمپس زیرِ آب ہے اور اس کی لپیٹ میں آپ کا کمرہ بھی آ گیا ہے۔ جو نہ صرف نوادارات کا خزانہ ہے بلکہ جس میں آپ کی محنت، آپ کی تپسیا اور آپ کی گراں قدر علمی سرگرمیوں کا نچوڑ موجود ہے۔ خُدا کرے یہ خبر جھوٹ ہو کہ اس ذخیرے کو زبردست نقصان پہنچا

ہے۔۔۔۔۔۔۔یہاں دوررہ کرآپ کے لیے کیا کرسکتا ہوں۔
صرف خُدا سے دُعا مانگ سکتا ہوں کہ یہ خبر سچ نہ ہو۔
خلوص کیش

برج پریمی‘‘

مختصراً برج پریمؔی کے خطوط ریاست جموّں وکشمیر کے مکاتیبی ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں جن میں ادبیت کے علاوہ سنجیدگی اور وقعت نظر بھی پائی جاتی ہے،سادگی، بے تکلفی اور لطافت برج پریمؔی کے خطوط کی نمایاں خصوصیات ہیں۔تمام خطوط مخلصانہ اور والہانہ انداز میں لکھے گئے ہیں۔ان خطوط میں نہ صرف برج پریمؔی کی شخصیت کی مکمل جھلکیاں خود بخود سامنے آتی ہیں بلکہ اُس دور کے سیاسی وسماجی، علمی وادبی،تہذیبی و معاشرتی،اخلاقی وتاریخی حالات ومسائل کی بھرپور عکاسی بھی ہوتی ہے۔برج پریمؔی کے قلم میں پختگی ہے جس کی وجہ سے ان کے خطوط میں دلکشی اور خوبصورتی کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔وقت کا تقاضہ ہے کہ ’’برج پریمؔی کے خطوط مشاہیر ادب کے نام‘‘ کو شائع کر کے منظرِ عام پر لایا جائے تاکہ فاضل مکتوب نگار کی مکمل تصویر کے ساتھ ساتھ بعض اہم اور فکرانگیز علمی وادبی نکات ابھر کر بھی سامنے آئیں۔

بیگم حسرت موہانی کے خطوط اور جدوجہد آزادی

ڈاکٹر عبدالرشید منہاس
شعبۂ اردو جموں یونی ورسٹی

میرٹھ سے انگریزوں کے خلاف شروع ہونے والی ۱۸۵۷ء کی بغاوت نے تاریخ میں ایک ایسے المیے کو پیش کیا ہے جس کی کسی ایک مذہب یا قوم نے پاسداری نہیں کی بلکہ ہندو اور مسلمان قوم کے ساتھ دیگر اقوام ہند نے بھی اپنا فریضہ ادا کیا۔اس جد وجہد آزادی میں مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین نے بھی اہم رول ادا کیا یہ ایسی خواتین تھیں جنھوں نے اپنا سب کچھ نچھاور کر کے ملک وقوم کے اندر ایک تاریخ رقم کر دی۔اگر چہ ہندوستانی قوم کے اندر انگریزوں کو ملک سے نکال باہر کرنے کی آرزو موجود تھی۔اسی آرزو نے اس جنگ کے لیے ہندوستانی قوم کے اندر ایک جذبہ ابھارا جس کو انگریز اقوام کے خلاف بغاوت یا Revolt of 1857یا Mutiny اور Sepoy Revolt کا نام دیا جاتا ہے۔اس سے پہلے جتنی بھی مزاحمتیں Resistances ہوئیں اُن میں ایسا نہیں ہوا کہ دہلی تباہ و برباد ہوئی ہو جبکہ یہ تمام مزاحمتیں علاقائی نوعیت کی تھیں جو دوسرے ہندوستانیوں کے اندر انگریز قوم کے خلاف آگ نہیں بھڑکا سکیں۔دہلی کی حیثیت ایسی تھی کہ یہاں کا مغل بادشاہ صرف نام کا بادشاہ تھا جبکہ حکومت کی بھاگ ڈور اب انگریز حکمرانوں کے قبضے میں آچکی تھی اور دہلی کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔اس جدوجہد آزادی میں کئی خواتین نے بھی حصہ لیا جن میں

بیگم حضرت محل، اصغری بیگم، بھگوتی دیو تیا گی، رانی لکشمی بائی، حبیبہ خاتون ، رحیمی، راجکور، شوبھا دیوی، امدہ بیگم، بیگم حسرت موہانی، کملا نہرو اور زلیخا بیگم وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔اس تاریخی حقیقت کا آج شاید کم ہی لوگوں کو علم ہوگا کہ انیسویں اور بیسویں صدی میں جو ہندوستانی خواتین جدوجہد آزادی کے میدان میں اُتریں اُن میں ایک نام سیدہ نشاط النساء عرف بیگم حسرت موہانی کا نام اہم ہے۔بیگم حسرت موہانی نے جس طرح جدوجہد آزادی میں شامل ہوکر قوم وملک کو ایک نئی سوچ وفکر سے آگاہ کیا اس کا اندازہ ہمیں ان کے خطوط سے بخوبی ملتا ہے۔جدوجہد آزادی کے اس میدان میں وہ بی اما (والدہ علی برادران) اور بلبل ہند مسز سروجنی نائڈو کی پیش رو تھیں۔بیگم حسرت موہانی کی سیاسی زندگی کا آغاز ۱۹۰۸ء میں اس وقت شروع ہوا جب حسرت موہانی کو پہلی بار بغاوت کے الزام میں قید کیا گیا۔اس موقع پر جس طرح بیگم حسرت موہانی نے یکہ وتنہا ہونے کے باوجود حسرت موہانی کی ہمت افزائی کی اور حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی حسرت موہانی کو تلقین کی ایسی خواتین سماج کے اندر دیکھنے کو بہت کم ملتی ہیں۔بیگم حسرت موہانی ایک ایسی خاتون تھیں جنھوں نے ملک کی قومی وسیاسی زندگی میں بھر پور حصہ لیا اور اپنے خطوط کے ذریعے ہندوستانی عوام کے اندر مکمل آزادی کا جذبہ پیدا کیا۔

بیگم حسرت موہانی کے خطوط اگر چہ تعداد میں کم ہیں اس کے باوجود قدر وقیمت کے لحاظ سے اہمیت کے حامل ہیں۔ان خطوط کی سب سے اہم اور قابل قدر اہمیت اس لیے ہے کہ بیگم حسرت موہانی نے حسرت موہانی کی زندگی میں رونما ہونے والے حالات وواقعات اور اس عہد کی سیاسی تاریخ کو آئینہ کی طرح ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔اس دور کے حالات نے جس طرح کے پیچ وخم پیدا کیے اس کا اندازہ ہمیں ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے پہلے اور بعد کے ناسازگار حالات سے ملتا ہے۔

بیگم حسرت موہانی کے خطوط کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے جن میں پہلے دو حصوں کے خطوط حسرت موہانی کی دوسری اور تیسری اسیری کے دوران لکھے گئے۔ ان خطوط کا تعلق زیادہ تر حسرت موہانی کے مقدمات سے ہے۔ یہ وہ خطوط ہیں جو چند اخبارات سے اخذ کیے گئے ہیں جو مولانا عبدالباری فرنگی کے نام لکھے گئے تھے۔ مولانا عبدالباری فرنگی حسرت موہانی اور بیگم حسرت موہانی (سیدہ نشاط النساء) کے مرشد اور روحانی وسیاسی پیشوا بھی تھے۔ بیگم حسرت موہانی جب بھی مولانا عبدالباری کو خط لکھتیں تو انہیں اس بات کا احساس ضرور رہتا تھا کہ مولانا کی طرف سے انہیں روحانی تسکین اور صبر کی تلقین کا نسخہ ضرور ملے گا۔ بیگم حسرت موہانی کے بعض خطوط سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ حسرت موہانی کی دوسری اسیری کے دوران ان کی مراسلت مولانا ابوالکلام آزاد اور علی برادرن سے بھی تھی جو دیگر مجاہدین آزادئ ہند کی طرح جیلوں میں بند تھے۔ تیسرے حصے کے خطوط بیگم حسرت موہانی کی زندگی کے آخری دور کے خطوط ہیں جو انھوں نے اپنی بیٹی نعیمہ کو آخری سفر حج ۱۹۳۶ء میں لکھے تھے۔ اس حصے میں پہلا خط کراچی سے لکھا گیا تھا چار خط بغداد سے لکھے گئے اور آخری خط مکہ معظّمہ پہنچنے کے بعد تحریر کیا گیا لیکن علالت کے باعث یہ خط مکمل نہ ہو سکا اور سفر حج کی واپسی کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی وفات کے بعد حسرت موہانی نے ان خطوط کو مکمل کر کے اپنے سفر نامہ ''عراق و حجاز'' میں شامل کر کے اشاعت کے لیے بھیجا۔

بیگم حسرت موہانی، حسرت کی صرف شریک حیات ہی نہیں تھیں بلکہ شریک ادب، شریک سیاست اور شریک زندگی بھی تھیں اس کے علاوہ حسرت موہانی کا ساتھ دینے کے لیے وہ ہر اُس تحریک سے دلچسپی رکھتی تھیں جس سے حسرت کو دلچسپی تھی۔ بیگم حسرت موہانی ان کی حوصلہ افزائی کرتیں اور آزادئ ہند کے لیے اپنے خیالات کا اظہار بھی کرتیں۔ پہلی بار جب حسرت موہانی ۱۹۰۸ء میں گرفتار ہوئے اس گرفتاری

کے بعد بیگم حسرت موہانی جس طرح کے حالات سے دوچار ہوئیں اور جن مشکلات کا انھوں نے سامنا کیا اس کے باوجود حسرت موہانی کی ہمت افزائی کرتی رہیں۔اس گرفتاری کے دوسرے دن بیگم حسرت موہانی، حسرت کو ایک خط میں یوں لکھتی ہیں:

> ''تم پر جو افتاد پڑی ہے اسے مردانہ وار برداشت کرو، میرا یا گھر کا مطلق خیال نہ کرنا، خبردار! تم سے کسی قسم کی کمزوری کا اظہار نہ ہو۔'' [۱]

بیگم حسرت موہانی ایک منفرد سوچ وفکر کی حامل خاتون تھیں وہ حسرت کے ہر فیصلے کو ایمان ویقین کے ساتھ قبول کرلیتی تھیں چاہے وہ فیصلہ مثبت ثابت ہو یا منفی۔اس فیصلے کے نتائج چاہے ان دونوں کے لیے کتنے ہی تکلیف دہ کیوں نہ ثابت ہوں، ہنسی خوشی وہ دونوں اس راہ پر چل پڑتے تھے اور کبھی بھی اپنے مفاد کے لیے قوم وملک کا سودا نہ کرتے۔حسرت موہانی ۱۹۱۶ء میں جب دوسری بار نظر بند کیے گئے تو حسرت نے انگریزوں کے اس فیصلے کو غیر اخلاقی اور غیر مذہبی قرار دیا جبکہ مولانا ابوالکلام آزاد کو ان کی اس رائے سے اتفاق نہیں تھا۔اس کے باوجود وہ اپنی رائے پر اٹل رہے۔ ان کی اس قید سے بیگم حسرت موہانی کو کافی پریشانیاں لاحق ہوئیں اس بات کا اندازہ ان کے خطوط سے لگایا جاسکتا ہے۔ایک خط میں بیگم حسرت موہانی، حسرت کے اس رویے کے متعلق لکھتی ہیں:

> ''حسرت نے جو طرز عمل اختیار کیا ہے اس میں ضد اور خود رائی کو مطلق دخل نہیں ہے میں نے اُن کی اس رائے کو بے حد اطمینان اور خوشی کے ساتھ دیکھا ہے ایسی نظر بندی سے قید بہر حال بہتر ہے۔حسرت نے خوب کیا۔مجھے ان سے یہی اُمید تھی۔'' [۲]

اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بیگم حسرت موہانی نے کس طرح مولانا حسرت موہانی کی زندگی کے ہر رنگ کو اپنا لیا تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ وہ ان کے رنگ میں رنگ چکی تھیں۔ بیگم حسرت موہانی کے اس کردار نے حسرت کو ان کا اس قدر گرویدہ بنا دیا تھا کہ وہ بیگم کی رائے کا صرف احترام ہی نہیں کرتے بلکہ اپنے سے بدرجہ بہتر تسلیم بھی کرتے تھے اور ان کی ہر بات کو خندہ پیشانی سے برداشت بھی کرتے۔ حسرت موہانی قید و بند کے دوران کے ایک واقع سے متعلق بیان کرتے ہیں:

> ''بیوی سے مجھ کو بہت محبت تھی بلکہ کسی قدر ان سے ڈرتے تھے بیوی کو بھی مولانا سے بہت محبت تھی اور جب جب مولانا قید میں رہے انھوں نے وطن چھوڑ کر وہیں جیل سے قریب قیام کیا تا کہ کھانے پینے کے سلسلے میں حسرت کو کوئی تکلیف نہ اٹھانا پڑے اور ملاقات بھی جلد ہو سکے۔'' ۳؎

شادی کے بعد بیگم حسرت (سیدہ نشاط النساء) کو علی گڑھ آئے ہوئے ابھی پانچ سال بھی نہ ہوئے تھے کہ حسرت موہانی کو قید و بند کی صعبتوں سے دوچار ہونا پڑا جس کے بعد بیگم حسرت موہانی کو کڑی آزمائشوں سے گذرنا پڑا کیوں کہ علی گڑھ میں بیگم حسرت موہانی یک و تنہا تھیں اگر چہ کالج میں اور کالج سے باہر حسرت کے دوستوں اور ہمدردوں کی کمی نہ تھی لیکن حکومت وقت کے غضب ناک تیور کی وجہ سے سب نے ساتھ چھوڑنا شروع کر دیا تھا لیکن بیگم حسرت موہانی اس امتحان میں بھی پوری اُتریں۔ اس پانچ سال کے ساتھ نے بیگم حسرت موہانی کو پوری طرح حسرت کے رنگ میں رنگ لیا تھا جس کی وجہ سے وہ ان حالات کا پوری طرح مقابلہ کر سکتی تھیں۔ اس قید و بند کے دوران حسرت موہانی کی زندگی جن حالات سے دوچار ہوئی اس کا ذکر ''مشاہدات زنداں'' میں موجود ہے لیکن بیگم حسرت موہانی کو کس طرح کی

پریشانیاں لاحق ہوئیں اس کا اندازہ لگانا ذرا مشکل ہے اور نہ ہی کسی ماخذ سے اس کا اجمالی جائزہ ملتا ہے۔

جب حسرت موہانی دوسری بار ۱۳/ اپریل ۱۹۱۶ء کو گرفتار ہوئے تو اُس وقت بھی بیگم حسرت موہانی ان حالات سے کافی دوچار ہوئیں۔ اسی دوران بیگم حسرت موہانی کی سیاسی زندگی کا آغاز بھی ہوا جس میں انھوں نے اپنی سوچ وفکر کو ایک منفرد انداز اور ایک نئے لہجے کے ساتھ پیش کیا۔ ان حالات میں خاموش تماشائی بننے کے بجائے گھر کی چاردیواری سے نکل کر حسرت موہانی کے مقدمے کی پیروی اپنے ذمے لی اور یہ کام انتہائی نامساعد حالات میں بڑی دلیری وہمت کے ساتھ انجام دیا۔ یقیناً یہ کام ایک دلیر اور بہادر خاتون کا ہی ہوسکتا تھا جو اپنا سب کچھ نچھاور کر کے ملک وقوم کی خاطر میدان جنگ میں کود پڑے۔ بیگم حسرت موہانی نے کبھی بھی اس بات کی طرف خیال نہیں کیا کہ اپنی گھریلو زندگی کے ساتھ ساتھ سماجی اور معاشرتی زندگی کو بہتر بنایا جائے۔ اُن کا ایک ہی رویہ تھا کہ کسی طرح اس ملک کو ایک نئی صبح کی جھلک مل سکے چاہے اس کے لیے انہیں اپنی اور اپنے پورے گھر کی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔ آج جھانسی کی رانی کو تو یاد کیا جاتا ہے لیکن بیگم حسرت موہانی، زلیخا بیگم اور کملا نہرو جیسی ہزاروں خواتین مجاہد آزادی کو یاد کوئی نہیں کرتا آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

بیگم حسرت موہانی کی علمیت، اہلیت اور صلاحیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک دلچسپ پہلو جو ہمارے سامنے آتا ہے وہ ان کی قابلیت اور ہمت کا ہے۔ حسرت کے مقدمے کے دوران اور اسیری کے بعد جس طرح انھوں نے پبلک ریلیشن آفیسر کی خدمات انجام دے کر حسرت موہانی کے مقدمے کی پیروی کی اور ساتھ ہی اخبارات کے ذریعے حسرت موہانی کے بارے میں عوام کو باخبر کیا اس کا اندازہ اگر لگانا ہو تو اُس دور کے اخبارات کا مطالعہ کیا جائے جن میں روزنامہ مدینہ، ہندوستانی، مشرق، نئی

روشنی اور وکیل جیسے اخبار قابل ذکر ہیں۔

بیگم حسرت موہانی ایک عورت ہونے کے باوجود جس ہمت و استقلال سے مردانہ وار کام کرتی تھیں اس سے ان کی جرأت وہمت کا پتہ چلتا ہے۔جن صبر آزما حالات میں یہ کام بیگم حسرت موہانی نے انجام دیے اگران کو سامنے رکھا جائے تو ان کے کاموں کی قدر و قیمت اور بڑھ جاتی ہے۔مولانا ابوالکلام آزاد جب ''ڈفنس آف انڈیا'' کے تحت رانچی میں نظر بند تھے اُس وقت کے ایک خط میں بیگم حسرت موہانی لکھتے ہیں:

> ''اخبارات میں صوبجات متحدہ کی گورنمنٹ کا کمیو نِک نظر سے گذرااور آپ کا خط بھی جو سنٹرل بیورو نے شائع کیا ہے حق یہ ہے کہ مولوی حسرت نے اور آپ نے ثابت کر دیا ہے کہ کامل انسانوں سے مسلمانوں کی بستیاں ابھی بالکل خالی نہیں ہوئی ہیں۔جب میں آپ کے عزم واستقلال اوراس کے ساتھ تنہائی وکسمپرسی کو سوچتا ہوں تو کہہ نہیں سکتا کہ قلب کا کیا حال ہوتا ہے۔ یہ اللہ ہی کی مدد ہے جس نے آپ کو ان مصائب وشدائد میں بھی وہ درجہ عزم بخشا ہے جو کسی ایک مرد کو بھی آج نصیب نہیں۔'' [۴]

حسرت موہانی کے مقدمے کی پیروی کے سلسلے میں بیگم حسرت موہانی کو بڑے شکن پرور اور فرسودہ حالات کا سامنا کرنا پڑا۔جن دوستوں اور رشتہ داروں نے پہلے وعدہ کیا تھا کہ ہم آپ کا پورا ساتھ دیں گے وہ لوگ بیچ بھنور میں ہی چھوڑ کر بھاگ گئے۔ان میں سے کچھ نے تو مقدمے کے اخراجات کی رقم اتنی زیادہ بتادی جس کے بارے میں سوچنا بھی گوارا نہ تھا اور کچھ نے تو مقدمہ لینے سے ہی انکار کر دیا۔ان حالات میں اگر کسی نے ساتھ دیا تو وہ مولانا ابوالکلام آزاد تھے بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ

حسرت موہانی کی قید کے بعد اگر کسی نے بیگم حسرت موہانی کی گھریلو زندگی کا خیال رکھا تو وہ مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔مولانا ابولکلام آزاد ایک خط میں بیگم حسرت موہانی کو لکھتے ہیں:

''آپ کی مالی حالت آج کل کیسی ہے ؟مصارف واخراجات کا کیا انتظام ہے؟مکان قائم ہے یا نہیں؟اور قائم ہے تو کیوں کر اس کا نتظام ہوا ہے؟امید ہے کہ ان امور کو تفصیل سے لکھیں گی۔'' ۵

خط کی اس عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ بیگم حسرت موہانی نے ابوالکلام آزاد کے ان سوالوں کا جواب ضرور دیا ہوگا اور اپنے خیالات سے بھی ضرور آگاہ کیا ہوگا۔مولانا عبدالباری کو اپنے ایک خط میں مولانا ابوالکلام آزاد کی طرف سے کی جانے والی امداد کے متعلق لکھتی ہیں:

''میں نے ابوالکلام آزاد کو ایک تار دیا تھا انھوں نے کلکتہ سے ایک بیرسٹر کو سو روپے اور فیس وغیرہ دے کر جھانسی بھیج دیا ہے۔'' ٦

بیگم حسرت موہانی کا ایک خط جس میں انھوں نے حسرت کی دوران قید کی زندگی اور کرب و بےبسی کا اظہار کیا ہے خط میں لکھتی ہیں:

''کوئی وکیل یا بیرسٹر جھانسی جانے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔یہ کیسی مجبوری اور افسوس کا مقام ہے۔'' ٧

بیگم حسرت موہانی کی زندگی کا یہ وہی دور ہے جب انھوں نے پردہ ترک کر کے چہرہ کھول کر نہایت سادہ اور پردہ پوش لباس میں باہر آئیں اور کسی کی پروا کیے بغیر اپنے فرائض انجام دینے لگیں۔ان کے خطوط کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کی ہمت اور حوصلہ

کی داد دینی پڑتی ہے کہ یہ جرأت مندانہ قدم انھوں نے اُس وقت اٹھایا جب نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہندوؤں میں بھی پردے کی رسم قائم تھی۔ پردہ کے علاوہ انھوں نے اپنے جملہ سامان آرائش وزیبائش کو بھی ترک کر دیا تھا۔ان کے ہاتھوں میں نہ کوئی زیور دیکھا گیا اور نہ ہی کوئی چوڑی بلکہ ایک ایسی عورت کے روپ میں سامنے آئیں جنھوں نے ملک وقوم کی آزادی کے لیے اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا۔

حسرت موہانی کی قید کے دوران بیگم نشاط النساء کا قیام زیادہ تر علی گڑھ میں رہا جہاں دیگر دشواریوں کے علاوہ مالی مشکلات کا بھی انہیں سامنا کرنا پڑا۔اس کے باوجود بیگم حسرت موہانی نے کبھی بھی کسی کے آگے دست راہ پر اکتفانہ کیا۔علی گڑھ میں بیگم حسرت موہانی اپنی بوڑھی ماں اور بچی نعیمہ کے ساتھ ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں رہتی تھیں جس کی دیواروں سے بھی حسرت ٹپک رہی تھی۔اگر کسی کی طرف سے کوئی امداد پیش کی جاتی تو وہ کہتیں کہ اگر لوگوں کو ہماری مدد کرنی ہے تو وہ حسرت کی کتابیں خریدیں۔لیکن کسی سے مدد وصول کرنا ان کی فطرت میں شامل نہ تھا ان کے اسی عزم واستغنا اور استقلال نے انہیں عوام وخواص میں توجہ کا مرکز بنا دیا تھا۔مولانا محمد علی جوہر نے ایک خط میں بیگم حسرت موہانی کو لکھا:

> ''بھائی حسرت سے کہہ دیجے کہ برادرم! باوجود عزم واستقلال کے تمہارا مرتبہ ایک نحیف الجبثہ عورت سے کم ہی رہے گا جس کے سینے میں تم سے بھی بڑا دل موجود ہے اور جس نے تمھاری غیر حاضری میں مسلمانوں کو ہمت واستقلال کا وہ سبق دیا جو تم آزاد ہو کر بھی نہ دے سکے اور جو شاید قید ہو کر بھی نہ دیا۔'' ۸

مولانا محمد علی جوہر کے علاوہ ان کی والدہ بی اما کے دل میں بھی بیگم حسرت موہانی

کے لیے جو قدر و منزلت تھی اس کا اندازہ بھی ان کے خطوط سے لگایا جا سکتا ہے۔ان خطوط کا ذکر ''شوکت علی اینڈ محمد علی'' نام کی چھوٹی سی انگریزی کتاب میں ملتا ہے۔یہ کتاب ان خطوط پر مشتمل ہے جو بی اما (آبادی بانو بیگم) نے علی برادران کی قید کے دوران حکومت کو لکھے ۔بیگم حسرت موہانی نے کئی بار خواتین کے کل ہند وفد میں شمولیت کی اور ملک کی آزادی کے لیے حسرت اور اپنے خیالات سے لوگوں کو آگاہ کیا۔اس کے علاوہ بیگم حسرت موہانی نے کئی اجلاس میں حصہ بھی لیا تھا۔جن میں ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۰ء میں ہونے والے اجلاس کے علاوہ کانگریس اجلاس ،خلافت تحریک اور مسلم لیگ کی طرف سے منعقد ہونے والے اجلاس شامل تھے۔دسمبر ۱۹۲۱ء میں احمد آباد میں ہونے والے اجلاس میں بھی شرکت کی ۔اس اجلاس میں حسرت موہانی نے مکمل آزادی کی بات کی جس کی وجہ سے ان کی چرچا ہر طرف ہونے لگی لیکن کسی وجہ سے یہ قرارداد منظور نہ ہو سکی۔احمد آباد میں جو اجلاس ہوا اس میں حسرت کے علاوہ بیگم حسرت موہانی اور ان کی صاحبزادی نعیمہ بھی شامل تھیں۔دسمبر ۱۹۲۲ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس بہار میں ہوا جس میں بیگم حسرت موہانی نے بھی شرکت کی کیوں کہ حسرت اس وقت جیل میں تھے۔اس اجلاس میں بیگم حسرت موہانی نے حسرت موہانی کی جگہ نیابت کے فرائض انجام دیئے۔جس میں بیگم حسرت موہانی نے مکمل آزادی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا وہ ایک خط میں لکھتی ہیں:

> ''مکمل آزادی کے جو لوگ علم بردار ہیں وہ اس پروگرام کو ترک کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے البتہ جزوی آزادی پر جو لوگ قناعت کرنا پسند کرتے ہیں وہ کونسلوں میں جا کر آئینی اصلاحات کی قسطیں وصول کر سکتے ہیں۔آخر میں انھوں نے کہا کہ احمد آباد میں کانگریس کے موقع پر حسرت کی پیش کردہ مکمل

آزادی کی قرارداد کی مخالفت کرنے کی جو غلطی گاندھی جی نے کی
تھی آج داخلہ کونسلوں کے حامیوں کا زور اس کے ردِعمل کا نتیجہ
ہے۔" 9

بیگم حسرت موہانی کے ان خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے جد وجہد آزادی ہند میں اپنے شوہر کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر ساتھ دیا۔ ان کے ذکر کے بغیر مولانا حسرت موہانی کا ذکر نامکمل ہے۔ وہ اکثر مولانا حسرت موہانی کے ساتھ مل کر سیاسی جلسوں میں شریک ہوتیں اور اپنے خیالات سے قوم کو آگاہ کرتی رہتیں۔ بیگم حسرت اور حسرت موہانی کا ساتھ لگ بھگ اڑتیس برس تک رہا جس میں بیگم حسرت نے نہ صرف سیاسی بلکہ علمی و قلمی میدان میں بھی ان کا ساتھ دیا۔ بیگم حسرت موہانی کے اندر آزادی کا جذبہ اس قدر تھا کہ انگیریزی سامان کو استعمال کرنے کے بجائے ہمیشہ اپنے ہاتھ سے بنے ہوئے سوت کے کپڑے پہنتی رہیں۔ مولانا حسرت موہانی کو جب بھی جیل ہوئی تو بیگم حسرت ان کی عدم موجودگی میں رسالے، کتابیں، پریس اور سٹور کا کام خود انجام دیتیں رہیں۔ کئی بار ان کے گھر کے حالات اس حد تک بدتر ہوئے کہ اجرت پر لوگوں کے کپڑے سی کر اور کاغذ کے لفافے بنا کر روزی کمائی اور گھر کے اخراجات کو پورا کیا لیکن کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا۔ کوئی ان کی مدد بھی کرنا چاہتا تو وہ انکار کر دیتیں تھیں۔ وہ اکثر کہا کرتی تھیں کہ اگر کوئی مدد کرنا ہی چاہتا ہے تو حسرت موہانی کی کتابیں خریدیں جس سے میری مدد ہو جائے گی۔ ۱۹۲۵ء سے ان کی صحت خراب رہنے لگی تھی۔ ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۶ء کے درمیانی عرصے میں انھوں نے حج کے سفر کیے۔ آخری سفرِ حج کے بعد ان کی ریڑھ کی ہڈی میں درد ہوا جو کینسر کی شکل اختیار کر گیا اور ۱۸/ اپریل ۱۹۳۷ء کو انھوں نے وفات پائی۔

بیگم حسرت موہانی نے جد وجہد آزادی میں اپنے شوہر کے شانہ بشانہ تحریک

آزادی میں حصہ لیا اور اخلاقی جرأت اور وطن سے محبت کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا۔ ہر سال ۱۸/ اپریل کو ان کی برسی منائی جاتی ہے جس میں بیگم حسرت موہانی کی خدمات اور قربانیوں سے واقف کروایا جاتا ہے۔ اگر ہندوستان کی مجاہد خواتین کی تاریخ لکھی جائے گی تو بیگم حسرت موہانی کے ذکر کے بغیر یہ تاریخ نامکمل رہے گی لیکن میرے خیال میں آج کے ان حالات میں بیگم حسرت موہانی جیسی بہادر اور جان باز مسلم خاتون کا نام لینا تو درکنار ذکر چھیڑنا بھی جرم سمجھا جاتا ہے آخر ان وجوہات کی ایسی کون سی وجہ ہے کہ جدوجہد آزادیٔ ہند میں مسلم طبقہ کا نام تاریخ ہند میں بہت کم دیکھنے کو مل رہا ہے۔ بیگم حسرت موہانی جیسی کئی ایسی خواتین ہیں جنھوں نے جنگ آزادی میں شامل ہوکر اپنا سب کچھ ملک پر نچھاور کر دیا اس کے باوجود ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا اور اب بھی تاریخ داں سے یہ خواتین انصاف کا تقاضا کر رہی ہیں اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا یہ تاریخ داں ان کی قربانیوں کو تاریخ میں پیش کرتے ہیں یا پھر تاریخ ہی مسخ ہو جائے گی۔

☆☆☆

حواشی:

۱۔ حسرت موہانی۔مشاہدات زنداں۔اردوئے معلیٰ ص۱۱
۲۔ بحوالہ جلیل قدوائی مولانا حسرت موہانی ص ۷۴
۳۔ رابعہ بیگم حسرت کی خانگی زندگی ص ۹۸
۴۔ مکتوب ابوالکلام آزاد نقوش لاہور مکاتیب نمبر ص۹۷۰
۵۔ مکتوب ابوالکلام آزاد نقوش لاہور مکاتیب نمبر ص۹۷۰
۶۔ مکتوب ابوالکلام آزاد نقوش لاہور مکاتیب نمبر ص۷۹
۷۔ مکتوب ابوالکلام آزاد نقوش لاہور مکاتیب نمبر ص۷۵
۸۔ بحوالہ احمر لاری متذکرہ ص۱۴۶
۹۔ انڈین ریںول رجسٹر جلد اول ص۸۷۲

خطوط نگاری: ایک تعارف

ڈاکٹر فرحت شمیم
شعبۂ اردو جموں یونی ورسٹی

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ادب اور زندگی دو ایسی لازم وملزوم چیزیں ہیں جن میں سے ایک کی عدم موجودگی کی صورت میں دوسرا جز و مکمل نہیں کہلایا جا سکتا۔ زندگی کے ساتھ ساتھ لوگوں کا ادبی مذاق بھی بدلتا رہتا ہے۔ اور اردو ادب نے اس بدلتے ہوئے مذاق کا ہمیشہ ساتھ دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی اس قلمرو میں نئی قدریں کارفرما ہیں۔ ادب کی پرانی صنعتوں کی جگہ نئی صنعتوں نے لے لی ہے۔ جن اصناف ادب نے پچھلے بیس پچیس سال میں شہرت ومقبولیت کا درجہ پایا ان میں سے ایک اہم صنف مکاتیبی ادب ہے۔ بقول شمس الرحمٰن:

> ''یہ نیا ادبی سورج اگر چہ ابھی اپنی کرنوں ہی میں بن سنور رہا ہے۔ لیکن یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں کہ وہ طلوع ہو کر اردو ادب کے قدردانوں کو کتنے ایسے گنج ہائے گرانمایا سے روشناس کردے گا۔ جن کے بغیر نہ ادب کو صحیح طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ اور نہ اس کے حسن وقبح کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگانا ممکن ہے۔'' [1]

مکتوب نگاری دراصل ایک لطیف فن ہے۔ شخصی اظہار کا یہ ایک بہترین ذریعہ ہے۔ مکتوب نگاری کا مخاطب کوئی ایک شخص ہوتا ہے جبکہ ادب کی دوسری اصناف میں

ایک ساتھ کئی اشخاص مخاطب ہو سکتے ہیں ۔خطوط ان دوستوں ،عزیزوں اور رشتہ داروں کو لکھے جاتے ہیں جن سے وہ ہر بات بے ساختہ کہہ سکتا ہے ۔خط زندگی کے مختلف پہلوؤں کو ہمارے سامنے لاتا ہے اس میں تکلف اور بناوٹ کی گنجائش بہت کم ہوئی ہے دراصل یہ ذاتی جذبات کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے۔اس لئے اس میں سادگی اور خلوص سے کام لیا جاتا ہے۔خط انسانی تمدن کے اہم کارناموں میں سے ایک ہے۔اس کی شروعات روزمرہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ہوئی۔لیکن آہستہ آہستہ یہ ایک فن کی حیثیت اختیار کر گئی ۔کیونکہ اس میں اس عہد کی تہذیب و تاریخ کو بھی پیش کیا جانے لگا یہی وجہ ہے کہ مکتوب نگاری ایک صنف کی حیثیت سے بھی مستحکم ہوگئی۔

خطوط کی ادبی اہمیت کسی بھی طرح تخلیقات سے کم نہیں وہ خصوصیات جو ایک تخلیق میں پائی جاتی ہیں وہی خصوصیات خطوط کے لئے بھی کسی حد تک ضروری ہے۔خطوط کی مقبولیت میں اختصار کو بڑی اہمیت حاصل ہے ۔یہی وجہ ہے کہ خطوط کو نثر کی دوسری اصناف پر فوقیت حاصل ہے اور اختصار کی وجہ سے ہی لوگ خطوط کا مطالعہ زیادہ کرتے ہیں۔بقول غلام رسول مہؔر

> ''مکاتیب علم و ادب کے چھوٹے چھوٹے جواہر پارے
> ہوتے ہیں جنہیں پڑھتے وقت دماغ پر زیادہ بوجھ نہیں پڑتا،
> استفادہ بیشتر ہوتا ہے اور زحمت کم تر'' ۲

خطوط سے علمی و ادبی معلومات میں بھی اضافہ ہوتا ہے بڑے ادیب اور فن کار کے خطوط کی اہمیت کی بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ ان میں ادبی مواد بہت زیادہ موجود ہوتا ہے اور اس کے ذریعے ادیب اور فن کار کے مقام و مرتبے کو متعین کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔خطوط میں انشا پردازی کے جوہر بھی نظر آتے ہیں کسی شاعر یا ادیب کی

شخصیت اور شاعری کو سمجھنے میں ان کے خطوط بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ خطوط شخصیت کو جاننے کا ایک اہم ذریعہ رہے ہیں۔ خط میں خط لکھنے والی کی عکاسی ہوتی ہے۔ خطوط کے ذریعے ہی کسی بھی شخصیت کی ذاتی، سیاسی، اقتصادی اور جذباتی زندگی کا اندازہ لگا سکتے ہیں اور ساتھ ہی اس عہد کو بھی بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ جس عہد میں یہ خطوط لکھے گئے۔ سوانح عمری اور خاکے لکھنے میں خطوط کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ فن کار کی زندگی اور ان کے حالات اور نظریات کا اندازہ بھی خطوط کے ذریعہ بہ آسانی لگائے جا سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ادیب کے حالات زندگی کو مرتب کرنے میں خطوط اہم رول ادا کرتے ہیں۔ غالب کے خطوط سے ان کی زندگی اور اس عہد کے سیاسی و معاشرتی حالات کا پتہ چلتا ہے۔ اسی طرح ابوالکلام آزاد کے غبار خاطر کے مطالعہ سے ان کی داخلی کیفیات، ذہنی کشمکش اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔

غالبؔ، اقبالؔ اور ابوالکلام آزاد جیسی نامور شخصیات کے خطوط کے مطالعہ سے ان کی شخصیات کے نئے نئے پہلوں سامنے آتے ہیں۔ اگر ان کے خطوط شائع نہ ہوتے تو شاید ان کی زندگی کے اہم گوشوں سے ہم ناآشنا ہوتے۔ تاریخ کے اوراق کی ترتیب میں بھی خطوط مورخین کی مدد کرتے ہیں۔ کیونکہ ان میں جابجا تاریخی واقعات کی من و عن نشاندہی ہوئی ہے۔ خطوط میں کون سا واقعہ، اچھا یا برا سوانحہ کب وقوع پزیر ہوا اس بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے اور اس کی تاریخ بھی درج ہوتی ہے۔

بعض خطوط میں تاریخی مواد بہ کثرت موجود ہوتے ہیں مثلاً اردو میں مرزا غالبؔ کے خطوط ۱۸۵۷ء کے غدر کے دوران عوامی زندگی کی داستان سناتے ہیں وہ واقعات جنہیں بیان کرنے سے مورخین بھی قاصر رہے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کا اثر غالبؔ پر بہت گہرا ہوا۔ ان کی آنکھوں کے سامنے ہی قتل و غارت گری ہوئی اور دلی کا شیرازہ بکھر گیا۔ غالبؔ کے عزیز و اقارب شاگرد اور رشتہ داران سے ہمیشہ کے لئے

رخصت ہو گئے۔ غالب کے حساس ذہن پر اس حادثہ کا زبردست اثر ہوا لیکن انہوں نے صبر و تحمل سے کام لیا اور اپنے ماحول و معاشرے کا جس طرح ماتم کیا ہے وہ انہیں سے ممکن تھا۔ غالب نے دلی کی تباہی و بربادی کا ذکر جا بجا اپنے خطوط میں کیا ہے۔ انہیں دلی اور دلی کی تاریخی عمارتوں سے خاص لگاؤ تھا۔ برطانوی حکومت نے دلی کی عمارتوں کو ممسار کرنا شروع کیا تو اس کا اثر غالب کے دل و دماغ پر کچھ زیادہ ہی پڑا۔ اپنے جذبات کو یوں قلمبند کرتے ہیں۔

''بھائی!

> کیا پوچھتے ہو؟ کیا لکھوں؟ دلی کی ہنسی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی۔قلعہ چاندی چوک ہر روز بازار مسجد، جامع مسجد ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی ہر سال میلہ پھول والوں کا یہ پانچوں باتیں اب نہیں پھر کیوں دلی کہاں! یاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا''۔[۳]

اس خط سے نہ صرف مرزا غالب کے اسلوب کی انفرادیت ظاہر ہوتی ہے بلکہ یہ تاریخی اہمیت کا حامل بھی ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کہ باہمی اظہار خیال اور پیغام رسانی سوسائٹی کا ایک فطری تقاضا ہے۔انسان کی معاشرت کی تاریخ ذہانت کے ماتحت باہمی اظہار خیال کو زیادہ آسان اور واضح بنانے کے لئے کیا کیا جدو جہد کی۔ اگر باہمی اظہار خیال کو ایک مستقل صورت دینے کی کوشش پر گہری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا۔ کہ اس سلسلے میں انسانی ذہن کی ترقی کس طرح زینہ بہ زینہ ہوتی ہے۔ پہلے پہل اظہار خیال کے لئے آوازوں اور اشاروں سے کام لیا گیا اس کے بعد اسی مطلب کو پورا کرنے کے لئے مختلف اشکال نے جگہ لی پھر حروف کی نوبت آئی اور اسی طرح عہد بہ عہد مختلف زبانوں

نے جنم لیا۔ اسلامی تہذیب نے اپنے اپنے دور میں مکاتیب و مراسلت کو اس درجہ اہمیت دی کہ قدیم زمانہ میں ادب و انشا کی تکمیل کی بنیاد ہی اچھی خطوط نویسی قرار پائی۔ جو شخص اس زبان و بیان سے کامل واقفیت رکھتا تھا۔ اس کو اسلامی ادوار میں اکتسابات وفضائل کے لحاظ سے شائستہ ترین انسان سمجھا جاتا تھا۔

خطوط نگاری کے انداز بھی وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔تاہم سادگی، اختصار اور جامعیت خطوط نگاری کے بنیادی لوازم ہیں۔اور ہر دور میں ان کی پابندی کی جاتی رہی ہیں۔اس تجزیے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ دیگر اصناف ادب کی طرح خطوط نگاری بھی اردو ادب کی ایک اہم صنف ہے اور اسی طرح یہ ایک اہم فن ہے۔اور پھر ہمیں ڈاکٹر سید عبداللہ کا ہم زبان ہو کر ہی کہنا پڑتا ہے۔

> ''خط تہذیب انسانی کے محیر العقول عجائبات میں سے ہے۔ ہمہ گیر تقاضوں سے پیدا ہوا ہے۔ پہلے محض معمولی ضرورتوں کو پورا کرنے کی حد تک محدود رہی۔اس کے بعد جملہ فنون عالیہ کی طرح ایک فن لطیف۔۔۔ بلکہ بقول بعض لطیف ترین فن بن گئی''۔ [۴]

خطوط ابلاغ کا موثر ذریعہ ہونے کے ساتھ ساتھ انکشاف ذات کا بہترین وسیلہ تصور کئے جاتے ہیں۔خط میں ملاقاتی پہلو کو سب سے اہم سمجھا جاتا ہے۔اس لئے اس میں گفتگو کی سی سادگی خلوص اور برجستگی و بے تکلفی ہونی چاہیے۔اچھا خط وہ ہوتا ہے۔ جس میں لکھنے والا اپنے مخاطب سے باتیں کرتا نظر آئے اور جس میں بے تکلفی، خلوص، فطری رنگ، انفرادیت اور ذاتی تاثرات کی جھلک موجود ہو۔

خطوط کے مطالعے سے اس عہد کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اور ساتھ ہی علمی وادبی سرگرمیوں کا جائزہ بھی لے سکتے ہیں خطوط کی

اہمیت وافادیت اپنی جگہ مسلّم ہے لیکن موجودہ منظرنامے پر نظر ڈالنے سے مایوسی ہوتی ہے۔سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس زمانے میں پیغام رسائی کے بہت سے ذرائع پیدا ہو گئے ہیں۔آج انٹرنیٹ، Twitter, Facebook, Email, Whatsapp وغیرہ نے بڑی تیزی سے اپنی جگہ بنائی ہے۔یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور میں خط لکھنے کا رواج ختم سا ہو گیا ہے۔ظاہر ہے نئی نسل کے لئے
خطوط کی اہمیت کم ہو جائے گی۔تو کیا اس سے ادب کا نقصان نہیں ہوگا کیا ہم ایک اہم صنف کو نئے تقاضے کے ساتھ نئے انداز سے جوڑ پائیں گے! یہ ایک ایسا سوال ہے جو آج سر اٹھائے کھڑا ہے۔اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

حواشی

۱۔ شمس الرحمٰن بی،اے۔ اردو خطوط۔کتابی دنیا لمیٹیڈ دہلی ۔ ص ۷۔
۲۔ غلام رسول مہر۔علم و ادب میں مکاتیب کا درجہ،مشمولہ نقوش مکاتیب نمبر جلد اول،ادارہ فروغ اردو لاہور ۱۹۶۷۔ ص ۱۳۱۔
۳۔ (خطوط ،ص ۵۱۴) خلیق انجم حصہ دوم۔
۴۔ سید عبداللہ ۔اردو خطوط نگاری،مشمولہ وجہی سے عبدالحق تک ۔سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۳۔ ص ۲۵۹۔

نظیؔر کی شاعری میں طنز ومزاح

ڈاکٹر اعجاز حسین شاہ
شعبہ اردو جموں یونیورسٹی

نظیؔر اکبر آبادی اپنے معاصرین میں موضوعات وخیالات کے انتخاب اوران کے برتاؤ نیز جذبات واحساسات کی ترجمانی کے اعتبار سے منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔نظیؔر آزاد منش اور قلندرانہ مزاج کے مالک تھے۔ انہوں نے میؔر اور سوؔدا کی شاعری کی سنہری بہار بھی دیکھی اور دبستانِ دہلی اور دبستان لکھنؤ کے نکھار اوران کے مزاج شاعری کا مشاہدہ بھی کیا لیکن اپنی آزاد طبیعت اور قلندری شان کے بموجب نہ وہ کسی دبستان سے وابستہ ہوئے اور نہ ہی کسی کا رنگ اور پیروی اختیار کی بلکہ انہوں نے اپنے مخصوص انداز، غیر معمولی مشاہدہ کائنات، فلسفیانہ فکر اور مخصوص لفظیات کی بنیاد پر اپنی شاعری کی ایک الگ دنیا آباد کی جس کے موجد بھی وہ خود ہیں اور پیش رو بھی۔اس ضمن میں نظیؔر اکبر آبادی اپنی منفرد شاعری کا خود ایک دبستان گئے۔

نظیؔر اکبر آبادی اردو شاعری کی دنیا کے پہلے ایسے شاعر ہیں جنہوں نے قدیم روایتی مضامین وموضوعات، قصۂ گل وبلبل، ستائش کاکل وعارض اور ذکر ہجر ووصال وغیرہ کو سرے سے ترک کر کے عوامی زندگی اوران سے جڑے مسائل اور بالخصوص عوامی جذبات واحساسات کی اپنی شاعری میں بھرپور ترجمانی کی۔اسی سبب انہیں اردو زبان کا پہلا باقاعدہ عوامی شاعر تسلیم کیا گیا ہے۔وہ عوام کے شاعر تھے انہوں نے

عوامی زندگی اوران کے مسائل کے ہر پہلو پر گہرائی سے غور کیا، عوامی جذبات واحساسات کو شدت سے محسوس کیا پھرانہیں اپنی فنکارانہ صلاحیتوں سے شاعری کا جامہ پہنایا۔ یوں تو ان کی شاعری میں مختلف النوع موضوعات کی گہما گہمی ملتی ہے لیکن ان کی شاعری کا خاص موضوع عوام اوران کے گونا گوں مسائل کی ترجمانی رہا ہے اوریہی وہ بڑا موضوع ہے جوانہیں اپنے معاصرین سے منفرد کرتا ہے۔

نظیر اکبرآبادی کو انسانی زندگی میں رونما ہونے والے دکھ، درد اور رنج وغم کا واقعاتی بیان کرنے پر قدرت حاصل تھی۔ وہ عصری زندگی کو اپنی شاعری کا جز بنا لینے میں مہارت رکھتے تھے۔ان کی نظمیہ شاعری میں ہندوستانی تہذیب ومعاشرت کی جیتی جاگتی اور متحرک تصویریں جابجا دیکھنے کوملتی ہیں۔ وہ ہندوستان کی تہذیبی ومعاشرتی زندگی سے عملاً اورجذباتی طور پر وابستہ تھے۔ان کی شاعری میں ہندوستانی تہواروں، میلوں ٹھیلوں اور موسموں وغیرہ کی رنگارنگی اور بہترین نقش نگاری پائی جاتی ہے۔انہیں قومی یکجہتی اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب کا علمبردار اوران کی شاعری کوقومی یکجہتی اور مشترکہ ہندوستان تہذیب کا گہوارہ کہا جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں ایک طرف اسلامی اعتقادات اورعلم الاصنام سے گہری واقفیت کے بموجب رام، کرشن اور دیوالی ودسہرہ پر بھی متعدد نظمیں جابجانظر آتی ہیں۔نظیر تصور پرست نہیں بلکہ حقیقت پسند شاعر کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کر چکے ہیں۔ ان کی شاعری میں جو موضوعات کا تنوع ہے وہی تنوع ان کی نظمیہ شاعری کی اصناف میں بھی ہے۔ان کی نظمیہ شاعری میں نظم کی مختلف النوع اقسام جیسے مخمس، مسدس، مربع، مثلث، ترجیع بند اور ترکیب بند وغیرہ برتی گئی ہیں۔ جن میں وزن، قافیہ، ردیف، اور بحر کی پابندی کی گئی ہے۔ دراصل نظیر جس عہد کے شاعر تھے وہ اردو شاعری کا ایک ایسا عہد تھا جس میں علم عروض، قافیہ اور ردیف کی پابندی لازمی تھی۔ ہر شاعر شاعری کے لئے مدون کئے گئے

مذکورہ اصولوں کی پابندی کرتا تھا اور نظیرؔ بھی اس پابند اصولِ شاعری کے پروردہ تھے۔ ان کی شاعری فنی اصولوں کے تقاضوں پر پوری طرح کھری اُترتی ہے۔ ان کی شاعری کا ایک اہم وصف یہ بھی ہے کہ اس میں اجتماعی شعور پوری بالیدگی سے ملتا ہے جو سماجی و معاشرتی انتشار اور فرار کے عہد میں اجتہادی کارنامے کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

نظیرؔ اکبرآبادی کی طبیعت میں طنز وظرافت کا مادہ فطری طور پر موجود تھا جو ان کی شاعری میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری میں طنز ومزاح کے پیکر بڑی خوبصورتی سے ایک دوسرے میں سموئے ہوئے ہیں۔ ان کی طنزیہ ومزاحیہ شاعری کا معیار اپنے عہد اور اس سے ماقبل شعراء کے طنزیہ ومزاحیہ معیار سے قدرے مختلف اور اعلیٰ ہے۔ ان کی شاعری پست درجے کے طنز ومزاح جیسے ہجوگوئی، پھبتی، ذاتی عناد وبغض، طعن وتشنیع، فحاشی وعریانی اور معاصرانہ چشمک سے بالکل مبرا ہے۔ ان کی طنز ومزاح کی اسی خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وزیر آغاز لکھتے ہیں کہ

> ''نظیرؔ اردو کے وہ پہلے شاعر تھے جنہوں نے نہ صرف شعر کو اپنے ملک کے جیتے جاگتے ماحول سے قریب تر لانے کی سعی کی بلکہ ہجو کی محدود کینہ پروری سے نکل کر طنز ومزاح کے وسیع اطلاق کی طرف بھی متوجہ ہوئے۔''

(اردو ادب میں طنز ومزاح۔ وزیر آغا۔ ص ۹۴)

نظیرؔ اکبرآبادی کے یہاں چبھتا ہوا طنز اور دھیما دھیما مزاح جس میں ذہانت، متانت، بذلہ سنجی اور شوخی جیسے عناصر کا حسین امتزاج ملتا ہے اور یہی امتزاج طنز ومزاح کے اعلیٰ معیار کی غمازی کرتا ہے۔ نظیرؔ ہنسی وخوشی اور پیار ومحبت کے شاعر تھے۔ ان کے دل میں کسی کے لئے نفرت کا جذبہ نہیں تھا اور اسی لئے ان کی طنز کا مقصد کسی کا دل

دکھانا نہیں رہا۔ وہ معاشرے کی کسی کمزوری پر طنز کرتے ہیں تو ان کا لہجہ نہایت ہی نرم ہوتا ہے اور جب وہ مزاح کے پیکر اُبھارتے ہیں تو ان کی نوعیت بھی ہمدردانہ ہوتی ہے ۔اس ضمن میں نظیرؔ اپنے نشانہ تمسخر سے نفرت نہیں کرتے بلکہ اُسے پسند کرتے ہیں۔ اُن کا یہ رویہ طنز ومزاح کے جدید تصور کے بہت قریب ہے۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جو ان کے معاصرین کے مقابلے میں ان کی طنز ومزاح کے معیار کو بلند کرتی ہیں۔ ان کی طنزیہ ومزاحیہ شاعری کی روش اور اس کے معیار کو مدنظر رکھتے ہوئے وزیر آغاز رقم طراز ہیں کہ:

> ''نظیرؔ کی طنزیہ ومزاحیہ شاعری کو ایک اور لحاظ سے بھی اہمیت حاصل ہے وہ اس طرح کہ نظیرؔ نے اردو شاعری کے اس ابتدائی دور ہی میں مزاح اور طنز کا ایک ایسا معیار قائم کیا جو مغربی ادب سے متاثر ہوئے بغیر اس کے جدید تصور سے بہت قریب تھا۔''

(اردو ادب میں طنز ومزاح، وزیر آغاز، ص ۹۵)

نظیرؔ اکبر آبادی نے انسان کی بنیادی ضرورتوں نیز سماج ومعاشرے کی بے اعتدالیوں جیسے اہم موضوعات پر فلسفیانہ انداز میں غور وخوض کر کے بڑی سنجیدگی ومتانت سے اپنی شاعری میں اُجاگر کرنے کی سعی کی ہے جس میں وہ پوری طرح کامیاب نظر آتے ہیں۔ انہوں نے انسانی زندگی کے مختلف گوشوں کا تقابل کر کے طنز ومزاح کے اعلیٰ نمونے ابھارنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے وہاں میاں
بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خاں
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآں اور نمازں

اور آدمی ہی ان کی چراتے ہیں جوتیاں
جوان کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

فرقت کا کوروی نے نظیرا کبر آبادی کی طنزیہ شاعری کے اہم پہلوؤں پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ

''ان کی شاعری میں جگہ جگہ ہم کو سماج و معاشرت پر طنز ملتا ہے۔ چنانچہ روٹی نامہ، بیسہ نامہ، آدمی نامہ، جوگن نامہ اور کوڑی نامہ یہ ساری کی ساری طنزیہ نظمیں ہیں جن میں لطیف طنز ملتا ہے۔''

(اردو ادب میں طنز و مزاح، فرقت کا کوروی، ص ۳۴)

جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ نظیر جس ماحول کو نشانہ تمسخر بناتے ہیں وہ اس ماحول کو پسند بھی کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی طنز و مزاح کا رویہ نرم اور ہمدردانہ نوعیت کا ہے۔ ان کی نظم ''روٹیاں'' کا یہ بند دیکھئے جس میں طنز و مزاح کی نرم و نازک چاشنی پائی گئی ہے جو نظیر کے معیار طنز و مزاح کا بخوبی تعین کرواتی ہے۔

پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیر سے
یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کاہے کے
وہ سن کے بولا بابا خدا تجھ کو خیر دے
ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے
بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

نظیرا کبر آبادی لسانی اعتبار سے اردو ادب میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں انہوں نے اپنی شاعری میں روزانہ زندگی میں استعمال ہونے والی عام آدمی کی لفظیات کو برتا ہے۔ عربی و فارسی کے علاوہ انہوں نے برج اور اس عہد میں رائج دیگر اہم بولیوں

کے الفاظ جن سے اس وقت کی عام عوام بھی آشنائی رکھتی تھی بڑی فنی مہارت سے اپنی شاعری میں سموئے ہیں ان میں سے چند الفاظ اب متروک ہو چکے ہیں بقیہ اردو لغت کا حصہ بنے ہوئے ہیں۔فیلن نے لسانی اورادبی ہر دو لحاظ سے نظیر اکبرآبادی کو ہندوستانی شاعری کا نمائندہ شاعر کہا ہے۔طنز ومزاح کے حوالے سے نظیر اکبرآبادی اردو کے پہلے ایسے شاعر ہیں جنہوں نے اردو شاعری میں سنجیدہ طنز ومزاح کی طرح ڈالی اور طنز ومزاح کا اعلیٰ معیار قائم کیا۔نظیر اکبرآبادی کے بعد ان کے معاصر انشاءاللہ خان انشا کا نام بھی اردو شاعری میں طنز ومزاح کی روایت میں ایک اہم اور منفرد مقام رکھتا ہے۔

خطوط نگاری کی ختم ہوتی روایت کے اسباب وعوامل

آصف ملک علیمی
باباغلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری

خطوط نگاری ایک شخص طرز اظہار ہے،تار، ٹیلی فون ، ٹیلی ویژن ،مبائل ، واٹس ایپ،فیس بک، ٹیوٹر،ایمواور دیگر انٹرنیٹ ذرائع کی طرح یہ بھی ابلاغ وترسیل کا ایک وسیلہ ہےفطرت انسانی کسی بھی پیغام خبر، واقعہ، تجربے یا کارہائے نمایاں ، وغیرہ کی سیل کی شیتابی کی متمنی ہے۔ وہ اس ذریعہ کو برتنا چاہتی ہے جس کی ترسیل وابلاغ برقی رفتار کی سی تیزی ہو،مکتوب نگاری کی روایت پرنظر ڈالنے سے اس امر کی تفہیم آسان ہو جاتی ہے۔مکتوب نگاری کا اول مرحلہ، پیڑوں کی چھالوں ، پتوں اور جانوروں کی جھلی اور چمڑوں کےاوپر سرانجام پانااور پھر دوسرا مرحلہ اُس کی ترسیل وابلاغ کا جانوروں پر لادکرمکتوب الیہ تک پہنچانا خاصا صبر آزماں تھا۔خطوط کی ابلاغ ترسیل ایک لمبے عرصے کا تقاضا کرتی تھی جس سے نظام حیات اور حکمرانی نظام پر ایک سست رفتاری چھائی رہتی تھی۔رفتہ رفتہ کاغذوں پرخطوط لکھ کر تیز ہرکاروں کے ذریعہ مکتوب امیہ تک پہنچایا جانے لگا۔ پھرریل گاڑیوں کے بعد ہوائی جہاز کے وسیلے مکتوب،مکتوب ۔امیہ تک دستک دینے لگا۔ٹیکنالوجی نے اورترقی کی جانب قدم بڑھائے تو ٹیلی فون کے بعد مبائل کا زمانہ آیا۔اب موبائیل کے ذریعہ انٹرنیٹ کی دیگر تکنیکیں وجود میں آئی جن

میں، مسیج، واٹس ایپ، وائس مسیج، وائس مسیج ،فیس بک، ٹیوٹر، ایمواور ویڈیو کانفرسنگ کے ذریعہ پیغام، پیام امید کے موبائیل کی سکرین پر حاضر ہوتا ہے۔اس پیغا، مدعا، اور مطلب کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں پرائیویسی بھی ہے اور برقی شتابی بھی ۔ عصرِرواں کا ہرلمحہ حیرت انگیز ہے۔لمحہ ساعتوں ساعت سیر رومیں سوسوا برس کا عرصہ ایک لحظ ہی کی حیثیت رکھتا ہے اور سارا جہاں ہاتھوں کی لکیروں کی گرفت میں آ گیا ہے۔فاصلے مٹ چکے ہیں دنیا ٹیکنالوجی برادری بن گئی ہے ایسے عہد کی سانسوں میں اگر خطوط نگاری کی خوشبو کا احساس ہونے لگے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مکتوب نگاری کا لطف لینے والے ابھی مکتوب نگاری کی بکھرتی زلفوں کو سمیٹ کر اس کی مشاطگی سے لذت اٹھانا چاہتے ہیں۔لیکن سوال یہ ہے کہ مکتوب نگاری کی زلفوں کی خوشبوں کیوں ماند پڑ گئی۔اس سوال اور اس جیسے سوالوں کا جواب تلاش کرنے کیلئے ہم یہاں سر جوڑ کر بیٹھے ہیں۔اس سے قبل کہ میں اس کے اسباب وعوامل پر تفصیلی بحث کروں ’’اُردو میں خطوط نگاری کی ختم ہوتی روایت کے اسباب وعوامل‘‘ کا ایک رحمانی خاکہ پیش ہے۔

بنیادی یہ ہے موضوعات ومطالب کے اعتبارے خطوط۔ذاتی، دفتری، سرکاری، تجاری، کاروباری، ادبی، سماجی، سیاسی، اطلاقاتی، عام معلوماتی، شخصی اور عشقیہ ہرنوعیت کے ہو سکتے ہیں اور ہیں۔اس لحاظ سے اور خطوط نگاری کی روایت کی ورق گردانی کے بعد اُردو مکتوب نگاری کے زوال کے ذیل میں ان اسباب وعوامل کو شامل کیا جاسکتا ہے۔

ا۔ مکتوب کا مکتوب الیہ تک پہنچنے کیلئے طویل مدت لینا۔یا انسانی فطرت کی تمنا کے مطابق اس کا جلد نہ پہنچنا۔

۲۔ کسی کی معرفت مکتوب کا مکتوب الیہ تک پہنچنے میں دست دردست کے سبب مکتوب کے خفیہ مضمون کا غیر پر کھل جانا۔

۳۔ خفیہ وصف کی حفاظت کی خاطر الٹی تحریر کی مشقت اٹھانا۔
۴۔ جعلی مکتوب کے ذریعے نظام حیات میں منفی تغیر وتبدل یا فساد انگیزی کا احتمال۔
۵۔ مکتوب کی خفیہ تحریر کا غیر کے ہاتھ لگنے کے سبب بلیک میلنگ کا امکان۔
۶۔ ناخواندہ افراد کا کسی خواندہ فرد سے خط نویسی اور قرأت کا عمل، جس میں وسائط کثیرہ کے سبب خط لکھوانے والے کے جذبات کی عدم نمائندگی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔
۷۔ اُردو زبان کے ساتھ تعصّبانہ رویہ۔
۸۔ ترسیل ابلاغ کے جدید آلات سے قبل حالات واخبار کی جانکاری کے معتبر ذرائع میں سے ایک ذریعہ مکتوب نگاری کا تھا جواب نہیں رہا۔
۹۔ ہندوستان سے اُردو زبان کی سرکاری حیثیت کا اختتام (خاتمہ اور یا بعض مقام پر سرکاری زبان ہوتے ہوئے بھی اُس کے جائز حق سے اسے محروم رکھنا
۱۰۔ انگریزی زبان کی برتری کا زعم اور اُردو زبان کو عام زبان خیال کر کے احساس کمتری کے مرض میں مبتلاً ہو کہ اردو میں خطوط نگاری کو کسیر شان سمجھنا۔
۱۱۔ شعر وسخن میں استاد شاگردی کی اصلاحی روایت بالخصوص مراسلاتی اصلاح کا فقدان۔
۱۲۔ نظریہ ساز دانشوروں، فن کاروں، نقادوں، حساس اور ہمدرد رہنماؤں کی کمی۔
۱۳۔ فرد کا خود کو فرشتہ صفت تصور کرنا۔ یہ بھی ایک طرح سے ہر زبان میں خطوط نگاری کی کمی کا سبب بن رہا ہے۔
۱۴۔ خطوط نگاری کی تکنیک میں ناول، افسانہ نگاری اور خود نوشت نگاری کا وجود۔
۱۵۔ جدید ٹکنالوجی کے سبب بات حیثیت، پیغام رسانی کی برقی سرعت، اور جدید آلات وتکنیکوں کے وسیلے بات چیت کے ساتھ لذت دیدار کی فراہمی۔

اب ایک ۔ایک سبب کو ہم تفصیل سے سمجھتے ہیں

ا۔مکتوب کا مکتوب الیہ تک تاخیر سے پہنچنا یامظرت انسانی کے مطابق مکتوب کا مکتوب الیہ کو جلد وصول نہ ہوا ہونا انسانی فطرت میں شتابی اور عجلت ہے ۔ ہر انسانی خواہش مند ہوتا ہے کہ اس کا پیام مدعا، مطلب برق رفتاری کے ساتھ مکتوب الیہ تک پہنچے ۔لیکن ٹیکنالوجی کی بتاریخ ترقی سے قبل انسانی کے چاہنے کے مطابق مکتوب کا تیز تر مکتوب الیہ تک پہنچنا ممکن ہی نہیں بلکہ محال تصور کیا جاتا تھا۔ بعض خط بڑے جہاں گرد قسم کے ہوا کرتے تھے کہ سندھ باد جہازی مارکوپولو اور ابن بطوطہ بھی انہیں دیکھ کر شرمندہ ہو جائیں ۔ یہ خط کبھی کبھی اپنی منزل مقصود تک پہنچے ۔ میں بیس سے تیس سال اور کبھی اس سے بھی زیادہ زمانہ لگا دیتے تھے ۔ یہاں تک کہ مکتوب الیہ تک پہنچتے پہنچتے مکتوب الیہ دار فانی کو خیر آباد کہہ چکا ہوتا ہوتا تھا۔ یا اگر اس مدت کو کم کیا جائے تو کم از کم ایک دو مہینے تو ضرور لگتے تھے ۔گھوڑوں پر ہر کارے خطوط لے کر مطلوبہ منزل تک پہنچایا جاتا ہے ۔ پھر رفتہ رفتہ ریل گاڑیوں اور ہوائی جہاز کے ذریعہ خطوط ایصال ہونے لگے ۔لیکن یہ مدت بھی انسانی فطرت پر گراں بار ہوئی ، پر'' مرتا کیا نہ کرتا'' پیغام ، مدعا ، مطلب تو مکتوب الیہ تک کسی نا کسی تدبیر سے پہنچانا ہی تھا ۔ پھر دیکھتے دیکھتے وہ فاصلے مٹ گئے تو مکتوب نگاری کے گرف میں بھی گراوٹ آ گئی ۔

۲۔کسی کی معرفت مکتوب کا مکتوب الیہ تک ایصال دست در دست کے سبب مکتوب کا خفیہ مضمون غیر پر کھل جانا۔

مکتوب کا کسی کا کی معرفت مکتوب الیہ تک پہنچنے میں ایک بڑا مسئلہ یہ ہوا کرنا تھا کہ اس غیر ترقی یافتہ زمانے میں آدھی سے زیادہ ڈاک آخری منزل پر صحیح سلامت پہنچنے کے بعد بھی کسی کی معرفت ہی مکتوب الیہ کے ہاتھوں لگتی تھی ۔اس طرح کے خطوط پر پتا کچھ اس طرح سے ہوا کرتا تھا۔ بمقام شہر راجوری ، تحصیل درہال ملکاں ، گاؤں

بڑی درہال ۔محلّہ ہروٹ اشرف ملک خانقاہ والے کومل کر عثمان ملک کو ملے ۔ ایسے مکتوب کے ساتھ ایک ناروا مسلوک یہ بھی ہوتا تھا کہ ایک خط دوسرا کھول کر پڑھ لیتا تھا۔بعض افراد معاندانہ کاروائی کے طور پر ایک دوسرے کے مکتوب پھاڑ بھی دیا کرتے تھے ۔ بسا اوقات گھریلوں معاشقوں میں مکتوب کا تبادلہ رشتے کے چھوٹے بہن بھائیوں، بھانجوں،بھتیجوں کے ذریعے عمل میں آتا تھا اسے پرچہ بازی کہا جا سکتا ہے۔ کبھی کبھی ایسے پرچے پکڑے بھی جایا کرتے تھے۔جن پر پکڑ دھکڑ کے علاوہ مار پٹائی۔ تذلیل وتضحیک تک نوبت آجاتی تھی آج کے دور میں جدید آلات گفت وشنید اور دید کے سبب لوگ ان فضیحتوں سے رخصتی پا گئے ہیں ۔مکتوب نگاری زوال پذیر روایت پسِ پردہ ایک یہ اہم سبب ہے۔

۳۔خفیہ مضمون کی حفاظت کی خاطر الٹی تحریر کی مشقت اٹھانا:

پرائیویسی کے فقدان کے سبب بعض مکتوب نگاری الٹے الفاظ کی تکنیک میں تحریر کی منشقت اٹھایا کرتے تھے تاکہ مکتوب کے خفیہ مضمون کی آبرو بچائی جا سکے۔کہا جاتا ہے کہ ایک صاحب اپنے نامۂ محبت کے خفیہ مضمون کی ستر پوشی کیلئے اپنی محبوبہ کو الٹی تحریر میں خط لکھ رہے تھے اور ہدایت یہ تھی اس خط کو آئینے کے سامنے رکھ کر آئینے میں پڑھنا۔

ایک شخص اس مرض میں مبتلا تھا کہ اگر وہ کسی ایسے شخص کے قریب بیٹھا ہو جو کچھ تحریر کر رہا ہو تو وہ اس کی تحریر پڑھنا شروع کر دیتا تھا۔ایک مرتبہ کوئی صاحب خط لکھ رہے تھے کہ اُس شخص نے اپنی عادت رذیلہ کے مطابق خط پڑھنا شروع کر دیا۔ مکتوب نگار نے خط میں اگلہ جملہ یہ لکھا کہ ایک بیوقوف آدمی اس وقت میرے برابر بیٹھا یہ خط پڑھتا جا رہا ہے ۔اس لیے اب میں یہ خط ختم کرتا ہوں ۔ بیوقوف آدمی برجستہ کہہ اُٹھا نہیں نہیں صاح آپ لکھے میں نہیں پڑھ رہا ہوں ۔محبوب ومحبّ نے اس

مشقت کی رخصتی مخلصی کیلئے خطوط نگاری کو طلاق بائن دے دی ہے۔

۴۔جعلی مکتوب کے ذریعے نظام حیات میں منفی تغیر وتبدیل ، یا فساد انگیزی کا احتمال:

تاریخ کے اوراق اور روزمرہ کی زندگی میں بعض ایسے دلدوز سانحے بھی گذرے ہیں ۔ جو جعلی خطوط کی مرہون منت رہتے ہیں ۔ اسلام میں خلفاء راشدین نے مکتوب نگاری کے عمل کو ﷺ کی مکتوب نگاری کی روایت پر برقرار رکھا ہوا تھا۔ اس زمانے میں خلفاء راشدین کے یہاں باضابطہ کاتب رکھے جاتے تھے جو ہر قسم کا خط لکھا کرتے تھے (آج بھی سرکاری دفاتر میں یہ روایت برقرار ہے)

حضرت عمر فاروق کے عہد خلافت میں باقاعدہ دارالا انشاء قائم کیا گیا تھا۔ حضرت عمر نے حضرت زید بن ثابت اور عبداللہ بن اُمی بن خلف کو کاتب مقرر کیا تھا۔ ہر صوبے میں ایک ایک دارالانشاء قائم تھا۔ جو براہ راست مدینہ منورہ میں واقع مرکزی دارالانشاء سے منسلک تھا۔ حضرت ابوبکر کے کاتب عثمان بن عضان اور زید بن ثابت تھے۔ جب کہ حضرت عثمان کے عہد خلافت میں مروان بن حکم کو اس کام پر مامور کیا گیا تھا۔ اسی مروان کے ای جعلی خط کے سبب حضرت عثمان غنی شہید کیے گئے بعد میں شہادت عثمان، حضرت امیر معاویہ اور حضرت علی کے درمیان جنگ کا سبب بنی، دونوں فریقوں کے ساتھ ہزاروں صحابہ کرام شہید ہو گئے ۔ اسی طرح ہمارے سماج میں ایک شخص دوپہر کسی آدمی کے نام کسی تیسرے شخص کی طرف سے خط لکھ کر آپسی جھگڑا کھڑا کر دیا کرتا تھا۔ یا میاں بیوی کے مابین تفریق کا سبب بنتا تھا۔ یا کسی عاشق کو کسی دوسری دوشیزہ کے نام جعلی خط کر محبوب ومحبّ میں دوری پیدا کر دیا کرتا تھا۔ اس جعلی سازی کے عمل نے بھی انسانوں کو خطوط نگاری کی روایت سے دور کر دیا۔

۵۔مکتوب نگاری کی خفیہ تحریر غیر کے ہاتھ لگنے کے سبب بلیک میلینگ کا امکان:

خط ہماری زندگی میں کئی طرح کے رول ادا کرتا ہے۔جس میں سے ایک بلیک میلنگ ہے۔اگر کوئی شخص کسی فرد کا ہم خیال نہیں ہوتا۔یا وہ اُسے اپنے مکردہ کاروبار میں شریک کرنا چاہتا تھا۔لیکن وہ شکص اس کے اس کردار سے متفق نہ ہونا یا کوئی کالج ۔اسکول کی لڑکی کسی عاشق یا مراد کو پسند نہیں کرتی تھی تو اس لڑکی کا رگر کسی دوسرے کے نام کوئی خط اس کے ہاتھ لگ جاتا تو اسے ڈرا دھمکا کر اپنے اداروں کیلئے مجبور کرتا تھا۔ ایس طرح محصول شدہ خط کو بعض لوگ اپنے اپنے مقاصد و مطالب کیلئے ڈھال بنالئیا کرتے تھے۔یا بسا اوقات کوئی بزدل اور کم ہمت عاشق کیلئے بھی خط اظہار عشق کا ایک کارگر ذریعہ ثابت ہوتا تھا۔آج کے ٹیکنالوجی کے دور میں جدید آلات وتکنیک کے ذریعے عاشق ومعشوق کی خفیہ طریقے سے ضرور ہیں پوری ہوجاتی ہیں۔اور دوسری بات یہ بھی خاص ہے کہ اس دور میں شاید ہی کوئی عاشق کم ہمت یا بزدل رہ گیا ہو۔ کیوں کہ کل تک جسے برائی یا عیب تصور کیا جاتا تھا۔آج وہ اچھائی یا حسن بن گیا ہے۔ اس لئے وہ بالمشافہ روبرو اظہار محبت کر لینے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا۔خطوط نگاری اور پرچہ بازی کو کام میں نہ لا کر اس ساری الجھن سے محفوظ رہتا ہے۔

۶۔ناخواندہ افراد کا کسی خواندہ فرد سے خط نویسی اور قرأت کا عمل جس میں وسائط کیرہ کے سبب خط لکھوانے والے کی جذبات کی عدم نمائندگی بھی مکتوب نگاری کی روایت کے نقصان میں ایک وجہ ہوسکتے ہے۔

ناخواندہ لوگوں کے درمیان جب خط وکتابت کا عمل انجام پاتا تھا۔یہ خطہ و کتابت زیادہ وسیلوں سے عمل میں آتی تھی۔ایک فرد کی بات دوسرے فرد تک پہنچانے کیلئے تین وسیولوں سے گزرنا پڑتا تھا۔پہلا وسیلہ تو بجائے خود خط ہی ہے۔دوسرا وسیلہ اس خط کا لکھنے والا اور تیسرا وسیلہ اس خط کو پڑھ کر سنانے والا۔گویا جب کوئی گاؤں کی دوشیزہ یا عورت ڈاک گھر کے باہر بیٹھے عرضی نویس سے اپنے پردیسی ساجن کے نام

خط لکھواتی تھی تو اس خط کا نفیس مضمون خواہ گاؤں کی دوشیزہ یا عورت کا ہو لیکن مضمون ڈاک گھر کے باہر بیٹھے عرضی نویسی کا ہوتا تھا۔ پھر جب یہ خط ڈاکیے کے ہاتھوں پردیسی ساجن کے پاس پہنچتا۔ تو اسے بھی وہاں کا کوئی پڑھا لکھا مضمون پڑھ کر سنا دیا کرتا تھا۔ تو یہ قرأت گاؤں کی عورت کے نفیس مضمون سے زیادہ عورت کے گاؤں کے ڈاک گھر کے باہر بیٹھنے والے عرضی نویسی کے مضمون کی ہوتی تھی جسے سنتے ہوئے پردیسی ساجن اس میں اپنا من چاہا نفیس مضمون گھول گھول کر پیتا رہتا تھا یہ بھی حقیقت ہے کہ زبان کی اولین شکل بولی ہے اور دوسری شکل تحریر۔ دراصل جذبات یہ اظہار زبانی ہے اور تحریری اور، جب آج کے زمانے میں وہ عورت اپنے ساجن کو اپنے مضمون کا دکھڑا یا خوشیوں کی بشارت موبائل فون، ویڈیو کانفرسنگ یا جدید انٹرنیٹ کی تکنیکیوں کے ذریعہ سنا سکتی ہے یا اپنے جذبات کا اظہار کر سکتی ہے تو پھر وہ خطوط کے تین، تین یا کئی وسیلوں کی محتاج کیوں ہو گئی۔ اس صورت حال کا اثر صرف اُردو خطوط نگاری پر نہیں بڑا بلکہ ہر زبان کی مکتوب نگاری پر اس کے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ اس طرح مکتوب میں لکھوانے اور پڑھوانے اوالے کے نفس مضمون اور عرضی نویس اور قرأت کرنے والے کے مضمون کے مابین ایک ہی چیز قدر مشترک ہو سکتی ہے اور وہ ہے کوئی ٹھوس، بے حس اور جامد پیغام یعنی کسی کی حیات و ممات، ستادی بیاہ، جھگڑے فساد یا سیلاب اور بھونچال کی خبر جس میں خلل پذیری ترسیل کے اس چینل کی بساط سے باہر ہے۔

۷۔ اُردو زبان کے تعصّبانہ رویہ:۔

اُردو زبان اور خاص طور پر اُردو خاص طور پر اُردو خطوط نگاری کی روایت پر تعصّبانہ فکر نے بھی گہری چوٹ کی ہے۔ یہ تعصّبانہ رویہ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد ہی پنپ چکی تھی۔ جب ہندوستانی زبان (اردو) کو دو اسم الخط میں منقسم کر کے الگ الگ نام انگریزوں کے ذریعے ملے۔ ہند اور اپردو کے درمیان ایک فاصلہ قائم کر دیا گیا۔

گذشتہ ستر سالوں سے اس رویے نے انسانوں کو لسانی بنیادوں پر بانٹ کر دریا کے دو ایسے کنارے بنا دیا ہے۔ جو چاہنے کے باوجود ایک دوسرے سے مل نہیں سکتے۔

۸۔ جدید آلات کے زمانے سے قبل حالات و اخبار کی جانکاری کے معتبر ذرائع میں سے ایک اہم ذریعہ مکتوب نگاری ہوا کرتا تھا۔ آج مذکورہ جانکاریوں کیلئے جدید آلات کی فراہمی نے بھی اُردو مکتوب نگاری پر سخت ضرب لگائی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عہد غالب میں اور خاص طور پر 1857ء کی ناکام جنگ آزادی کی پاداش میں جو ابتر حالات نمودار ہوئے ان کی جانکاری کا ذریعہ خطوط غالب ہیں۔ 1857ء کے واقعہ کے دوران جو مجلس حیات سجتی تھیں ان پر جب شب خون مارا گیا، زندگی درہم برہم ہوگئی۔ غالب دلی میں ہی مقیم رہے لیکن احباب و اقارب ان سے بچھڑ گئے بہ قول غالب:

''میں اس تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں۔ جس کا خط آیا میں نے جانا کہ وہ شخص آیا''

غالب حکیم نجف خان کو ایک خط میں اس طرح لکھتے ہیں

''میاں! حقیقت حال اس سے زیادہ نہیں ہے کہ اب تک جیتا ہوں بھاگ نہیں گیا، نکالا نہیں گیا، کسی محکمے میں ابھی تک بلایا نہیں گیا، معرض بار پر میں نہیں آیا آئندہ دیکھیے کیا ہوتا ہے''

(اردو معلی جلد دوم ص 422)

اسی طرح واجد علی شاہ کو جب انگریزوں نے 1857ء کے بعد کلکتے میں بمقام مٹیا برج قید کر دیا تھا۔ قید کی حالت میں ان کے شکستہ دل پر جو بیتی، انھیں جن حالات کو برداشت کرنا پڑا یا ان پر مصائب کے جتنے پہاڑ ٹوٹے اس کا تصور بھی نہایت دردناک اور عبرت ناک امیز ہے انگریزوں کے نظام، وطن عزیز کی جدائی اور عزیزوں و رفیقوں

کی دوری نے انہیں کسی اضطراب میں ڈالا ہوا تھا۔ سگا ہی محل میں روز وشب عیش و عشرت میں گذرنے کے بجائے بوریا نصیب ہوا۔ بے شمار بیگمات کی آغوش دلربائی میں رہنے والا یہ نواب تنہائی میں قید کی گھٹا ٹوپ اندھیری زندگی کی سانیس کاٹ رہا تھا۔اپنے حالات اور کیفیات کی جانکاری کلکتے سے شہیدا بیگم کو خط میں یوں لکھتے ہیں:

''حکایت فراق اور قصہ اشتیاق سن کر دل مضطر سخت گھبرایا۔
کلیجہ منھ کو آیا۔ ہمارے حال اگر سنو ساری کہانی اپنی بھول جاؤ''
جامع الطغر قین اس دوری کو دور کر کے شادی وصل سے مسرور
کرے''

(نورالحسن ہاشمی: خطوط واجد علی شاہ 163ء)

یہ وہ دور تھا جب کرفیوزدہ شہر اور قید تنہائی میں اپنی خریت، حالات اور کیفیات کی جانکاری کا معتبر ذریعہ خطوط نگاری ہوا کرتا تھا،آج حالات واحوال کی خریت وعافیت اور کیفیات کی جانکاری میڈیا کی ذریعہ صرف حاصل ہی نہیں ہوتی بلکہ امیر کا ٹیلی ویژن، ویڈیو کانفرنسنگ یا المیو اور فیس بک، ٹیوٹر وغیرہ کے ذریعہ دیدار بھی ہو جاتا ہے۔اس کی تکلیف غم وخوشی کے قریب قریب تمام خدوخال سے احباب واقف ہو جاتے ہیں۔اس میں وقت بھی نہیں لگتا اور خطوط نگاری کی مشقت کے ساتھ ساتھ خبر کی تاخیر کی ایزا بھی نہیں جھیلنی پرتی۔

۹۔ ہندوستان سے اُردو زبان کی سرکاری حیثیت کا خاتمہ:

اُردو ادب کا ہر جانکار یہ جانتا کہ جب ہندوستانی دربار میں فارسی زبان سرکاری زبان رہی تو بہت کم لوگوں نے اُردو میں خطوط لکھے، فارسی میں تحریریں پیش کرنے کو اہل علم وادب فخر محسس کرتے تھے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ غالب نے خطوط نگاری کی ابتدا مختلف محققیں اور ناقدین کے مطابق 1846ء سے 1850 کے دوران شروع کی،

حالانکہ فارسی کی موجودگی میں بھی اردو ہی ایک ایسی زبان تھی جس کو ملک میں 'لینگو ا فرینکا، کا درجہ حاصل تھا اوراس وقت کی تبدیلی کیلئے یہی زبان اردوموزوں تر تھی اسی اُردو کی مقبولیت کو مدنظر رکھتے ہوئے 1832ء میں اُردو کو دفتری زبان قرار دیا گیا۔ اسی زمانے میں اُردو اخبار بھی نکلنے لگے۔ اگر چہ مستقبل کے دفتری تقاضوں کے پیش نظر انگریزی زبان ذریعہ تعلیم بنادی گئی۔ پھر آزاد ہندوستان میں سرکاری زبان ہندی قرار پائی۔ آض بعض ریاستوں میں اُردو کی حیثیت کہیں سرکاری زبان کے ساتھ دفتروں اُردو کے مترجم رکھے ہوئے ہیں، جو درخواستیں یا خطوط اُردو میں آتے ہیں ان کا ترجمہ ہندی زبان میں کیا جاتا ہے۔ مہارشٹرا میں مراٹھی سرکاری زبان ہے تو دوسری زبان ہندی ہے۔ دونوں زبانوں میں سرکار اور دفتری خطوط تحریر کیے جاتے ہیں۔ پنجاب میں سرکاری زبان پنجابی ہے پنجابی زبان میں سرکاری آڈر، سرکاری اور دفتر خطوط لکھے جاتے ہیں۔ لیکن کم تعداد میں ہی سہی ابھی ہندوستانی کی اکثر ریاستوں میں اُردو خطوط کے لکھنے والے بھی موجود ہیں۔ لیکن ریاست جموں وکشمیر میں اُردو خطوط نگاری اور اُردو زبان کو سب سے زیادہ یہاں کی سرکاروں نے نقصان پہنچایا ہے۔ کیا! اگر دیگر ریاستوں میں جہاں کہیں جو بھی زبان سرکاری حیثیت رکھتی ہے، اسی زبان میں سرکار آڈر، سرکاری خطوط اور دفتر خطوط، کاروائی اور آدر نکالے جاسکتے ہیں تو ریاست جموں کومشیر میں اُردو میں کیوں نہیں اُردو زبان کو اول ترجیح دی جاتی اور انگریزی یا ہندی کو دوسری زبان کی حیثیت سے اُردو کے برابر لکھا جاتا۔ یہاں کی سرکاروں نے اُردو کے حق کو غصب کر رکھا ہے۔

۱۰۔انگریزی زبان کی برتری کا زعم اور اُردو زبان کو عام زبان خیال کر کے احساس کمتری کے مرض میں مبتلا ہوکر اُردو زبان اور اُردو مکتوب نگاری سے پہلو تہی کرنا بعض اردو والے بعض وہ لوگ جو اُردو زبان سے نابلہ ہیں اس مرض میں مبتلا ہیں

کہ جس کو انگریزی آتی ہے وہی اہل علم ہے، گیانی ہے، پڑھا، لکھا ہے، حالاں کہ یہ بالکل غلط اور گمراہ کن خیالی ہے۔ انگریزی کی اہمیت اپنی جگہ لیکن گیانی، یا عالم ہونے کیلئے کسی زبان کا خاص ہونا نہیں۔ بلکہ وہ شخص زیادہ عالم ہوتا ہے جو اپنی مادری زبان میں کسی علم کو حاصل کرتا ہے یا کسی چیز کو پڑھتا لکھتا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ سائینس اور ٹیکنالوجی میں ہمارا ہندوستان بہت سے ممالک سے پیچھے ہے۔ اس کے مقابلے میں چین بہت آگے ہے۔ کیونکہ چین میں جدید ٹیکنالوجی اس کی اپنی مادری زبان میں ہے وہ مسائل کو سمجھتے ہیں صرف ہوجاتا ہے، بات کی تہ تک پہنچنا مشکل ہوجاتا ہے۔ یور پین ممالک اس لئے بھی ہم سے ترقی یافتہ ہیں کہ ان کا ذریعہ تعلیم ان کی مادری زبان ہے۔ اس سوچ نے بھی اُردو کا ذوق رکھنے والوں کو اُردو سے دور کر دیا ہے۔ ایسے مرض میں مبتلا لوگ اُردو میں خطوط نگاری یا کوئی تحریر پیش کرنے میں شرمندگی محسوس کرتے ہیں۔ جب کہ تاریخ گواہ ہے کہ اکثر ہندوستان کے کامیاب اور رہنما لوگ یا وہ ہندوستان کی بری شخصیات جنھوں نے دنیا بھر اور خاص طور پر ہندوستان کے لوگوں کے دلوں میں بلند مقام بنایا ہے ان میں اکثر ادیبوں، شاعروں اور رہنماؤں نے اُردو زبان میں پڑھا لکھا ہے۔ خواہ آپ میر کا نام لیں یا غالب کا، یا ابوالکلام آزاد کا یا سر سید احمد خان کا یا حالی کا منشی پریم چند، اقبال، سجاد ظہیر، قرۃ العین حیدر، فیض احمد فیض، سجاد ظہیر قدرت شباب وغیرہ آج کے دور میں بھی دیکھیں سید محمد اشرف، شوکت حیات گوپی چند نارنگ۔ شمس الرحمٰن فاروقی وغیرہ جن کی ملازمت کا فیلڈ اور ہے گیانی، ادبی میدان اُردو۔

۱۱۔ شعر وسخن میں استاد شاگرد اصلاحی روایت کا فقدان بالخصوص مراسلاتی اصلاح:

کلاسیکی اردو عہد اور جدید اُردو شعر وسخن کے زمانے میں نو وارد ستو سخن کی وادیوں میں قدم رکھنے والے طلبا یا شعرا۔ اپنے زمانے کے شعر وسخن کے متند معتبر استاد سے

اصلاح لیا کرتے تھے۔نو وارد شاعروں کی اکثر تعداد ایسی ہوا کرتی تھی جو خطوط نگاری کے ذریعے اصلاح لیا کرتی تھی ۔ ذوق ، غالب ، فاسخ ،آتش ، حالی ، داغ ، سرسید شبلی نعمانی ، ابولکلام آزاد اور اقبال وغیرہ یہ ایسے شاعر اور دانشور تھے جو شعر سخن اور نظریہ ادب پر اجلاس کیا کرتے تھے۔یہی وجہ تھی کہ اس زمانے میں معتبر اور استاد شاعر بن کر ابوا کرتے تھے۔آج کا زمانہ ایسا ہے الا ماشااللہ ، متشاعر میر ، غالب ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں انہیں اصلاح لینے کی ضرورت ہی نہیں ۔ جب اصلاح و مشورے کی ضرورت نہیں تو پھر خطوط نگاری کی ضرورت کیوں پیش آئی گئی ۔ہاں بسا اوقات واٹس ایپ اور فیس بک وغیرہ یہ اپنے قافیہ ردیف اور پہلیاں چڑھادی جاتی ہیں ۔جس پر چند فیس بک اور انٹرنیٹ کی دنیا کے لوگ واہ واہ خوب خوب کہہ دیتے ہیں جس سے وہ اپنے گمان فاسد میں میر اور غالب سے بھی بڑے شاعر بن جاتے ہیں ۔ ادبی اصلاحوں پر مشتمل چند خطوط کے مضمون یہاں ذکر کر دیتا ہوں جس سے ادبی اصلاحوں پر لکھے جانے والے خطوط کی اہمیت اور ضرورت واضح ہوسکتی ہے۔غالب کا اصلاحی خط ملاخطہ ہو۔

> ’’یہاں صاحب ، کیا چاہتے ہو؟ تم میرے ہم عمر نہیں جو سلام لکھوں ، میں فقیر نہیں جو دعا لکھوں ۔تمہارا دماغ چل گیا ہے۔لفافے کو پیدا کرو،مسودہ کو بار بار دیکھا کرو، پاؤ گے کیا؟ یعنی تم کو وہ محمد شاہی روشیں پسند ہیں!‘‘ یہاں خریت ہے،وہاں کی عافیت مطلوب ہے۔خط تمہارا بہت دنوں کے بعد پہنچا۔جی خوش ہوا۔مسودہ بعد اصلاح بھیجا جاتا ہے۔ برخودار میر سرزاز حسین کو دینا اور دُعا کہنا اور وہاں حکیم میر اشرف اور میر افضل علی کو بھی دعا کہنا۔لاذمہ سعادت مندی یہ ہے کہ ہمیشہ اسی طرح

خط بھیجتے رہو''۔

(بحوالہ محاسن خطوط غالب؟ ڈاکٹر غلام حسین ذو لفقار ۳۴)

میر مہدی کے نام خط لکھتے ہیں جس میں خطوط نگاری میں زوائد کے ذکر پر تنقید کر کے اصلاح اس طرح دیتے ہیں:

''میوں، سچ کہو، اگلوں کے خطوط کی تحریر کی یہی طرز تھی یا اور؟ ہائے کیا اچھا شیوہ ہے۔ جب تک یوں نہ لکھوں، وہ خط ہی نہیں ہے۔ چاہ بے آب ہے، ابر بے باراں ہے، نخل بے میوہ ہے، خانہ بے چراغ ہے، چراغ بے نور ہے۔ ہم جانتے ہیں، تم زندہ ہو، تم جانتے ہو، ہم زندہ ہیں۔ امر ضروری لکھ لیا، زوائد کو اور وقت پر موقوف رکھا۔ اور اگر تمہاری کوشنودی اسی طرح کی نگارش پر منحصر ہے، تو بھائی ساڑھے تین سطریں ویسی بھی میں نے لکھ دیں''

خط بنام میر مہدی مجروح، ۱۶ مئی ۱۸۶۴ء خطوط غالب، صفحہ ۸۔۱۳ بحوالہ محاسن خطوط غالب،

شعر کا تجزیہ کرو۔ ''بساط عجز'' کی جگہ کون سی ترکیب استعمال کی جائے؟ ''بہ انداز چکیدن''، بمعنی ''ٹپکنے کی ادا'' یا ٹپکنے کے انداز سے'' لکھا جائے تو مصرع یوں ہوگا۔۔ ہو رہتا ہے ٹپکنے کی ادا سے سرنگوں وہ بھی'' مصرع آسان ہو گیا لیکن کوئی اسے اردو ادب کا شاہکار نہیں کہے گا۔ کسی لفظ یا ترکیب کو بدل کر دیکھ لیجئے۔ مصرع ''پست'' ہو جائے گا۔

تمارا مطلع ہے

سیلاب کی صورت مرے خامے کا جگر ہے

الفاظ کی کشتی میں تخیل کا سفر ہے

بین المتن غور کریں تو سیلاب، خامے کا جگر، الفاظ کی کشتی، اور تخیل کا سفر کلیدی الفاظ یا کرکیبیں ہیں۔ ان کو مدنظر رکھتے ہوئے لفظی ترجمہ یوں ہوگا کہ جگر خامہ ایک سیلاب کی طرح ہے۔ تخیل اس میں لفظوں کی کشتی لے کر آمادہ سفر ہے۔ معنی آفرینی ایک سیلاب کی طرح ہے۔ تخیل اس میں لفظوں کی کشتی لے کر آمادہ سفر ہے۔ معنی آفرینی کی کوشش ہے لیکن معنوی طور پر غور کریں تو ''خامے کا جگر'' پر نگاہ مرتکز ہوتی ہے۔ لفظ ''جگر'' ظرفیت کا طالب ہے اور ''سیلاب'' کیفیت کا نام ہے۔ لہذا سیلاب نہیں سمندر کا محل ہے۔ دوم یہ کہ ''سیلاب'' ایک ہیجانی اور ہنگامی کیفیت ہوتی ہے جہاں امن و یناہ کا گذر نہیں ہوتا۔ سیلاب کے سفر میں سلامت روی کا امکان کم سے کم رہتا ہے۔ دریں حالت ''مسافر'' یعنی ''تخیل'' کا خانہ خراب ہوسکتا ہے۔ خطروں میں کھیلنا دل گردے کا کام تو ہے لیکن چھکے چھوٹ سکتے ہیں۔ مسافر ڈوب سکتا ہے۔ گمگشتہ راہ ہو سکتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ گویا کہ ''سیلاب'' لفظ فٹ نہیں ان فٹ ہے۔

فنی زاویے سے غور کیا جائے۔۔۔۔ اوپر مطلعے پر نظر جماؤ۔ دیکھو ''کا جگر'' ''کا سفر'' آئے ہیں۔ بادی النظر میں یہ پورا ٹکڑا ردیف معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ٹکڑے کے پیچھے میں ''قاضیہ'' سفر اور جگر ہے لہذا ا ردیف ہو نہیں سکتا گویا کہ مصرعوں میں ایک ہی مقام پر ''کا'' کی تکرار عجیب دار ہے۔ دوسرے مصرعے میں لفظ ''کی کشتی'' کے دونوں متصل کاف صوتی تناخر پیدا کرتے ہیں۔ جو روانی میں حارج ہیں۔ ''خامے کا جگر'' بہت اچھی ترکیب نہیں ہے بلکہ ''خامے کا ہنر'' اس سے اچھی ہے۔ اس سے ظرفیت والی چیز ختم ہوگئی۔ ہنر اور سیلاب دونوں کیفیت کے مظہر ہیں۔ مطلع یوں ہوسکتا ہے۔ شعر بتکرار بسا اوقات اصلاح کی راہیں کھل جاتی ہیں۔ جس قدر غور کرو گے نئی نئی دنیا نظر آئے گی۔ تخلیق کا عمل بڑا عجیب وغریب ہوتا ہے۔ دوران تخلیق یا مابعد تخلیق شعر اچھا

لگتا ہے لیکن دھیرے دھیرے حسن زائل ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور یہی چیز تخلیق کے امکانات کو روش کرتی ہے۔ ورنہ خلافیت میں جمود پیدا ہو جائے گا۔

۲۔ خط بھی لکھا کرو تو اطمینان سے۔ سوچ سوچ کر۔ جملے چھوٹے لیکن جامع۔ بات سلیقے سے۔ ادبی نکات۔ علمی گفتگو پوری صوابدید کے ساتھ کہ یہی تحریریں تاریخ کا حصہ بنتی ہیں۔ اگر ضائع نہ ہو جائیں تو مکاتیب مشاہر۔ خطوط غالب، مکتوب آزاد، مکاتیب شبلی وغیرہ اسی عرق ریزی اور حزم واحتیاط کی دین ہیں۔ اور تحریر بھی صاف اور خوش خط ہونی چاہیے۔

مرتبہ ڈاکٹر شمس کمالی انجم۔ حرف آخر 1۔ تا ۵

ن۔ م راشد کا ایک خط جو آغا عبدالمجید کے نام ہے اس کا ایک اصلاحی اقتساب ملاحظہ کریں:

''میری نظم'' دریچے کے قریب'' کے بارے میں تمہاری تنقید خوب دل چسپ ہے۔ میں نہیں جنتا کہ میں اس ابہام کو کیسے دور کروں جو روز بروز میری شاعری میں پیدا ہو رہا ہے۔ تم نے پچھلے دنوں Aldous Huxley کے حوالے سے۔ ابہام کی مسات فسموں'' کا ذکر کر کے میری حوصلہ افزائی کر دی تھی۔ لیکن میرے خیال میں اب اس بارے میں میری حوصلہ شکی درکار ہے۔ میرے اکپر دوستوں نے جھنیں میں نے اس نظم کی نقلیں بھیجی تھیں۔ خیالات کے تسلسل کو نہ پا کر مجھے مایوس کر دیا ہے۔ ''شمع شبستان وصال'' بالکل ناگزیز تھا اس لئے کہ اس میں میں نے یہ تاثر پیدا کرنا چاہا ہے۔ کہ نظم کے'' واحد متکلم'' اور اس کی محبوبہ کی رات مل کر گزری ہے۔ اس کے بعد کے دونوں مصرعے فوراً وصال کی لذت کو واضح کرتے ہیں۔ گویا ترکیب الفاظ ایک حد تک عاحیانہ ہے لیکن اس کے بغیر رفعت ہماری گذری ہوئی عظمت کا نشان ہی، فطرت انہیں ہر صبح چومتی ہسی لیکن انھیں کے نیچے ایک نہاں خانوں کا باشندہ پڑا ہے جو ہماری

گذشتہ تین سو سال کی ذلت کا جیتا جاگتا نشان ہے۔شاید ایک حد تک اس باعث بھی بازار میں لوگوں کے سیل کے سیل آتے جاتے ہیں۔ان میں ہر شکص کے اندر خودی ہے لیکن نا توں اس میں بھی پیٹ کے چکر میں متبلا ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس ذلت کا ابھی کوئی مداوا نہیں جس بے بسی سے ہر صبح شروع ہوتی ہے اسی بے بسی کے ساتھ شام ہو جاتی ہے۔دنیا ایک گھومتا ہوا چکر ہے۔(چرخ گرداں ہے جہاں)اور ہم اس چکر میں متبلا (آل انڈیا ریڈیو دہلی ۱۳ اگست ۱۹۳۹ء۔بحوالہ ن۔م راشد ایک مطالعہ، مرتبہ:ڈاکٹر جمیل جالبی)۔(سہ ماہی اردو ادب،انجمن ترقی اردو ہند یہاں میرا موضوع ہے خطوط نگاری کی ختم ہوتی روایت کے اسباب مذکورہ خطوط کے پیش کرنے سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خطوط کی اہمیت کیا ہے یا خطوط کیوں ضروری ہیں بادی النظر میں یہی لگ رہا ہے اور یہ صحیح بھی ہے اس سے یہ امر ثابت ہوتا ہے،لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جب ہم استاد اور شاگرد کی اصلاحی روایت کو پسِ پشت ڈال دیں گے تو پھر ہماری تخلیقات کا یہی حال ہوگا۔یہ بات بادی النظر میں ٹھیک ہے بعض تخلیق کار وائس ایپ، فیس بک یا دیگر جدید سوشل میڈیا کے ذرائع کو کام میں لا کر ہلکی پھلکی اصلاح لی جا سکتی ہے لیکن یہ اصلاح تخلیقات کو فن پارہ یا شاہکار بنانے میں مکمل نہیں ہو سکتی۔کیوں کہ تخلیق پر کئی کئی بار تنقیدی نظر ڈال کر غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے اور اس اصلاح کا بہتر طریقہ خطوط نگاری کے ذریعہ بہتر نتائج لا سکتا ہے۔سستی شہرت کی خواہش میں ہم کسی مستند استاد کی اصلاح نہیں لیتے ہیں بلکہ شعر و سخن کی پہلی مشق سے ہی کسی علاقے کی کیا بلکہ ریاست یا ملک کی پہنچان بن جاتے ہیں۔ادبی صلاح کے فقدان کی وجہ سے بھی خطوط نگاری کی روایت کو بہت نقصان پہنچا ہے۔

۱۲۔نظریہ ساز دانشوروں،فن کاروں،نقادوں،حساس اور ہمدرد رہنماؤں کی کمی بھی خطوط نگاری میں حارج ہے۔اگر ہیں تو خود غرضی،یا اپنی ذات کے خول میں سمٹے

ہوئے ہیں اور اپنی سماجی، معاشرتی، اصلاحی، ادبی اور فلاحی ذمہ داریوں سے دست بردار ہو چکے ہیں۔ اگر ان میں سے بعض کچھ کرنے کی خواہش رکھتے بھی ہیں تو ان جیسے دوسرے نظریہ ساز یا ان سے کم درجے ان بڑوں کو مانتے ہی نہیں، یا دوسروں کے نظریوں کو دھوکر اپنا بنانے والے لوگ رہنمائی کے زیادہ متمنی رہتے ہیں لیکن اہل علم و نظر ان کو سر پہ بٹھانا نہیں چاہتے۔ یہ آخری اسباب تو ایسے ہیں کہ ان سے صرف اُردو خطوط نگاری کی روایت ہی کو نقصان نہیں پہنچا بلکہ ہر زبان میں خطوط نگاری کے گراف میں گراوٹ آئی ہے۔ خطوط نگاری کی روایت میں بعض ایسے نظریہ ساز دانشور رہنما گذرے ہیں۔ جن کے یہاں خلوص و ہمدردی کے ساتھ اصلاح اور مشورے کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ دو چند یہاں پیش ہیں۔

سر سید نے جہاں مختلف علوم وفنون پر توجہ دلائی وہیں اپنی زبان کے فروغ، ترویج اور اشاعت کی جانب بھی دعوت دی۔ اور اپنی زبان کی طاقت کی طرف اشارہ کر کے کامیابی کی راہ دکھائی۔ راجہ کشن داس کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اے ہندوستان کے بھلائی چاہتے والو تم کسی سے توقع مت رکھو اور خود اپنے بھروسے اور آپس کے چندہ سے ملک میں تمام علوم اعلیٰ درجہ سے ادنیٰ درجے تک اپنی زبان میں پھلاؤ، پھر جب تمام علوم سے واقف ہو جاؤ گے اور شائستگی و تربیت تک پہو نچو گے تمہاری نگاہ میں گورنمنٹ کی نوکریوں کی لالچ کی کچھ بھی حقیقت نہیں معلوم ہو گی''

علامہ اقبال نے زبان کے حوالے سے جو مکتوب لکھے وہ بھی قابل تقلید ہیں۔ ان سے لسانی اور ادبی امکان کے در کھلتے ہیں، وقت اور زمانے کے تغیر کے ساتھ ساتھ زبان میں جزوی ترمیم اور اس کے دامن کے پھیلاؤ کے امکان نظر آتے ہیں۔ کشادہ

ظرفی اور نئے امکانات خیر مقدم نظر آتا ہے۔ اقبال 19 اگست 1923ء کو سردار عبدالرب خاب نشتر کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''زبان کو میں ایک بت تصور نہیں کرتا، جس کی پرستش کی جائے، بلکہ اظہار مطلب کا ایک انسانی ذریعہ خیال کرتا ہوں۔ زندہ زبان انسانی خیالات کے انقلاب کے ساتھ بدمستی رہتی ہے۔ اور جب اس میں انقلاب کی صلاحیت نہیں رہتی تو مردہ ہو جاتی ہے''

اس دور میں ایسے نظریہ سازون کی کمی کی وجہ سے خطوط نگاری کے عمدہ نمونے بھی وجود میں نہیں آتے۔ کیوں کہ عصر رواں میں اکثر دانشور اس مزاج کے ہیں اگر نٹشے نے کہہ دیا ہے کہ خدا مر چکا ہے، تو وہ اپنے مضمون یا اپنی کتابوں کو اسی نفسیاتی مطالعہ کی بنیاد پر یہ کہہ دیا ہے آدمی آزاد پیدا ہوا ہے۔ اور کوئی بھی پابندی اس پر عاید نہیں ہوسکتی آدمی اپنی ہر نفسیاتی خواہش یا ڈیزائر کے پورا کرنے میں آزاد ہے۔ اگر وہ اپنی ہر خواہش کی تکمیل کرسکتا ہے تو وہ آزاد رہے ورنہ نہیں۔ ہمارے یہاں اس قسم کے نظریوں کا دلیل کے ذریعہ رد نہیں ہوتا بلکہ ہم اُسی کو من وعن تسلیم کرکے اُس کے تابع ہو جاتے ہیں۔ ایسے مقام پر ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ اگر ہر خواہش کی تکمیل کا نام ہی آزاد انسان ہے تو پھر انسان ااور جانور کا امتیاز کیا ہے؟ دوسری طرف ہم انسان کیلئے تہذیب، اعلا اقتدار اور مہذہب ہونے پر زور بھی صرف کر دیتے ہیں لیکن ہم اس وقت اس حقیقیت سے فرار اختیار کر لیتے ہیں کہ آدمی اپنے سماج اور معاشرہ کی اعلیٰ قدروں کے بغیر انسان نہیں بن پاتا جب کہ جانور کا کوئی مذہب سماج یا معاشرہ نہیں ہوتا۔ ایسے موقعوں پر ہم صرف اتنی ذمہ داری خیال کرتے ہیں کہ۔ ہم اس نظریہ کا ایک اقتباس اپنے مضمون میں پیش کرکے باصلاحیت ہونے کے زعم میں گم ہو جاتے ہیں۔

یا اگر کوئی دانشور اپنی رائے یا نظریہ دینا بھی چاہتا ہے تو وہ الکٹرانک میڈیا کے ذریعہ انٹرویو۔ڈیبیٹ یا شوشل میڈیا کے ذریعہ اپنی رائے شیر کردیتا ہے۔جوزوراس بھی ہے اور جلدی شہرت کا ذریعہ بھی۔شاید وہ اپنی رائے ،مشورہ یا اصلاح اور نظریہ خطوط نگاری کے ذریعہ پیش کر کے اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔

۱۳۔فرشتہ صفت خود کو ظاہر کرنے کی خاطر مکتوب نگاری سے دوری اختیار کرنا:۔

کہا جاتا ہے یہ خطوط نگاری دلی مدعا کے اظہار ایک حسین ترین ذریعہ ہے۔اس میں انسان ایک ایسے صاف وشفاف آئینے کے سامنے ہوتا ہے جس کا ظاہر سے زیادہ باطن جھلک کر سامنے آتا ہے یہ قول مولوی عبدالحق ''یہاں کوئی غیرت باقی نہیں رہی بلکہ بسا اوقات دوئی کا پردہ اٹھ جاتا ہے۔وہ ہر مسلہ اور ہر شئے سے متعلق جیسا اس کا خیال ہوتا ہے صاف صاف اور سچے سچے لکھ دیتا ہے، وہ اپنی رائے میں آزاد ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ خطوط سے۔انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے، وہ کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں ہوسکتا۔''

لیکن آج کل کے زمانے کا انسان اپنے باطن کے ساتھ ظاہر ہونا ہی نہیں چاہتا بلکہ جتنی مبالغہ امیز تعریفیں کردی جائیں اتنا ہی خوش ہوتا ہے۔آج کا انسان ایسا معمہ اور پر پیچ شئے بن چکا ہے جس کے ایک چہرے کے پیچھے ہزار چہرے ہیں ہاں مگر وہ مکتوب نگاری کے دائرے میں محصور ہوگا تو پھر اس کا باطن جھلکنے لگے گا۔اصلیت واضح ہوجائے گی۔اس وجہ سے بھی خطوط نگاری کی روایت متاثر ہوتی چلی جارہی ہے۔ایک بہترین ادیب، محقق اور مخلص دانشور کا ایک خط یہاں پیش کرتا ہوں جس کا ظاہر اس کے باطن کے مطابق معلوم ہوتا ہے، اس خط کو ملاحظہ کرنے کے بعد یہ سمجھ میں آ سکتا ہے کہ آج کا آدمی کس طرح ظاہر اور باطن کے تضاد کا اشاریہ ہے۔بابائے اردو مولوی عبدالحق قدیم ہندوستانی روایات اور مشرقی تہذیب کے پروررہ تھے۔دردمندوں کا

احساس اور حاجت روائی کا جذبہ ان کے ضمیر میں شامل تھا۔ ہمدرد اور حاجت روائی میں کسی مذہب وملت کی تخلصیص کے بغیر سید ساحد علی کو ایک خط لکھتے ہیں:

یہ لڑکا (درخواست گذار) اس وقت بہت مشکل میں ۔
سارے خاندان کا بار اس پر آپڑا ہے اور یہ برہمن ہے اور کوئی
ذریعہ معاش نہیں ۔آپ سید ہیں اور یہ برہمن ہے اُمدی ہے کہ
آپ اپنے ہم پیشہ کی دستگیری میں دریغ نہ فرمائیں گے''
(خطوط عبدالحق 135ء)

واقعہ یہ ہے کہ یہ مکاتیب کردار وشخصیت شناسی کا اہم ذریعہ ہیں ۔ان میں قومی ، سیاسی ، معاشرتی ، معاشی ، تاریخی ، ادبی اور تہذیبی زندگی کی جھلک صاف طور پر دکھائی دیتی ہے ۔آج بھی اگر شخصیتوں پر پردہ نہ ڈالا جائے تو خطوط نگاری کے ذریعہ فرد کے ظاہر وباطن کو جانا جاسکتا ہے۔

۱۴۔خطوط کی تکنیک یہ ناول ،افسانہ نگاری اور خودنوشت کے وجود نے بھی مکتوب نگاری کے دامن کو سمیٹا ہے:۔

جب نثر میں ناول ، افسانہ وغیرہ نہیں تھا صرف شاعری اعلا مقام رکھتی تھی خاص طور پر غزل ، غزل کا طرہ امتیاز یہ ہے کہ ہر شعر الگ ایک اکائی ہے اور امز وایما سے عبارت ہے جس میں تشفی بخش اور واضح طور پر کوئی فن کار اپنے حالات وواقعات بے تکلفی کے ساتھ پیش نہیں کرسکتا تھا اور اس وقت فن کاروں نے اپنے مصائب ، دکھ ، درد اور اپنے احوال اپنے احباب تک نہ پہنچا سکے تو خط کی تکنیک میں انشایئے لکھتے رہے جیسے مولانہ عبدالکلام آزاد نے ''غبار خاطر'' کا نمونہ اردو ادب کو دیا ہے ۔جس کو ناقدین مکتوب الیہ کے نام ٹا نگنے کی وجہ سے خطوط میں شمار کرتے ہیں ۔ بعد میں یہی طرز ترقی کرتے ہوئے خطوط کی تکنیک میں ناول اور افسانہ نگاری کی شکل اختیار کرگیا

۔ چنانچہ قاضی عبدالغفار نے ''لیلیٰ کے خطوط'' جیسی تخلیق پیش کی جسے ناول کے ذیل میں رکھا جاتا ہے۔اسی طرح بعض فکشن نگار نے جو افسانے یا ناول کے اجزائے ترکیبی جیسے فارمولوں پر بھروسہ نہیں رکھتے انہوں نے خطوں کو افسانے یا ناول کی صنف کے طور پر استعمال کیا ہے۔ایسی بے شمار کہانیاں رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔علاوہ ازیں بڑے شاعر یا دیب جو اپنے احوال خطوط میں لکھتے تھے وہ احوال وہ اپنی خود نوشت میں درج کر دیتے ہیں اس طرح بھی خطوط نگاری کا دامن تنگ ہوتا چلا آیا ہے ۔۔لیکن پر لطف بات یہ بھی ہے کہ بعض جہتوں میں خطوط نگاری میں اضافہ بھی ہوا ہے، اگر کوئی شاعر، ادیب یا رہنما اپنی سستی شہرت اور اہمیت کا متمنی ہوتا ہے تو وہ اپنے حواریوں یا خود ہی اپنی شان میں یا اپنے فن پر نثری یا شعری قصیدہ نگاری یا خطوط لکھ کر دوسروں کے نام منسوب کر کے شائع کروا دیتا ہے۔

۱۵۔جدید ٹیکنالوجی کے سبب بات چیت، پیغام رسانی کی برقی سرعت اور دیدار کے جدید آلات کی فراہمی :۔ یہ ایسے اسباب وعوامل ہیں (یا ان جیسے اور بھی ہو سکتے ہیں) جو خطوط نگاری پر عمومی طور پر اور اردو خطوط نگاری پر خصوصی طور پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوئے ہیں۔

خط کا بنیاد تقاضا ہے مطلب نویسی ، ادارے مطلب ، پیغام رسانی ، ادارے مطلب کے اسلوب میں ایک تو سادگی ہونا چاہیے اور دوسرے پیغام رسانی میں برقی سرعت ۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ انسان اسی تکنیک یا اسی آلہ کو پیغام رسانی کیلئے کام میں لانے کی کوشش کرتا ہے جس میں سب سے زیادہ سرحت اور پرائیویسی ہے ۔ عصرِ رواں کا پیغام رساں نظام اکثر برقی شعاؤں پر منحصر ہے ۔ٹیکنالوجی کی وجہ سے بھول خواجہ اکرام ''ہر لحظ نیا طور نئی برقی تجلی'' ہے زمانے کی ترقی کی رفتار کا عالم یہ ہے۔ اس رفتار کی سرعت کو دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ اس کی رفتار صدیوں کی رفتار سے بھی تیز تر

ہے۔کل جو پیغام سالوں ،مہینوں یا ہفتوں میں اپنی منزل تک پہنچتا تھا آج وہ لمحہ کے اندر پیام الیہ تک جا پہنچتا ہے۔ بلکہ بسا اوقات تو لگتا ہے لمحے کو پیغام اپنی منزل طے کرنے میں بھی پیچھے چھوڑ دیتا ہے،مکتوب سے زیادہ برق رفتاراوراثر انداز فون ویڈیو کانفرنسنگ اور ایمووغیرہ دیتا ہے،مکتوب سے زیادہ برق رفتاراوراالگ اندازفون ویڈیو کانفرسنگ اورایموو غیرہ سے پیغام دینااور بات کرنا ہے کیوں کہ یہاں بات کی لذت سے بھی انسان محفوظ ہوتا ہے اور دیدار کی نعمت سے بھی آنکھیں ٹھنڈی ہوئی ہیں۔ کیونکہ اظہارمطلب اور جذبات کی اولین شکل تو بولی یالفظ ہے۔۔۔اگرایک گاؤں کی عورت کل تک اپنے پردیسی ساجن کوڈاک گھر کے باہر بیٹھے ہوئے عرضی نویس سے اپنا مدعالکھواناتھی۔ پھر پردیسی ساجن بھی اُسے ڈاک کے بابو یا کس پڑے لکھے سے پڑھوا کرسنتا تھا،جس میں صرف ایک جامد پیغام ہی گاؤں کی عورت کا اپنے پردیسی ساجن تک پہنچتا تھا لیکن آج کے ان جدید ذرائع سے تو عورت اپنے خیالات اور جذبات کا اظہاراپنے پردیسی ساجن کے ساتھ ہزار گنا بہتر طریقے سے کرتی ہے، کیونکہ یہاں جذبات کا فطری اظہار بھی ہےاور دیدار کا لطف بھی۔ برقی نظام کی تیزی رفتاری کا تو اندازہ لگانا ہی مشکل ہے۔لیکن اس برقی نظام میں بعض انٹرنیٹ کے ایسے اسلوب اور تکنیکیں موجود ہیں جومکتوب نگاری کے قائم مقام کے طور پر کام کررہے ہیں ۔ایک تو ای۔میل۔کی تکنیک ایسی ہے جس کومکتوب نگاری کے قائم مقام مانا جاسکتا ہے۔اور دوسرا''بلاگ نگاری''اور لینگڈ (Linked) ہے جس کے ذریعہ انسان عالمی سطح پر جس دانشور سے چاہے جڑ سکتا ہے۔اس بلاگ نگاری'' کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ غالب نے کہا تھا کہ''میں نے مراسلہ کومکالمہ بنادیا ہے'' بلاغ نگاری، میں بھی ہے کہ مراسلہ کی خصوصیت سے زیادہ مکالمہ نگاری، کا وصف موجود ہے۔ بلاگ نگاری کے مقالمہ کے حوالے معادر

ا۔ سرماہی اُردوادب سردار جعفری کے خطوط	انجمن ترقی اُردو ہند
۲۔ محاسن خطوط غالب۔	ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار
۳۔ خطوط بنام سرسید	محمد اسمائیل پانی پتی
۴۔ سعادت حسن منٹو کی مکتوب نگاری	تنویر احمد ملک
۵۔ ولی اللہ دہلوی کی سیاسی مکوبات	خلیق احمد نظامی
٦۔ مکتوبات اردو کا ادبی وتاریخی ارتقاء	خواجہ احمد فاروقی
۷۔ اردو معلیٰ	غالب
۸۔ حرف آخر (غیر مطبوعہ)	ڈاکٹر شمس کمال انجم
۹۔ پروفیسر خواجہ اکرام	اردو زبان کے نئے تکنیکی وسائل اور امکانات

سعادت حسن منٹو کی خطوط نگاری ایک جائزہ

ڈاکٹر جاوید اقبال
اسسٹنٹ پروفیسر
گورنمنٹ پی۔جی۔کالج، گاندھی نگر، جموں

سعادت حسن منٹو نے اپنی زندگی میں متعدد خطوط اپنے احباب، عزیزوں اور رفقاء کو لکھے، ان میں سے چند اہم خطوط منظر عام پر آئے ہیں۔منٹو کے وہ خطوط جو انھوں نے مشہور شاعر اور افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی کو لکھے ہیں خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے خطوط کا مجموعہ ''منٹو کے خطوط'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ یہ اُردو مکاتیبی ادب میں بڑا اہم مجموعہ ہے۔سعادت حسن منٹو کی مختصر سی زندگی بیالیس سال آٹھ ماہ چار دن پر مشتمل ہے۔منٹو نے اس مختصر سی زندگی میں اردو ادب میں اعلیٰ مقام حاصل کیا۔اردو ادب میں ان کی شہرت نہ صرف ان کی افسانہ نگاری کی وجہ سے ہے بلکہ ڈراما نگاری، خاکہ نگاری، مضمون نویسی اور مکتوب نگاری میں بھی منفرد و اعلیٰ مقام حاصل کیا ہے۔منٹو کی عظمت کا راز ان کی زندگی میں ہی تسلیم کر لیا گیا تھا۔وفات کے بعد ان پر بہت زیادہ تحقیقی کام ہوا اور آج بھی جاری و ساری ہے۔منٹو کی شہرت میں بہت زیادہ اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ اردو شاعری کا نام جب ہم لیتے ہیں تو ہماری نظر مرزا غالبؔ کی طرف جاتی ہے۔اسی طرح سے اردو فکشن کا نام لیا جائے تو ہماری نظر منٹو کے افسانوں اور خطوط کی طرف راغب ہو جاتی ہے۔

ان کے افسانوں کی طرح ان کے خطوط بھی اعلیٰ پایہ کے ہیں ۔اُردو ادب کے اندر منٹو کی خط و کتابت کا آغاز اس زمانے سے ہوتا ہے جب منٹو نے ۸ جنوری ۱۹۳۷ء میں اختر شیرانی کو ایک خط لکھا، اسی خط سے منٹو کی خطوط نگاری کا آغاز ہوتا ہے اور یہ سلسلہ اس وقت بند ہو جاتا ہے جب انھوں نے ۱۷ جنوری ۱۹۵۵ء کو اپنی موت سے ایک دن پہلے مہدی علی خان کو سفارشی خط ارسال کیا تھا۔ سعادت حسن منٹو نے زیادہ تر خطوط مشہور و معروف افسانہ نگار اور شاعر احمد ندیم قاسمی کو لکھے ہیں ۔منٹو اور احمد ندیم قاسمی کے بیچ خط و کتابت کا آغاز جنوری ۱۹۳۷ء میں شروع ہوتا ہے اور اختتام ۱۹۴۸ء میں ہوا، یعنی ان کی خط و کتابت کا وقت گیارہ سال پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد ۱۹۵۵ء تک منٹو نے جن دوسرے دوستوں کے نام خطوط لکھے ان میں عبدالوحید، محمد طفیل، ہاجرہ مسرور، محمد یوسف، ممتاز شریں، ڈاکٹر محمد باقر، عزیز احمد، نصیر انور، مہدی علی خان، عصمت چغتائی اور پنڈت جواہر لال نہرو وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان کے ساتھ منٹو نے لگاتار خط و کتابت کا سلسلہ نہیں رکھا جیسا احمد ندیم قاسمی کے ساتھ رکھا تھا۔ بلکہ ان کے نام منٹو نے صرف ایک دو خطوط لکھے ہیں ۔منٹو نے پچیس سال کی عمر میں پہلا خط لکھا اور آخری بیالیس سال کی عمر میں اس وقت لکھا جب برصغیر کے طول و عرض میں ان کے نام کا ڈنکا بج رہا تھا۔ تقسیم وطن کے بعد منٹو پاکستان چلے گئے تھے۔ منٹو اور احمد ندیم قاسمی کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ بڑے دلچسپ انداز سے شروع ہوتا ہے ۔منٹو کے دوست اختر شیرانی جو ایک مشہور شاعر بھی تھے ان دنوں ایک رسالہ ''رومان'' کے نام سے نکالتے تھے، اور ہر شمارے کی ایک کاپی منٹو کے نام بھیجتے تھے، منٹو ان دنوں امپیریل کمپنی میں کام کرتے تھے اور ہفتہ وار 'بمبئی' کے مدیر بھی تھے۔

> ''رومان'' کے جنوری ۱۹۳۷ء کے شمارے میں احمد ندیم قاسمی کا ایک افسانہ ''بے گناہ'' شائع ہوا تو منٹو کے ہاتھ لگ گیا۔

افسانہ پڑھ کر انھیں کافی پسند آیا۔انھوں نے اختؔر شیرانی کو خط لکھا اور احمد ندیم قاسؔمی کے بارے میں پوچھا،خط کا اقتباس ملاحظ فرمائیں:۔

'' 'افسانہ بے گناہ' بے حد پسند آیا اور یہی وجہ ہے کہ میں اس کے قابل مصنف جناب احمد ندیم قاسؔمی ۔بی ۔اے سے تعارف حاصل کرنا چاہتا ہوں برائے کرم پتہ بہ واپسی ڈاک مطلع فرما کر ممنوں فرمائیں۔''

(اسلم پرویز مرتب،آپ کا سعادت حسن منٹو،۲۰۱۲ء ص ۲۶)

اختؔر شیرانی نے احمد ندیم قاسمی کو خط لکھا اور کہا کہ منٹو کو خط لکھیں ۔احمد ندیم قاسؔمی نے منٹو کو خط لکھ کر دوستی کی بنیاد ڈالی ۔جو وقت کے ساتھ مضبوط ہوتی چلی گئی اور اس قدر مضبوط ہوئی کہ آخری دم تک برقرار رہی ۔اس طرح دو ادیب دوستوں کے درمیان خط وکتابت کا سلسلہ برقرار رہا۔اس خط کے ذریعے منٹو جہاں ایک طرف احمد ندیم قاسؔمی کو افسانہ لکھنے کی طرف آمادہ کرتے ہیں،وہاں دوسری طرف افسانہ لکھنے کے فن سے بھی آگاہ کرتے ہیں۔محمد اسلم پرویز منٹو کے دوستانہ تعلقات کے بارے میں روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''دوست بنانے اور دوستانہ نبھانے میں اٹوٹ یقین رکھنے والے منٹو کی جھلک ان کے خطوط میں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔کبھی وہ احمد ندیم قاسمی سے گیت لکھواتا تو کبھی فلمی گیتوں کے رموز سے آگاہ کرتا ہے۔کبھی فلمی تکنیک کے اسرار آشکار کرتا ہے،کبھی ریڈیو کے لیے opera لکھنے کی کوشش کرتا ہے تو کبھی مکالمے لکھنے کا فن اسے سمجھاتا ہے۔منٹو کے خطوط میں یہ ساری تفصیلات بھری پڑی ہیں۔یہی نہیں قاسمی صاحب کی کہانیوں کے مسودے صاف کرتا

ہے اور ان کی تحریروں کی نوک پلک سنوارتا ہے۔غرض یہ کہ اس
وقت منٹو ہمیں احمد ندیم قاسمی کی اسی طرح سے رہنمائی کرتا ہوا
دکھائی دیتا ہے جیسے باری علیگ نے اس کی رہنمائی کی تھی۔''
(اسلم پرویز، سعادت حسن منٹو، ص ۱۹)

خطوط کسی بھی فنکار کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل کو سمجھنے میں بہتر اور معتبر وسیلہ ہی نہیں بلکہ خود شخصیت کا آئینہ بھی ہیں، کیونکہ کوئی فنکار سیرت و شخصیت کو کسی اور طرح سے پیش نہیں کرسکتا، جیسے وہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کو لکھے گئے خطوط میں پیش کرتا ہے۔اسی طرح سے خطوط کے حوالے سے کسی بھی فنکار کی شخصیت اور اس کی ذہنی آویزیشوں کو سمجھنا نہایت ہی آسان ہے۔خطوط دوافراد کے درمیان ایک پیچیدہ گفتگو کے تحریری دستاویز ہے۔ یہ خطوط ان کی زندگی کے ظاہری اور باطنی آئینہ خانہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔منٹو وقتی طور پر مکتوب نگار نہیں تھے مگر جیسے انھوں نے احمد ندیم قاسمی کو لگاتار خط لکھے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ منٹو خط کا جواب بہت ہی مصروفیات کے باوجود بھی جلد دیا کرتے تھے۔منٹو کو اس بات کا ہمیشہ ڈر رہتا تھا کہ کب مر جاؤں کیونکہ اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی وہ اپنی زندگی کو ادھورا سمجھتے تھے اور ان کو خوب سے خوب تر کی تلاش تھی۔ان کو خود کے مرنے کا ڈر نہیں تھا بلکہ سوچتے تھے کہ میرا کام ادھورا رہ جائے گا، منٹو کے حالات بھی علامہ اقبال کی طرح کے ہیں:۔

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

منٹو کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ اللہ ان کو زندگی بخشے تاکہ وہ اپنے کام کو پائے تکمیل تک پہنچا سکے، ان کے خطوط کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

''اگر کوئی صاحب میرے ساتھ وعدہ کرے کہ وہ میرے

دماغ کے سارے خیالات نکال کر ایک بوتل میں ڈال دے تو منٹو
آج مرنے کو تیار ہے۔منٹو،منٹو کے لئے زندہ ہے مگر اس سے کسی کو
کیا۔منٹو ہے کیا بلا چھوڑو اس فضول قصے کو کوئی اور باتیں کریں۔''
(اسلم پرویز از سعادت حسن منٹو،ص ۵۹)

اگر چہ منٹو کی شخصیت ان کے افسانوں،خاکوں اور ڈراموں میں مختلف صورتوں میں جگمگاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔مگر ان کے خطوط سے جو شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے وہ بالکل مختلف ہے،منٹو کی زندگی کے بہت سے پہلو ہمیں ان کے خطوط میں نظر آتے ہیں۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کے ان کے خطوط نجی ہیں۔ان کے خطوط کے مطالعے سے ان کی زندگی کی عکاسی ہوتی ہے۔اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ منٹو کو یہ پتہ ہوتا کہ ان کے خطوط شائع ہوں گے تو وہ راز کی باتیں اپنے خطوط میں نہ لکھتے۔ان پر ہمیشہ افسردگی کی کیفیت طاری رہتی تھی۔جس کا ذکر اپنے وہ ایک خط میں اس طرح کرتے ہیں:۔

''میری زندگی ایک دیوار ہے جس کا پلستر میں ناخنوں سے
کھروچتا رہتا ہوں۔کبھی چاہتا ہوں کہ اس کی تمام اینٹیں
پراگندہ کردوں۔کبھی یہ جی میں آتا ہے کہ اس کے ملبے کے ڈھیر
پر ایک نئی عمارت کھڑی کردوں۔دماغ ہر وقت کام کرنے کے
باعث تپتا رہتا ہے میرا نارمل درجہ حرارت ایک ڈگری زیادہ ہے
جس سے آپ میری اندرونی تپش کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔''
(اسلم پرویز،آپ کا سعادت حسن منٹو،ص ۵۸)

اس طرح سے منٹو کے خطوط ان کے باطن کو اور ان کے قلب و ذہن کے نہاں خانوں کو آشکار کرتے ہیں۔ان کے خطوط کے آئینے میں جو شخص نظر آتا ہے وہ بے حد نرم دل،درد مند دل ہے۔منٹو کے ہر ایک خط میں بے پناہ خلوص جھلکتا ہے۔منٹو اپنے

دوستوں سے راز کی ساری باتیں کہہ دیتے تھے۔قاسمی صاحب کو ایک خط اپنے نکاح کے بارے میں بڑی باریکی سے لکھتے ہیں۔

''میری شادی ابھی مکمل طور پر نہیں ہوئی ہے۔نکاہیا گیا ہوں میری بیوی لاہور کے ایک کشمیری خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔اس کا باپ مر چکا ہے میرا باپ بھی زندہ نہیں، وہ چشمہ لگاتی ہے میں چشمہ لگاتا ہوں۔وہ گیارہ مئی کو پیدا ہوئی، میں بھی گیارہ مئی کو پیدا ہوا تھا۔اس کی ماں بھی چشمہ لگاتی تو میری والدہ بھی چشمہ لگاتی ہے۔اس کے نام کا پہلا حروف ایس ہے، میرے نام کا پہلا حروف ایس ہے، ہم میں اتنی چیزیں ایک جیسی (common) ہیں۔بقایا حالات کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ پہلے وہ پردہ نہیں کرتی تھی مگر جب اس پر میرا حق ہوا ہے اس نے پردہ کرنا شروع کر دیا ہے صرف مجھ سے۔''

(اسلم پرویز، سعادت حسن منٹو، ص ۴۶)

منٹو ماہر نفسیات تھے۔عورت اور اس کی زندگی ان کا محبوب موضوع رہا ہے۔ان کے بہت کم ایسے افسانے ہیں جن میں عورتوں کا ذکر نہ کیا ہو اور عورتوں کے باطن کو ٹٹول کر نہ دیکھا ہو۔گویا منٹو نے عورتوں کو بے نقاب کر کے ان کے متعلق لکھا۔احمد ندیم کو ایک خط میں عشق و محبت اور عورت کے حسن و جمال کے بارے میں اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''عشق اور محبت کے متعلق سوچتا ہوں تو صرف شہوانیت ہی شہوانیت نظر آتی ہے۔عورت کو شہوانیت سے الگ کر کے دیکھتا ہوں تو وہ پتھر کی مورت بن کر رہ جاتی ہے۔مگر یہ ٹھیک بات نہیں،

میں جانتا ہوں، نہیں میں جاننا چاہتا ہوں کہ پھر آخر کیا ہے، کیا ہونا چاہئے ،مگر یہ تو پھر اور کیا ہوگا لیکن میں عورت کے بارے میں کچھ وثوق سے کہہ بھی نہیں سکتا۔ مجھے ان سے ملنے کا اتفاق ہی کہاں ہوا۔عورت کا وہ تصور جو ہم لوگ اپنے دماغ میں قائم کرتے ہیں ٹھیک نہیں ہوسکتا، کس قدر افسوس ناک چیز ہے کہ عورتوں کے ہمسائے ہوکر بھی ہم ان کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کرسکتے۔ایسے ملک پر جو عورتوں کو ہم سے ملنے کے لئے روکے،مگر کچھ نہیں سب بکواس ہے۔''

(اسلم پرویز،سعادت حسن منٹو۔ص ۵۵)

مندرجہ بالا اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ منٹو نے جیسے افسانوں میں عورتوں کی پردہ فاشی کی ہے ایسے خطوط میں نہیں کی ہے،شاید انھوں نے کسی شریف عورت کا اثر قبول کیا۔منٹو کے خطوط کا دوسرا نمایاں پہلو ان کا وسیع مطالعہ، پختہ تنقیدی شعور اور فنی باریکیوں پر عبور ہے۔ان کے مرشد باری علیگ نے جو بیج بویا تھا منٹو کی ذرخیز زمین میں وہ جلدی ہی تناور درخت بن گیا۔

منٹو کے خطوط سے آج دنیا محروم ہوتی۔قاسمی نے انھیں سنبھال کر رکھا اور انھیں کتابی شکل دے کر شائع کیا۔منٹو کے خطوط کا اندازِ بیان غالبؔ کے خطوط کے اندازِ بیان سے ملتا ہے۔جس طرزِ بیان کی بنیاد غالبؔ نے ڈالی تھی منٹو نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔غالب کی طرح منٹو نے بھی اختصار کے ساتھ کام لیا ہے اور ایک ایک سطر والے خطوط بھی لکھے ہیں۔

سعادت حسن منٹو نے پنڈت جواہر لال نہرو کے نام بھی خطوط لکھے ہیں۔ایک خط میں انھوں نے کسی سیاسی وسماجی حالات کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔اس خط کو

انھوں نے اپنے ناول ''بغیر عنوان کے'' کے دیباچہ میں شامل کیا ہے،اس خط میں وہ نہرو سے مخاطب ہیں۔اس خط میں انھوں نے ان تمام سیاسی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے ،جس کا ذکر وہ نہرو جی سے کرنا چاہتے تھے، کیوں کہ تقسیم ہند کی وجہ سے ہندوستان کے عوام کو جن مشکلات سے دوچار ہونا پڑا تھا اس کا ذکر انھوں نے اس خط میں بڑی خوبی سے کیا ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے ریاست جموں وکشمیر کے مسائل کو بھی سامنے لایا ہے۔اس ریاست کے ساتھ ہوئی سیاسی ناانصافی کو بھی اس خط میں دکھایا ہے۔اس طرح سے منٹو نے چند دیگر ادیبوں کو بھی خطوط لکھے ہیں۔

منٹو کے خطوط کا طرزِ بیان ان کی باقی دوسری تحریروں سے الگ ہے۔ان کے خطوط کی تاریخی اور سوانحی اہمیت وافادیت یہ ہے کہ ان سے منٹو کی شخصیت اور فن کے ایسے پہلو ابھر کر سامنے آتے ہیں، جو ان کے خطوط کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتے۔ یہ منٹو کی شخصیت کو کرید کر سامنے لاتے ہیں۔ان میں بے لوث خلوص ومحبت اور دردمندی کی باتیں پیش کرتے ہیں۔منٹو کے خطوط سے ان کے پختہ شعور اور فلمی کہانیوں کی تکنیک پر کامل عبور کا پتہ چلتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ منٹو کی جسمانی صحت، ذہنی اضطراب اور معاشی حالت کے متعلق بھی جانکاری ملتی ہے۔اسی اعتبار سے منٹو کی دائمی افادیت اور اہمیت کا راز بھی عیاں ہوتا ہے۔منٹو کے خطوط کی زبان سادہ سلیس اور عام فہم ہے۔انگریزی الفاظ کا استعمال بھی ملتا ہے جس کی وجہ فلموں سے ان کی وابستگی ہے۔ انھوں نے اپنے خطوط میں تشبیہات،استعارات اور محاوروں کا استعمال کم کیا ہے۔ان کے خطوط کا اندازِ بیان ہی منفرد ہے،نہ کہیں تازگی اور شگفتگی ہے اور نہ کہیں تیکھا پن، صرف مایوسی ان کے خطوط پر چھائی ہوئی ہے۔یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اگر منٹو کے خطوط کے مجموعے سے منٹو کا نام حذف کر دیا جائے تو اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا کہ یہ منٹو کے خطوط ہیں یا کسی اور کے۔

خطوط غالب میں طنز ومزاح کے عناصر

ڈاکٹرعرفان امین

خط کیا ہے؟ بقولِ غالب کے،''جو بات پاس کے لوگوں سے کی جاتی ہے اس سے دور کے لوگوں تک پہنچانا، گفتگو کو تحریر، مکالمے کو مراسلے کا جامہ پہنانا خط ہے۔'' اچھا خط وہ کہا جاسکتا ہے جس میں لکھنے والا اپنے مخاطب سے باتیں کرتا ہوا نظر آئے، جس میں بے تکلّفی، بے ساختگی، خلوص، فطری رنگ، انفرادیت، ذاتی تاثرات کی جھلک ہو۔ چنانچہ وہ خط جن میں جان بوجھ کر علمیت کی نمائش، انشاء پردازی کی شان، تکلف کا اظہار اور خطابت کا جوش دکھایا جائے خط نہیں مضمون کہلاتے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے ایک جگہ لکھا ہے کہ''خط دلی خیالات وجذبات کا روزنامچہ اور اسرارِ حیات کا صحیفہ ہے۔ اس میں وہ صداقت کا خلوص ہے جو دوسرے کلام میں نظر نہیں آتا۔ خطوں سے انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں ہوسکتا۔'' غالب کے خطوط میں یہ ساری خوبیاں موجود ہیں۔ علاوہ ازیں خطوطِ غالب میں جو منفرد عناصر پائے جاتے ہیں اور جو اُن کے خطوط کو دلچسپ اور دلکش بنا دیتے ہیں نیز ان کے مکاتیب کو سرمایۂ اردو خطوط میں ایک ممتاز ومنفرد مقام عطا کرتے ہیں وہ خطوط غالب کے طنزیہ ومزاحیہ عناصر ہیں۔ یہ عناصر اردو کے دوسرے مکتوب نگاروں کے مقابلے میں غالب کے خطوط میں بدرجۂ اُتم موجود ہیں۔ ان ہی عناصر کے پیشِ نظر مولانا حالی نے''یادگارِ غالب'' میں غالب کو حیوان ناطق کے بجائے حیوان ظریف

کے لقب سے نوازا ہے۔

غالب کے اردو خطوط کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہیں۔ایک وہ خطوط جوانہوں نے کسی مقصد یا ضرورت کے تحت لکھے اور دوسرے وہ خطوط جو تفریح کے طوط پر یعنی مکتوب نگاری کے شوق کی تکمیل کے لئے لکھے۔موخرالذکر خطوط میں شوخی وظرافت یا طنز و مزاح کے عناصر غالب نظر آتے ہیں۔چونکہ غالب کی طبیعت میں شوخی وظرافت کے عناصر کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے لہذا یہ عناصر ان کے خطوط میں بھی جھلکتے ہیں۔باوجود اس کے کہ غالب کی زندگی کے آخری ایّام بیماری اور ناداری میں گزرے مگر پھر بھی غالب کی خوش مزاجی میں ذرا بھی کمی نہ آئی۔ان کی ہمیشہ یہی کوشش رہتی تھی کہ ملاقاتی ان سے ملکر خوش ہو جائے۔مکتوب الیہ ان کے خط سے لطف اندوز ہو۔گفتگو کو چھیڑ چھاڑ اور ہنسی مذاق سے پُر لطف بنا دیتے تھے۔احباب ان کے اس منفرد انداز کے پرستار تھے۔ان سے نہ صرف ملاقات کے خواہشمند رہتے تھے بلکہ ان کے مکتوب کے منتظر و مشتاق بھی رہتے تھے۔چٹکلے، لطیفے، ظرافت آمیز باتیں ان کے خطوط میں جابجا نظر آتی ہیں۔خطوط غالب میں جو طنزیہ عناصر موجود ہیں وہ اس لطیف پیرایۂ میں ہیں کہ قاری تو کیا وہ شخص بھی جس پر طنز کیا گیا ہو پڑھ کر لطف اندوز ہوتا ہے، طنز کا اس پر گراں گزرنا تو دور کی بات ہے۔خطوط غالب میں خود غالب پر، احباب پر، یہاں تک کہ بیماری، شادی اور موت وحیات پر بھی نہایت ہی لطیف پیرایۂ میں طنز موجود ہے۔میر مہدی مجروح دلی میں پھیلے وبا کے بارے میں جب ایک خط میں غالب سے دریافت کرتے ہیں تو غالب جوابی خط میں کس لطیف انداز میں وبا پر طنز کرتے ہیں ملاحظہ فرمایئے:

> ''وبا تھی کہاں؟ جو میں لکھوں کہ اب کم ہے یا زیادہ۔ایک
> چھیاسٹھ برس کا مرد، ایک چونسٹھ برس کی عورت، ان دونوں میں

سے ایک بھی مرتا یوہم جانتے کہ ہاں وبا آئی تھی۔تُف بریں وبا!۔‘‘ (۱)

طنز وظرافت تو غالب کی سرشت میں داخل تھی۔ ہر وقت ہنستے ہنساتے رہتے تھے اور دل آسائی ودل جوئی انکے مزاج کا خاصہ تھی۔ وہ نہایت سنجیدہ بات کو بھی ظرافت کی چاشنی میں ڈبو کر اس ڈھب سے پیش کرتے تھے کہ قاری سنجیدہ ہونے کے بجائے زیر لب مسکراتا ہے۔اگر یہ کہا جائے کہ طنز ومزاح غالب کے ہر خط کی جان ہے تو بیجا نہ ہوگا۔ مذکورہ عنصر غالب کے کسی بھی خط میں اخلاقی حدود سے تجاوز نہیں کرتا۔ چونکہ ان کی مسکراہٹ زیر لب سے آگے نہیں بڑھتی۔یہی وجہ ہے کہ بعض ناقدین اس خصوصیت کی بناء پر غالب کا موازنہ چارلس لیمپ کے ساتھ کرتے ہیں۔آل احمد سرور نے تو متذکرہ خصوصیت کی بناء پر غالب کو اردو کا اڈیسن کہا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

’’وہ قہقہے کے قائل نہیں۔صرف زیر لب مسکراتے ہیں ۔ اس لحاظ سے وہ اردو کے اڈیسن ہیں ۔اڈیسن زندگی کو ایک تماشائی کی حیثیت سے دیکھتا ہے۔اس کا دل کش ورواں متبسم طرز انگریزی نثر کی معراج ہے ۔غالب تماشائی نہیں بلکہ خود تماشا ہیں۔ گہرے اور تیز چھینٹوں کے بجائے دونوں ہلکے رنگوں کی آمیزش سے اپنی تصویر بناتے ہیں‘‘۔(۲)

خطوط غالب اردو مکتوب نگاری کے بہترین نمونے قرار پائے ہیں۔غالب نے غموں کو ہنسی میں اڑانا سیکھ لیا تھا جو کہ ہر انسان کے بس کی بات نہیں۔ عام طور پر جب لوگ تکالیف ومصائب کے شکار ہوتے ہیں تو نہ صرف انکی ہمت وحوصلہ جواب دے جاتا ہے بلکہ خود بھی ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں۔لیکن غالب نے اپنی اعلی حوصلہ اور ہمت سے مصائب ومشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ان کی شخصیت افسردگی وخوش مزاجی کا

امتزاج نظر آتی ہے۔جسکے بارے میں پروفیسر نورالحسن نقوی یوں رقمطراز ہیں:

''غالب کو ساری زندگی مصائب کا سامنا رہا۔تنگدستی، نا قدری، بیماری، دوستوں کی جدائی، غدر کی تباہ کاری۔ان سب کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے مزاج میں افسردگی پیدا ہوگئی ۔ لیکن اس افسردگی کو انھوں نے اپنی اعلی حوصلگی، خوش مزاجی اور ضبط وتحمل سے آمیز کر دیا۔ چنانچہ انکا تصور کیجیے تو ایک ایسی تصویر ابھرتی ہے جس کی آنکھوں میں آنسوں ہیں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ۔'' (۳)

غالب کے طنز وظرافت کی خاص بات یہ ہے کہ وہ طنز وتمسخر کا نشانہ دوسروں کو کم خود زیادہ بناتے ہیں ۔اپنے اوپر ہنستے ہیں ۔جس کے لیے بڑا جگر چاہیے۔ان کے خطوط میں طنز کے جونشتر ہیں وہ عموماً تخریبی نہیں ہیں ۔ جہاں جہاں زہراورنشیریت زیادہ ہے ۔ وہاں عموماًاس کا نشانہ خود انکی ذات ہے۔تنگدستی کے زمانے میں جب اچھے دنوں کے کپڑے فروخت کر کے گزر کرنا پڑی۔تو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ 'لوگ روٹی کھاتے ہیں میں کپڑا کھاتا ہوں'۔ایسی ہی ایک اور نظیراس خط میں موجود ہے جو انھوں نے امراؤ سنگھ کی دوسری بیوی کے انتقال کے بعد جب وہ تیسری شادی کا ارادہ کرنے لگے،اس کے بارے میں مرزا تفتہ کو لکھا ہے خط ملاحظ فرمائیے:

''تمہارا خط آیا، میں نے اپنے سب مطالب کا جواب پایا۔امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دوبار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں۔ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے۔نہ تو پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی

نکلتا ہے۔اس کو سمجھاؤ کہ میں تیرے بچوں کو پال لوں گا تو کیوں
بلا میں پھنستا ہے۔'' (۴)

غالب نے اپنے خطوط میں طنز وظرافت کا جو اعلی معیار قائم کیا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ انکی ظرافت میں بے فکرا پن نہیں بلکہ ظاہری خوش طبعی اور زندہ دلی کی تہ میں بھی انکے تجربات اور جزبات کام کر رہے ہیں۔انکی ظرافت کے سرچشمے انکے درد وغم سے ہی پھوٹتے نظر آتے ہیں ۔ انکی ظرافت ایک غمگین مگر با وقار اور با حوصلہ آدمی کی ظرافت ہے۔یہی وجہ ہے کہ انکے تعزیتی خطوط میں بھی طنز ومزاح کے عناصر موجود ہیں۔جسکی عمدہ مثال مرزا حاتم علی مہر کو انکی محبوبہ کی موت پر لکھا گیا یہ خط ہے:

''ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔پینسٹھ برس کی عمر ہے۔پچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی۔ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے یہ نصیحت کی تھی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں۔ہم مانع فسق وفجور نہیں۔پیو کھاؤ،مزے اڑاؤ مگر یاد رہے مصری کی مکھی بنو،شہد کی مکھی نہ بنو۔کیسی عشق فشانی،کہاں کی مرثیہ خوانی؟ آزادی کا شکر بجالاو،غم نہ کھاؤ اور اگر ایسے ہی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان نہ سہی منا جان سہی...........بھائی ہوش میں آؤ کہیں اور دل لگاؤ''۔ (۵)

مرزا غالب کے خطوط میں طنز وظرافت کا عنصر کئی صورتوں میں ظاہر ہوا ہے۔بہ حیثیت مجموعی ان کے یہاں شوخی وظرافت کے ساتھ ساتھ لفظی نکتہ آفرینی بھی پائی جاتی ہے۔وہ لفظوں کے ردوبدل یا پھر لفظوں کے ہیر پھیر سے تحریر میں غضب کا مزاح پیدا کرتے ہیں۔وہ اپنی طبع آزمائی اور ذہانت کے کرشمے دکھا کر مخاطب کو محظوظ کرتے ہیں۔الفاظوں کے ساتھ کیسے کھیلتے ہیں؟۔یہ کوئی غالب سے سیکھے۔مثال کے لیئے

غالب کا وہ خط دیکھیے جوانھوں نے کسی کی اس شکایت کے سلسلے میں، کہ غالب روزہ نہیں رکھتے، منشی نبی بخش حقیر کو لکھا ہے خط ملاحظہ فرمائیے:

''روزہ رکھتا ہوں مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں۔ کبھی پانی پی لیا، کبھی حقہ پی لیا، کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا کھالیا۔ یہاں کے لوگ عجب فہم اور طرفہ روش رکھتے ہیں۔ میں تو روزہ بہلاتا رہتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ بہلانا اور بات ہے۔'' (٦)

متذکرہ بالا مثالوں سے یہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ غالب کے خطوط میں طنز و مزاح کی ایسی دلکش، پاکیزہ اور صاف ستھری کثرت سے ملتی ہیں۔ آپ بیتی ہو یا جگ بیتی، ادبی مسائل ہوں یا شاعرانہ شوخیاں یا پھر دوستوں کے کلام کی اصلاح، دنیا جہاں روتی بسورتی ہے غالب وہاں صرف مسکرا دیتے ہیں۔ غالب کی ظرافت تند و تیز نہیں۔ انکی تحریریں ہنساتی نہیں صرف مسکرانے پر مجبور کرتی ہیں اور کبھی کبھی تو ذہن میں ایک گدگدی سی ہوتی ہے اور بس یہی ظرافت کی اعلیٰ قسم ہے اور اسی کی بدولت غالب کے خطوط میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔

حواشی

۱۔ غالب کے خطوط، جلد:۲، خلیق انجم۔ غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دلی :۲۰۰۲ء، ص:۵۳۱

۲۔ تنقیدی اشارے، آل احمد سرور، ادارہ فروغ اردو نمبر ۳۷، امین آباد پارک لکھنو ۱۹۹۶ء ۔ص:۲۶

۳۔ تاریخ ادب اردو، پروفیسر نورالحسن نقوی، ۱۱ ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ :۲۰۱۱ء۔ ص ۲۱۷

۴۔ غالب کے خطوط، جلد:۱۔ خلیق انجم، غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دلی :۲۰۰۲ء۔ص:۳۰۵

۵۔ غالب کے خطوط، جلد:۲۔ خلیق انجم۔ غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دلی :۲۰۰۲ء۔ص:۲۱۷

۶۔ غالب کے خطوط۔ جلد:۳، خلیق انجم، غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دلی :۲۰۰۲ء۔ص:۱۱۶۰

مکاتیب اقبال میں فلسفہ تصوف

سجاد احمد سلطان
اسٹنٹ پروفیسر شعبہ اُردو
گورنمنٹ ڈگری کالج بوائز اننت ناگ

اُردو ادب میں علامہ اقبال کثیر الجہت شخصیت کے مالک ہیں۔نثر ہو یا نظم علامہ کو خصوصی اہمیت کے ساتھ صف اول میں گردانا جاتا ہے۔ چونکہ اُن کی طبعیت فلسفیانہ تھی اس لئے نثر اور نظم میں فلسفیانہ آہنگ ہر جگہ نمایاں رہتا ہے۔فلسفیانہ گتھیوں سے نبرد آزمائی کا جلوہ نگارشات اقبال کی اُفق پر چھایا ہوا ہے۔فلسفیانہ موشگامینوں کی نوعیت سیاسی ہو کہ سماجی، مذہبی ہو کہ سائنسی غرض جو بھی ہو، اقبال نے نثر و نظم کو ان مباحث کے میدان میں اُتارا۔

جہاں تک اقبال کے مکاتیب کا تعلق ہے۔ان میں مختلف فلسفی امور پر مفصل اور واضح بات ہوئی ہے۔کئی مضامین ہیں جن کو تسلسل کے ساتھ مقابلتاً مکاتیب میں برتا گیا ہے۔بعض کے مسائل اقبال کے فکری ارتقا میں ذہنی ارتعاش کا صاف عکس پیش کرتے ہیں۔ کیونکہ انسانی افکار حالات ماحول، تجربات اور مطالعے کے ساتھ ساتھ مختلف ترامیم کے مرحلوں سے فطرتاً گذرتے ہیں۔اقبال کے یاں فلسفہ تصوف بھی کچھ اسی نوعیت کا ہے۔اقبال کے بعض خطوط میں نصوف کی بعض جہات کی تائید ملتی ہے۔اور بعض کی تردید۔کچھ مسلئے ایسے بھی ہیں جن پر ایک یہی نوعیت کے متضاد بیان

ملتے ہیں۔

تصوف کئی صدیوں پر محیط معرکتہ آراء بحث رہی ہے۔اس پر جتنی بھی مغز کھپائی کی گئی اس کی تقسیم وتوضیح کا کوئی حتمی رُخ دینا اُتنا ہی مشکل ہوا ہے۔اس میں یہ معاملہ بھی ہے کہ تصوف کی آمیزش مختلف مذاہب میں ملتی ہے۔لہذا اس کی مخصوص جیت واضح کرنا بھیداز قیاس اقبال کا سروکار اسلامی تصوف سے رہا ہے لہذا ہماری بحث کا محور یہی رہے گا۔تصوف کی اصطلاح اُس طریقہ کار اور طرز فکر کیلئے واضح کی گئی ہے جس پر کوئی صوفی کاربند ہو۔بعض اہل لعتوف ،لعتوف کیلئے قرآنی حوالہ دیتے ہوئے اس کی مایت مقرر کرتے ہیں۔اس اعتبار سے لعتوف کوئی ایسا طرز فکر نہیں جسے شرعی گردانتے میں شامل ہو۔جن وجود کی بنا پر باز العتوف میں گرم گفتاری ہوئی ہیں۔وہ اُن افکار وعوامل کی دخل اندازی ہے جو عجیبی فضا میں لعتوف کے زیر اثر پروان چڑھنے لگے اور لعتوف کے تیار شدہ عصری پیوے کی خمیر میں عربی تصورات کے ساتھ خودساختہ عجمی تصورات خلط ملط ہو گئے۔اقبال کے یاں پر جیت پررائے زنی ملتی ہے۔چونکہ اقبال نے جس ماحول میں پرورش پاج وہ لعتوف آمیز مذہبی ماحول تھا۔اسلئے لعتوف کی موضوعاتی بحث کا مکاتیب اقبال میں تسلسل ہے۔اقبال کے عید کے مشہور عالم وصوفی شاہ سلماں پھلواری کو لکھتے ہیں۔

> ’’میرے والد کوفتوعات اور مخصوص سے کمال تو توغل پا ہے
> ۔اور چار برس کی عمر سے میرے کانوں میں اُن کا نام اور اُن کی
> تعلیم پڑنی شروع ہوئی۔برسوں تک ان دونوں کا درس ہمارے
> گھر میں رہا۔گو بچپن کے دامن میں مجھے ان مسائل کی سمجھ نہ تھی
> تاہم محفل درس میں پرروز شریک ہوتا‘‘

بحوالہ انوار اقبال از بشیر اقہر ڈار ص نمبر ۱۷۷

درج بالا عبارت سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ تصوف نے اقبال کی شخصیت پر کتنے گہرے اثرات مرتب کیئے ہوں گے کہ سپن بلوعنیت کو سیچنے سے پہلے لعتوف کی درس و تدریس کا معمول تھا۔ تعلیم میں میرحسین اور آرنالڈ مقبول استاد ہیں۔ میرحسن نے مذہبی طبعیت کو مذید جلا دی جبکہ آرنالڑ نے فلسفے کی چنگاری کو اقبال کے ذہن میں پھونک دیا ۔اکثر و بیشتر لعتوف کے حوالے سے اقبال پر انستاؤں کے پل باندھے جارہے ہیں۔ کچھ انکی شاعری اور خطوط سے ایسی عبارت چن چن کے ڈھونڈ لاتے ہیں جو سراسر لعتوف کے حق میں ہیں اور کچھ اس کے تخالف کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسی کشمکش ہے جس نے اقبال کو اپنی ہی متن میں اختلافی توصیحات کے بیاؤ میں بیادیا ہے۔ یہاں غیر جانب داری اور اعتدال کی ضرورت ہے جس کا ذکر اس معمون میں آگے آئے گا۔خود اقبال نے فلسفہ عجم میں یہ بات واضح کردی۔ لکھتے ہیں:

''میرے خیال میں یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ قرآن و احادیث صحیح میں صوفیانہ نظریہ کی طرف اشارات موجود تھے۔ لیکن وہ عربوں کی مما لک ہیں غیر موزوں حالات میسر آگئے تو وہ ایک جداگانہ وطریہ کی صورت میں جلوہ گر ہوئے۔

بحوالہ فلسفہ عجم از علاقہ ابال ص ۱۴۷

اقبال خود لعتوف کے ایک سلسلہ سے وابستہ رہے جس کے بارے میں علامہ سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں:

''یہ حال سلسلہ قادریہ کا ہے جس میں'' میں خود بیعت رکھتا ہوں''

بحوالہ اقبال نامے از شیخ عطاؤاللہ ص جلد دوم ص ۷۹

علامہ شاعری میں جس فلسفے کو کلیدی اہمیت حامل ہے۔ وہ خودی کا فلسفہ ہے''جس

کو نثار حسین اقبال نے مختلف زاویوں انور حوالوں سے واضح کیا ہے جس میں اختلافی نوعیت کی باتیں آئی ہیں۔ اگر مکتوبات اقبال کو اس حوالے سے دیکھا جائے تو خود کی جیت ہی مقرر نہیں ہوتی بلکہ یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ یہ افکار التصوف کے بطن سے پھوٹنے والی وہ فکر ہے۔ جس کو تصوف کے مثبت پہلو نے جنم دیا ہے۔ اکبرالہٰ آبادی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

''حقیقی اسلامی خودی میرے نزدیک اپنے ذاتی اور شخص میلانات مار چھانات و تخیلات کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے احکام کا پابند ہو جانا ہے۔ اس طرح کہ اس پابندی کے نتائج سے انسان بالکل لاپرواہ ہو جائے اور محض رضا و تسلیم کو اپنا شعار بنائے۔ یہی اسلامی تصوف کے نزدیک متا ہے۔''

بحوالہ اقبال نامہ عطاء اللہ جلد دوم ص ۵۶

ظفر اصر صدیقی کے نام ایک مکتوب ہیں یہ بات اور بھی ماضح کرتے ہیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ اقبال کا فلسفہ نوری تصوف سے عبارت ہے لکھتے ہیں۔

''جیب احکام الہٰی خودی میں ایں ذ حد تک سرابیت کر جائیں کہ خود کے پرائیوٹ امیال وعواطف باقی نہ رہیں اور صرف رضائے الیہی ایں کا مقصد ہو جائے، تو زندگی کی ایں لیفٹینٹ کو بعض اکابر صوفیائے اسلام نے ''نتا'' کہا سے۔ بعض نے اسی کا نام ''بقا'' رکھا ہے۔

بحوالہ اقبال نامہ عطاء اللہ چلا اول ص ۲۰۲

بات واضح ہے کہ اقبال شریعت اسلامی نے حدود وقیود کے تابع اُن تمام تصورات کے قائل ہیں جو ایک رجحان کے تحت تصوف کے ذیل میں آتے ہیں۔ اگر اختلاف

اور تردید ہے تو اُن نظریات کی جن کی اسلامی منہج افکار سے کوئی مستند مطابقت ہیں۔ اقبال نے جن افکار کو اسلامی طرز فکر کے معیار پر درست پایا، انہیں اپنایا اور باقی تصورات کو مسترد کر دیا۔ ان دونوں وطیروں کے حوالے سے مولانا اسلیم جے راج پوری کو لکھتے ہیں۔

''لعتوف سے اگر اخلاص فی العمل مراد ہے اور یہی مفہوم قرون اولیٰ میں ّ یا جاتا تھا تو کسی اس امر پر اعتراض نہیں ہوسکتا۔ یہاں جب لعتوف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے۔۔۔ اور نظام عالم کے حقائق اور بار تعالیٰ کی ذات کے متعلق موئگافیاں کر کے کسی کشفی نظریہ پیش کرتا ہے تو میری روح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔''

بحوالہ اقبال نامہ۔ جلد اول۔ ص ۵۲

عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ اقبال کی پرکھ کا معیار کیا ہے۔ بعض اہل لعتوف ''وحدت الوپور'' کے حوالے سے توحید کی خودساختہ تعبیر کے قائل ہیں۔ اقبال کے نزدیک وحدت الوجود کسی بھی طرح اسلام سے مطابقت نہیں تھا۔ چونکہ ''وحدت الوبود'' مخصوص الحکم'' کے مصنف شیخ محی الدین ابن عربی کی اختراع ہے اسلئے اُنہی کے حوالے سے ایک خط میں لکھتے ہیں

''لعتوف کا سب سے پہلا شاعر عراقی ہے جس نے لمحات میں مخصوص الحکم، محی الدین ابن عربی کی تعلیمات کو نظم کیا ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے۔ مخصوص میں سوائے الحاد اور زندقہ کے اور کچھ نہیں۔

بحوالہ علامہ اقبال اور وحدت الوبود۔ حافظ عباد اللہ فاروقی

۔ص ۵۱

خودی کے بعض نکات کو بھی اقبال نشان زد کرتے ہیں جن
سے اس کی غلط توضیح سرزد ہوتی ہے ۔نودی کی وہ معنوئی ہیرا
پھیری بھی لعتوف کے افکار کا ہی سبب ہے ۔لعتوف میں تصور
کے فنا دبقا کومختلف پرائیوں میں لینے سے اسکی معنوی کائنات
کچھ سے کچھ ہوتی ہے۔لہذا اقبال لعتوف پیرااس منفی سوچ کے
اثر پر اپنا موقف واضح کرتے ہیں ۔لکھتے ہیں ''دوسری وہ بےخود
ی ہے ۔ جو بعض صوفیائے اسلام اور تمام نیدو جوگیوں کے
نزدیک ذات انسانی کوذات باری میں فنا کردینے سے پیدا ہوتی
ہے۔اور یہ فنا ذایت باری میں ہے، نہ احکام باری تعالیٰ میں۔''
بحوالہ اقبال نامہ حصہ دوم ص نمبر ۶۰۔

مکاتیب اقبال کی رو سے لعتوف کے مثبت ومنفی عوامل کی نشان دیہی سے اقبال کا تصور واضح ہو گیا۔اس نوعیت کے بیسیوں تشروتح طلب مسائل ہیں جن کو اقبال نے خطوط میں برتا ہے۔اگرچہ دور حاضر میں اب خطوط کے روایتی آہنگ کو برقرار رکھتے کی ظاہری اعتبار سے کوچ منطعی گنجائش نظر نہیں آتی لیکن خطوط کے سرمائے کو ہمیشہ زندہ رکھنے کیلئے ان مباحث کوزیر بحث لایا جاسکتا ہے۔جن میں دور حاضر کی بہت سی اجتہادی گھیتوں کو سلجھایا جاسکتا ہے۔کیونکہ اقبال نے جدید مسائل کو موقع ومحل کے اعتبار سے سلجھانے کیلئے روایت کا سہارا لے کر اجتہادی طریقہ کار کے دروازے اسطرح والنے جو بند نہیں ہوسکتے۔

صفیہ اختر خطوط کے آئینے میں

کوشل کرن ٹھاکر
اسسٹنٹ پروفیسر
ایم۔اے۔ایم کالج، جموں

مکتوب نگاری کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ انسانی تاریخ۔اس میں شک نہیں کہ خطوط نگاری نثر کی ایک مستعمل صنف ہے۔ جب تہذیب وتمدن کا آغاز ہوا اسی وقت سے ہی لوگ اپنا پیغام دوسروں تک پہنچانے کے لئے خطوط کا استعمال کرتے تھے۔خطوط نہ صرف کاتب اور مکتوب الیہ کے راز ہائے دروں اور آپسی رِشتے کو اُجاگر کرتے ہیں بلکہ خطوط کے ذریعے کسی شخصیت وکردار کی مکمل عکاسی بھی ہوتی ہے۔

خطوط میں انسان کے ظاہر اور باطن کا اظہار ہوتا ہے۔ اُس کے محسوساتِ جذبات اور تجربات سب سامنے آتے ہیں۔خطوط نگار کے نجی لمحات کا عکس بھی دِکھائی دیتا ہے اُس کی محبت، نفرت، اچھی بری سوچ، خواہشات، ذہنیت اور نظریات تمام اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ خطوط میں مکتوب نگار اپنا دِل کھول کر قاری کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ پہلے دور میں خط سے ملاقات کا ساحظ اور تسکین حاصل ہوتی تھی۔ بعد میں خطوط نگاری ترقی کرتے کرتے ایسی منزل پر آگئی کہ اس کی حیثیت، فن لطیف کی سی ہوگئی۔

خطوط کی مقبولیت اُن کی سادگی میں مضمر ہوتی ہے جو ہمیں کسی دوسری ادبی صنف

میں نہیں ملتی۔ جتنی سادہ اور عام فہم زبان میں خط لکھا ہوگا اُتنا ہی قاری کو پسند آئے گا۔ خطوط انسان کی زندگی کے ہر واقعے کو اس خوبصورتی سے اُجاگر کرتے ہیں کہ ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انسانی سیرت و شخصیت کا علم خطوط کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ خطوط نگار نجی باتوں میں بھی ایسی رنگا رنگی اور دلچسپی پیدا کر دیتا ہے کہ یہ باتیں گویا پڑھنے والے کو اپنے ہی دل کی داستان معلوم ہوتی ہیں۔ دُنیا کی ہر زبان میں خطوط کا اچھا خاصا سرمایہ موجود ہے۔ یہ خطوط مختلف نوعیت کے ہیں اور انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ کسی بھی زبان کے ادب میں وہ خطوط اہم قرار دیئے جاتے ہیں جو کسی اہل قلم نے لکھے ہوں۔

اُردو خطوط نگاری کے میدان میں غالب کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔ انہوں نے خطوط نگاری کے نئے اسلوب کو جنم دیا یعنی مراسلت کو مکالمت کے درجے تک لانا غالبؔ کا ہی حصہ ہے۔ ان کے بعد لکھنے والوں نے بھی اپنے اپنے رنگ میں خطوط تحریر کر کے خوب نام پیدا کیا۔ اس ضمن میں مولانا ابوالکلام آزاد، شبلیؔ، سجاد ظہیر، پریم چند، ڈاکٹر سر محمد اقبالؔ، منٹو، مہدی حسن وغیرہ کے نام خصوصیت سے لیے جا سکتے ہیں۔ ان ہی اہم ناموں میں ایک نام صفیہ اختر کا بھی ہے جو مشہور و معروف شاعر جانثار اختر کی رفیقۂ حیات تھیں اور ترقی پسند شاعر اسرارالحق مجازؔ کی بہن۔ لیکن محترمہ ان بدقسمت ادیبوں اور شاعروں کی فہرست میں شامل ہیں جن کے ساتھ زندگی نے وفا نہیں کی گویا ''کلی پھول بننے سے پہلے ہی مرجھا گئی، وقت سے پہلے ہی اس دُنیا کو الوداع کہہ گئیں۔ بقول کرشن چندر

> ''اس کے خطوط میں مجھے اس کے بھائی مجازؔ کا سا رنگ ملتا ہے اس کی شاعری کا رنگ نہیں اس کی نثر کا رنگ اس کے چبھتے ہوئے طنزیہ فقروں کا رنگ اس کی برجمل برجستہ گفتگو کا رنگ۔

اپنی سماجی سوجھ بوجھ میں اپنے اندازِ فکر میں اپنے محسوسات کی
تنظیم وترتیب میں صفیہ مجاز سے آگے تھی اس لئے اگر وہ زندہ
رہتی تو اپنے بھائی کی بہترین روایات کو بہت آگے لے جاسکتی
تھی۔صفیہ کی موت گلستانِ ادب میں بہت سی بے جانی بے
پہچانی کلیوں کی موت ہے۔'' (زیرلب،صفحہ نمبر۱۴)

مشہور ومقبول ترقی پسند شاعر جاں نثار اختؔر کے نام اُن کی رفیقۂ حیات صفیہ اختر کے خطوط اردو مکتوب نگاری کے میدان میں خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔

صفیہ اختر مرحومہ کے وہ خطوط جو۲۲؍دسمبر۱۹۴۹ء سے ۲۹؍دسمبر۱۹۵۲ء تک لکھے اور بھیجے گئے تھے''زیرلب'' کے عنوان سے ۱۹۵۵ء کو شائع ہوئے ہیں۔اس مجموعۂ خطوط میں صفیہ کے خطوط کے علاوہ کتاب کے شروع میں ایک خط جاں نثار اختر کے نام''رضیہ سجاد ظہیر اور دوسرا خط کرشن چندر کا جاں نثار اختؔر کے نام بھی شامل کئے گئے ہیں۔رضیہ سجاد ظہیر اور کرشن چندر نے یہ خطوط صفیہ اختر کی موت کے بعد تحریر فرمائے ہیں۔ان خطوط کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری اس بات کو بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ اس دور کے شعراء وادباء بھی صفیہ کی ادبی صلاحیت کو مانتے تھےلیکن افسوس کہ زندگی نے انہیں وہ موقعہ ہی نہیں دیا کہ وہ اپنی علمی وادبی صلاحیت کو بھرپور طریقے سے اُجاگر کر پاتیں۔

کرشن چندر اور رضیہ سجاد ظہیر کے خطوط وہ پُرخلوص تعزیت نامے ہیں جو قاری کے سامنے آتے ہی ہر کسی کی آنکھیں نم کر دیتے ہیں۔مثلاً رفیہ سجاد ظہیر اپنے خط میں کچھ یوں رقمطراز ہیں۔

''یہ بڑی بدنصیبی تھی اختؔر کہ میں صفیہ سے بہت کم مل سکی
لیکن جتنا بھی مل سکی وہ بھی ایک خزانہ ہے جو میرے لئے بہت
قیمتی ہے اس لئے کہ وہ لمحات مجھے ایک ایسی ساتھی کی یاد دلاتے

ہیں جس کا نام اگر چہ شہیدوں کی فہرست میں کبھی نہیں لکھا جائے گا لیکن جس کی ہستی ان بے شمار شہیدوں میں سے ایک تھی جن کی قربانیوں کے سہارے مجبور، معذور اور شکستہ پا زندگی ایک نہ ایک دن اپنے پیروں پر ضرور اٹھ کھڑی ہوگی۔ خود مختار ہوگی، آزاد ہوگی مجھے معلوم ہے صفیہ ان حالات کا شکار ہوئی جن میں ابھی زندگی کی رگیں کھینچ رہی ہیں سانس پھول رہی ہے۔ جسم پسینہ پسینہ ہے لیکن زندہ جاوید ہیں وہ لوگ جنھوں نے موت اور حیات کی اس کشمکش میں حیات کو زندہ رکھنے کی جدوجہد کے واسطے اپنا خون دیا، صفیہ بھی ان گمنام ان گنت شہیدوں میں سے ایک تھیں۔'' (زیرلب، صفحہ ۷)

کتاب کے آخر میں ''خاکِ دل'' کے عنوان سے اختر کی وہ نظم بھی شامل کی گئی ہے جوانہوں نے صفیہ اختر کی موت (۱۹۵۳ء) کے بعد کہی تھی آج تک ہزاروں دلوں کو متاثر کر چکی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

لکھنؤ میرے وطن میرے چمن رازِ وطن
تیرے گہوارۂ آغوش میں اے جان بہار
اپنی دنیائے حسیں دفن کئے جاتا ہوں
تو نے جس دل کو دھڑکنے کی ادا بخشی تھی
آج وہ دل بھی یہیں دفن کئے جاتا ہوں

''زیرلب'' کا مطالعہ کرتے ہوئے قاری ایک عورت کے کردار کی گونا گوں جہات سے روبرو ہوتا ہے اور یوں لگتا ہے کہ انسانی زندگی کے کچھ پہلو ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں دل صرف محسوس کرسکتا ہے الفاظ کے ذریعے بیان کرنا بہت مشکل ہوتا ہے

۔ایسا لگتا ہے کہ یہ وہ احساسات ہیں جن کو سیدھے سادے انداز میں خطوط کی شکل میں لکھ دیا گیا ہے جو قاری کو کچھ اس طرح اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں مانو ساری باتیں اُس کے دل پر بیتی ہیں جن کو خطوط کی شکل میں صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیا گیا ہے۔ جو اس شعر کا مصداق ہے۔

میرا درد شامل تھا جیسے ہر اک میں
سنی میں نے ہر داستاں روتے روتے

''زیرلب'' کے متعلق فراق گوکھپوری اپنے تاثرات کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں:۔

عدیم الفرصتی اور علالت کے باوجود یہ کتاب میں شروع سے آخر تک پڑھ گیا جو اثر اس کتاب نے مجھ پر کیا ہے اُسے یا تو یہ کہہ کر ٹال سکتا ہوں کہ وہ بیان سے باہر ہے یا پھر بہت سنبھل کر اسے بیان کرنے کی کوشش کر سکتا ہوں۔ ذاتی تعلقات اور گھریلو زندگی سے متعلق شوہر کے نام بیوی کے خطوط میں انسانیت کی روشن قدریں، مانویت وہم آہنگی کی اتنی پاکیزہ مثالیں اسلوب بیان کی بے تکلفی، خلوص وصداقت، نیک مزاجی اور بلند کرداری کی اتنی جھلکیاں جس قدر اس کتاب میں موجود ہیں شاید ہی اردو یا کسی بھی زبان میں شوہر کے نام بیوی کے خطوط کے کسی دوسرے مجموعے میں نظر آسکیں۔''

(زیرلب۔صفحہ نمبر۴)

صنف نازک جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ عورت ایک انتہائی نازک مزاج چھوئی موئی اور کمزور ترین شئے معلوم ہوتی ہے لیکن یہ نازک شئے درحقیقت اتنی طاقت ور،

اتنی بلند حوصلہ، اتنی وسیع تخیل ہوتی ہے کہ اس نے ہر دور میں اس کے نادر ثوابت فراہم کئے ہیں۔

صفیہ اختر کے خطوط اس بات کی بھر پور عکاسی کرتے ہیں کہ عورت صرف وہ نازک شئے نہیں ہے جو ہر کام کے لئے اپنے شوہر پر dependent ہوتی ہے بلکہ عورت صحیح معنوں میں خدا کی وہ طاقت ور مخلوق ہے جو تمام حالات کا مقابلہ بہت بہادری سے کر سکتی ہے۔ صفیہ اختر کا کردار عورتوں کے اس گروہ کی نمائندگی کرتا ہے جو اپنے آرام و آسائش کی پرواہ کیے بغیر دوسروں کے لئے اپنی زندگی تک قربان کرنے میں راحت محسوس کرتیں ہیں۔

جاں نثار اختر کسی مجبوری کی وجہ سے بھوپال چھوڑ کر ممبئی روانہ ہو جاتے ہیں تو ان کی رفیقہ حیات کے دل پر کیا گذرتی ہے یہ انہیں کا دل جانتا ہوگا لیکن وہ اپنے تمام دکھ درد چھپا کر اختر کے نام لکھے گئے ایک خط میں کس جوانمردی کا ثبوت دیتی ہیں ملاحظہ فرمائیں:

> ''خود پر اعتماد پیدا کرو، مجھ پر اعتماد پیدا کرو اور تمہید زندگی پر خود بخود اعتماد پیدا ہو جائے گا اور فتح تمہاری ہوگی۔ اختر! اپنے کو غمناک مت کر لیا کرو، زندگی ایک ہی بار ملتی ہے آؤ مل کر اسے جو کچھ بھی نچوڑ سکتے ہیں نچوڑ لیں۔ اپنے لئے اپنے بچوں کے لئے۔'' (زیر لب صفحہ ۱۴۶)

''زیر لب' کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ احساس و تجربہ بہت شدت سے ہوتا ہے کہ مرد عورت کا ازدواجی رشتہ صرف جنسی تعلقات کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک سماجی، تہذیبی، پاکیزہ اور ذمہ دارانہ تعلق ہوتا ہے جو مرد اور عورت کی زندگی کا وہ خوبصورت پہلو ہوتا ہے جس کو چھوٹے چھوٹے معمولی گھریلو کاموں اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں محسوس

کیا جا سکتا ہے ۔تمام خطوط کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ ساری باتیں آئینہ در آئینہ سامنے آتی جاتی ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ ہمارے ہی گھر کی داستان ہے۔

اس ضمن میں نینی تال سے ۲۱/ جون ۱۹۵۰ء کو لکھے گئے خط کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:۔

''آج یہاں سے کوچ کا دن ہے ۔ بچوں کی تصویریں اتروائی ہیں آج بن کر آ جائیں گی ۔لکھنؤ سے تم کو بھیجوں گی ۔ ایک تصویر بچوں کے ساتھ میری بھی ہے۔دیکھو کیسی آتی ہے۔یہ دن بھی کیسی محرومی میں گذر گئے ۔ہم دونوں کی صحبتیں کتنی رنگین کتنی بھرپور اور کیسی دلچسپ ہوتی ہیں۔اختر! میں نے زندگی میں تم سے دوستی رفاقت سرپرستی،شفقت سبھی چیزیں پائیں۔تمہیں پا کر مجھے زندگی میں کسی کی بھی ضرورت باقی نہ رہی ۔کتنی بھٹکی ہوئی زندگی ، کتنے متلاشی جذبات کو پناہ مل گئی اختر! تم میرے لئے بہت قیمتی ہو زندگی ہی کے برابر۔''

(زیرلب،صفحہ نمبر۵)

زیرلب کے اس پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے فراق گورکھپوری تحریر کرتے ہیں:

''یہ خطوط ایک انسانی نوشتہ یادستاویز Human Document ہے جس کی مثال بسا اوقات اچھے اور کامیاب ادب میں بھی ہمیں نہیں ملتی ان خطوط کی ادبیت اگر تابناک ہے تو ان کی انسانیت تابناک تر ہے۔ ہر خط میں ایک من موہنی شخصیت کا دل دھڑکتا ہوا سنائی اور دکھائی دیتا ہے۔آپ بیتی اور جگ بیتی کا سنگم ہر خط میں نظر آتا ہے۔'' (زیرلب،صفحہ ۵)

خطوط کا نجی ہونا لازمی ہے لیکن نجی باتوں میں رنگا رنگی دلچسپی اور عمومیت پیدا کرنا ایک اچھے مکتوب نگار کا کام ہے۔ ایک اچھا مکتوب نگاران باتوں میں وہ رنگ بھر دیتا ہے کہ ہمیں یہ باتیں اپنی ہی داستان معلوم ہونے لگتی ہیں۔ صفیہ کے خطوط کا ایک ایک لفظ قاری کی شخصیت میں اتر کر جذبات کو متحرک کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ''زیرلب'' کے خطوط میں جہاں ہندوستانی گھرانوں کی بھرپور عکاسی ملتی ہے وہیں صفیہ ایک ہندوستانی شوہر پرست بیوی کے روپ میں بھی سامنے آتی ہے۔ کاتب نے چھوٹی چھوٹی باتوں کو اتنے انوکھے انداز میں بیان کیا ہے کہ قاری کو سچ مچ آپ بیتی میں جگ بیتی کا احساس ہوتا ہے۔ بچوں کا ذکر بچوں کی آپس میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر بحث نوکروں کا ذکر، گھر کے دوسرے افراد کے ساتھ ساتھ گھر کے ساز وسامان کا ذکر تخت پوش فرشی، لباس مثلاً کرتے پاجامے اور ساڑھیوں تک کا ذکر ان خطوط میں ملتا ہے۔ جس کسی نے بھی ان خطوط کا مطالعہ کیا انہیں اپنے طور پر محسوس کیا اور ان میں اپنی زندگی کے واقعات ڈھونڈنا شروع کیے۔ یعنی

کہانی میری روداد جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اُسی کی داستان معلوم ہوتی ہے

خطوط نہ صرف کاتب اور مکتوب الیہ کے راز ہائے دروں کو اُجاگر کرنے میں مدد گار ثابت ہوتے ہیں بلکہ خطوط کے ذریعے ایک شخص کے مکمل کردار کی عکاسی ہوتی ہے۔ مثلاً صفیہ اختر ان خطوط کے ذریعے ایک ہندوستانی شوہر پرست خاتون کے طور پر سامنے آتی ہے جو اپنی ذات سے زیادہ خیال اپنے گھر کے افراد اور ان کی خواہشات اور پسند نہ پسند کا خیال رکھتی ہیں اور اُسی میں زندگی کی تمام خوشیاں محسوس کرتی ہیں۔ یہ خطوط ایک ایسی ہندوستانی عورت کے متلاطم جذبات کی رودادِ بیان کرتے ہیں جو اپنے شوہر کے ہجر کے غم میں اندر ہی اندر پگھلتی رہتی ہیں مگر اُف تک

نہیں کرتی۔ بقول کرشن چندر

''ان خطوط کے اندر ہی اندر مجھے اپنے پرانے کلچر کی دھیمی دھیمی رو بہتی ہوئی ملتی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کالی داس کے میگھ دوت کا ہجر، اس کی تمنائے وصال، اس کی محرومی وناکامی سینکڑوں برس کے بعد آج بھی زندہ ہے اور اس طرح نازک دلوں کو برماتی ہے۔ مجھے معلوم ہوتا ہے جیسے صفیہ کی یہ نازک نسائی تحریریں ڈاک میں نہیں بھیجی گئی ہیں بلکہ باول کے ٹکڑوں پر اُتار دی گئی ہیں۔'' (زیرلب، صفحہ نمبر ۱۲)

ایک خط کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں جو کرشن چندر کے مندرجہ بالا اقتباس کی دلیل پیش کرتا ہے

''حسب اندیشہ تم نے رخصت ہوتے ہی خیریت کو ترسا دیا۔ ہر دن اسی انتظار میں کٹتا رہا کہ اب تو تمہارا خط ضرور آتا ہی ہوگا..................''

''میں ہوں اور رازیائے سینہ گداز''

اعصاب کی سنسناہٹ اور خاموشی بعض وقت ناقابل برداشت سی بن جاتی ہے۔ ہر چیز فریب سی معلوم ہونے لگتی ہے۔ بہر حال تم نہ گھبراؤ جانتے ہو کہ میں خاصی بہادر ہوں............البتہ اپنی خیریت سے محروم نہ کرو۔ فوراً خط لکھو۔''

(زیرلب، صفحہ نمبر ۲۷۸)

جس طرح ہمارے سماج میں عام طور پر اس خیال کو بھرپور مانا جاتا ہے کہ عورت کو بھی مرد کے برابر چلنے کا پورا حق ہے۔ دونوں کو کندھے سے کندھا ملا کر چلنا چاہئے

کیوں کہ دونوں ہی زندگی نام کی اس گاڑی کے دو پہیوں کی طرح ہیں جن میں سے اگر ایک بے کار ہو جائے تو یہ گاڑی نہیں چل سکتی۔ زندگی کے دوسرے کاموں کی طرح جذبۂ عشق میں بھی وہ برابر کی حصہ دار ہے۔ عورت خود عشق کرتی ہے اور مرد کو اپنا محبوب تصور کرتی ہے۔ اس جذبے کا اظہار کرنا کوئی گناہ نہیں بلکہ وہ اس کا حق ہے اور اس کی جذباتی زندگی کی معراج بھی۔ صفیہ اختر خطوط کے ذریعے اس جذبے کو جس خلوص، پاکیزگی اور خوبصورتی سے ادا کرتی ہیں وہ اس کی رفعتِ احساس کی دلیل ہے۔ وہ اپنے خطوط میں ایک عاشق کی حیثیت سے سامنے آتی ہیں جو اپنے محبوب کو ٹوٹ کر چاہنے پر یقین رکھتی ہیں۔

ملاحظہ ہو ایک خط کی چند سطریں

> ''اچھے اختر! تم مجھے اتنے عزیز کیوں ہو؟ جانتی ہوں کہ میری اس محبت میں دیوانگی کا بڑا حصہ ہے۔ جی چاہتا ہے کہ دُنیا کی ہر مصلحت کو ٹھکرا کر تمہیں چاہوں لیکن پھر تمہیں چاہنے ہی سے تو مجھے دنیا کی ہر مصلحت بھی حاصل ہو جاتی ہے۔''
>
> (زیرلب، صفحہ ۳۲)

''زیرلب'' کے خطوط میں صفیہ ایک طرف ہمارے پرانے ہندوستانی کلچر کی نمائندگی کرتی ہیں تو دوسری طرف اس میں ایک نئی ہندوستانی عورت کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ وہ عورت جو بیوی ہونے کے ساتھ ساتھ رفیق، ساتھی، غم خوار، ہم راز سب کچھ ہے جو زندگی کو چلانے کے لئے مرد کا ہر حال میں ساتھ دینے کے لئے تیار ہے۔ وہ صرف مرد کے بازوؤں کی زینت نہیں ہے بلکہ مرد کا ایک بازو ہے جس کی طاقت کے بغیر وہ ادھورا ہے۔ وہ ایک ایسی توانائی ہے جو اپنے شوہر سے الگ ہٹ کر بھی سوچ سکتی ہے اور اس کے ساتھ رہ کر بھی۔ ایک ایسی عورت جو ایک طرف اپنے

شوہر کی پرستش کرتی ہے اور دوسری طرف اُسی کی ناقد اور ناصح بن جاتی ہے۔ کبھی اس پر جملے کستی ہے تو کبھی ماں کی ممتا جتاتی ہے۔ کبھی بہن کا پیار دیتی ہے تو کبھی ایک عجیب انداز سے شفیق باپ کی طرح نصیحت کرتی ہے اور کبھی ایک بھائی کی طرح ہر کام میں ہاتھ بٹاتی ہے۔ ایک خط کے چند جملے ملاحظہ ہوں:۔

> تم لکھنؤ آؤ گے تو میری اُجڑی ہوئی دنیا ایک بار پھر آباد ہو جائے گی۔ جادو اور اویس کی پیار بھر نظریں تم پر پڑیں گی تو تمہارا خون چلوؤں بڑھ جائے گا۔ اختر تم ضرور آنا آؤ تمہاری پیشانی پر ایسا پیار کر لوں جس میں ماں کی شفقت بہن کا فخر، بیوی کا ایثار اور دوست کی ملائمت سبھی شامل ہو کر میری جان۔
>
> (زیرلب، صفحہ 39)

مکاتیب صفیہ ہمارے سماج کی ناہمواریوں کے عکاس بھی ہیں۔ خطوط سے سماجی غیر متوازن کیفیت کا پورا پورا احساس ہوتا ہے۔ صفیہ کا احساس ہجر ہمارے سماج کی ہر عورت کا احساس ہجر معلوم ہوتا ہے۔ ان کے گھر کے نہ آسودہ حالات پورے سماج کی نہ آسودگی کا احساس دلاتے ہیں۔ لیکن وہ ایک بہادر عورت کی حیثیت سے پورے ہمت اور حوصلے کے ساتھ نہ آسودہ حالات کو بدلنے کی متلاشی نظر آتی ہیں۔ ایک مثبت سوچ لئے ہر اس مصیبت کے ساتھ لڑنے کا حوصلہ رکھتی ہے جو اس کے راستے میں آتی ہے اس امید کے ساتھ کہ ایک نہ ایک دن اس اندھیری رات کی صبح ضرور ہوگی۔

مثلاً ۲۲: دسمبر ۱۹۴۹ء کو اختر کے نام لکھے گئے ایک خط میں کس ہمت کے ساتھ زندگی جینے کی تلقین کرتی ہیں ملاحظہ فرمائیں۔

> ''خود کو کسی طرح متاثر نہ کرنا۔ اچھے برے وقت سب گزر جاتے ہیں۔ ہر پریشانی کا مقابلہ عزم اور استقلال سے کرنا

اخلاقی بلندی کی دلیل ہے ۔ جذباتی طور پر اپنی بے روزگاری
کا صدمہ نہ لے بیٹھنا............میرے دوست میں تم سے علیحدگی
کے دن پوری ہمت اور پورے استقلال سے گزار لوں
گی............

بہت سے لوگ تو ہم سے بھی زیادہ پریشانیاں اُٹھا رہے ہیں
،ہمیں ان کی طرف دیکھنا ہوگا اپنے غم کو میں طول نہیں دوں گی ۔''

(زیرلب،صفحہ۱۴)

جب انسانی جذبات کی بات آتی ہے تو ہمیشہ یہ کہنے میں آتا ہے کہ سچی محبت کو کبھی وصال حاصل نہیں ہوتا۔ سچی محبت کا نام پانا نہیں بلکہ قربانی ہے یعنی جس کو تم چاہو اس کے لئے زندگی تک قربان کرنے سے دریغ نہ کرو۔صفیہ کے ہاں ہمیں محبوب کے وصال کی شدید تڑپ ملتی ہے اور اسی تڑپ کے ساتھ وہ اس جہانِ فانی سے کوچ کر جاتی ہیں جو نہایت دردناک ہے۔مثلاً خطوط سے اخذ کئے گئے چند جملے ملاحظہ ہوں

'کبھی تو آؤ' آؤ میں تمہیں اپنی باہوں میں بھرلوں،آؤ میں تمہارے سینے پر سر رکھ کر رولوں،آؤ مجھے اپنی باہوں کے دائرے میں قید کرلو،آؤ تمہارے سینے سے سر لگا کر سکون کے چند لمحے چرالوں،آؤ میں تم میں جذب ہو کر خود کو بھلا دوں،وغیرہ

جان لیوا بیماری میں مبتلا ہونے کی وجہ سے جب وہ موت کو اپنے قریب محسوس کرتی ہیں لیکن پھر بھی زندگی جینے کی ایک امید ہمیں ان کے ہاں دکھائی دیتی ہے۔ ۲۹/دسمبر۱۹۵۲ء کو لکھے گئے اپنے آخری خط میں وہ یوں رقمطراز ہیں:

''اختر آؤ۔تم مجھے مرنے نہ دو میں مرنا نہیں چاہتی البتہ میں
تھک بہت گئی ہوں ساتھی۔آؤ میں تمہارے زانو پر سر رکھ کر ایک
طویل نیند لے لوں ۔ پھر تمہارا ساتھ دینے کیلئے ضرور ہی کھڑی

ہو جاؤں گی۔

زندگی کی دوڑ میں اُتار چڑھاؤ تو آتے ہی رہتے ہیں۔ زندگی کے ان متلاطم تھپیڑوں کو جو شخص مسکرا کر برداشت کرتا ہے اور ناسازگار حالات کی کبھی شکایت نہیں کرتا اصل میں وہی شخص مر کر بھی زندہ رہتا ہے۔ صفیہ بھی انہیں ہستیوں میں سے ایک تھی جنہوں نے زندگی کو خدا کا دیا ہوا ایک نایاب تحفہ مانا ہے اور مسکرا کر حالات کا مقابلہ کیا ہے۔ صفیہ کے خطوط کا مطالعہ کرتے وقت قاری کو ان کے ہاں جو مثبت سوچ کی جھلک دکھائی دیتی ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ زندگی سے بہت محبت کرتی تھیں۔ رضیہ سجاد ظہیر نے اختر کے نام لکھے گئے خط میں اس بات کا ذکر کچھ یوں کیا ہے:

> ''میں تم سے پھر وہی بات کہوں گی اختر کہ صفیہ مری نہیں کیوں کہ وہ مر نہیں سکتی۔ جو روح زندگی سے اتنی محبت کرتی ہو، گرمئی جدو جہد پر اتنا یقین رکھتی ہو، جس کی دل کی وسعتیں ناپیدا کنار ہوں، کیا وہ محدود ہو سکتی ہے۔ ختم ہو سکتی ہے۔ مر سکتی ہے۔ ناممکن، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ وہ ہستی جو ہمیشہ زندگی کی بہتری کی جدو جہد کے لئے قربانی دیتی رہی کسی خوب تر پیکر کی جستجو میں ہم لوگوں کو چھوڑ گئی ہو۔'' (زیرلب، صفحہ ۷)

فیض کے خطوط کے ادبی حوالے

سائمہ منظور
لیکچرر محکمہ اعلیٰ تعلیم

آج کے دور میں لفظِ خط اتنا پرانا ہو چکا ہے جتنا کہ خود خطوط نویسی کا رواج۔ آج تو لوگ موبائل فون کے ذریعے ایک پل میں اپنے عزیزوں سے براہِ راست مخاطب ہوتے ہیں، نہ صرف آواز کا رابطہ ہوتا ہے بلکہ تصویر بھی موبائل کے سکرین پر دستیاب ہو جاتی ہے۔ آج کل پیغام لکھے جاتے ہیں نہ پڑھے جاتے بلکہ بولے اور سنے جاتے ہیں۔ آج ہجر و وصال کے معنے وہ نہیں جو نصف صدی پہلے تک تھے۔ گویا آج کی دُنیا بالکل الگ خطوط پر چل رہی ہے۔ مگر ایک زمانہ تھا جب لفافے میں بند کاغذ کا ایک ٹکڑا اپنے چند حروف کے ساتھ کسی بھی انسان کے لئے بے حد اہم ہوتا تھا اور لوگ ڈاکئے کا انتظار اس طرح کرتے تھے گویا وہ قاصد نہ ہو کر قریبی عزیز ہو۔ پھر جب قاصد کسی کا خط اس کے حوالے کرتا تھا تو خوشی کا عالم دیکھنے لائق ہوتا تھا۔ بقول اسرار لکھنوی:

آپ کا خط نہیں ملا مجھ کو　　　　دولتِ دو جہاں ملی مجھ کو

کوئی زمانہ تھا جب لوگ اپنے عزیزوں کو خط لکھتے تھے اور انہیں پہنچانے کا کام کبوتروں سے لیتے تھے۔ مگر یہ بھی صرف چند امیر لوگوں تک ہی محدود ہوگا اور ظاہر ہے کہ غریب لوگ اپنے دُور دراز بسنے والے عزیزوں کو بس قدرت کے آسرے پر ہی چھوڑتے ہوں گے۔ شروع شروع میں جب خط لکھنے کا آغاز ہوا تو لکھنے کے لئے

چمڑے یا بھوج پتر وغیرہ کا استعمال ہونے لگا تھا۔ تب عام لوگ اس سے بھلا کیا ہی فائدہ اُٹھاتے ہوں گے۔ پرانے ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ چین میں 105ء میں کاغذ بننا شروع ہو گیا تھا۔ مگر عرب اور یونان وغیرہ میں اس کا چلن آٹھویں صدی عیسوی میں ہی ہوا۔ تب ظاہر ہے کہ محض لکھنے کا ہی رواج شروع ہوا تھا۔ جبکہ باقاعدہ خط و کتابت کی شکل میں پیغام رسانی کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب برطانیہ میں رولینڈ ہِل نامی ایک شخص نے [Penny post system] کے نام سے ایک سلسلۂ پیغام رسانی شروع کیا۔ اس کے تحت کوئی بھی آدمی محض ایک سکّہ [pence] دیکر اپنا خط ملک کے کسی بھی حصّے میں بھجوا سکتا تھا۔ ہندوستان میں یہ سہولت اور بھی دیر سے پہنچی۔

لگ بھگ اُسی زمانے سے شاعروں نے بھی ڈاک خدمات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے آپس میں یا عزیزوں کے ساتھ خط و کتابت شروع کی تھی جو چلتے چلتے زمانۂ جدید تک پہنچی۔ مگر چند سال پہلے یہ فنِ خطوط نویسی ٹیکنالوجی سے ملنے والے زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے اگر پوری طرح دم شکستہ نہیں ہوا تو کم از کم [coma] میں ضرور چلا گیا ہے۔...... اس کے باوجود خطوط نویسی کی روایت نے اپنے پیچھے اتنا بڑا ورثہ چھوڑا ہے کہ آج بھی خطوط نویسی چلے نہ چلے اس کا نام برابر زندہ رہے گا۔ خاص کر شعراً و ادباً کے حوالے سے دیکھا جائے تو ان لوگوں نے اپنے خطوط کے ذریعے بھی ادب کے دامن کو خالص موتیوں سے بھر دیا ہے۔ اُردو ادب کی خوش نصیبی ہے کہ اس کے پاس ایسے شعراء کے خطوط یا ان کے عکس موجود ہیں جو اپنے آپ میں ادب کے ستون کہلانے کے مستحق ہیں۔ اس حوالے سے اگر بات کی جائے تو ظاہر ہے کہ ایک ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے جس کے لئے کافی وقت درکار ہے۔ پھر بھی اس حوالے سے کہ ہمارے اُردو شعراء کی نظر میں خطوط نویسی کی کیا اہمیت تھی، چند اشعار پیش کر کے اپنے موضوع کا رُخ کرتی ہوں۔ چنانچہ اختر شیرانی لکھتے ہیں:۔

مِٹ چلے میری اُمیدوں کی طرح حرف مگر
آج تک تیرے خطوں سے تیری خوشبو نہ گئی

قمر بدایونی کہتے ہیں:ـ

نامہ بر تو ہی بتا تو نے تو دیکھے ہوں گے
کیسے ہوتے ہیں وہ خط جن کے جواب آتے ہیں

مرزا غالبؔ کہتے ہیں: ـ

دے کے خط مُنہ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

اور کیف بھوپالی خط کے حوالے سے یوں کہتے ہیں:ـ

کیسے مانیں کہ انھیں بھول گیا تو' اے کیفؔ
اُن کے خط آج ہمیں تیرے سرہانے سے ملے

ان چند مثالوں سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اُردو شعراً کی نظر میں خطوط نویسی کی بے حد اہمیت تھی چنانچہ انھوں نے خود بھی اپنے خطوط سے اُردوٗ ادب کو مالا مال کیا ہے۔مگر فی الحال میں نے اپنے مقالے کو اُردوٗ کے محض ایک مایۂ ناز شاعر فیض احمد فیضؔ کے خطوط تک محدود رکھا ہے۔

فیض احمد فیضؔ کے مطبوعہ خطوط کی مجموعی تعداد تین سو تیس کے قریب ہے۔ان میں سے زائد از نصف خطوط فیضؔ نے اپنی اہلیہ اور بچّوں کو لکھے ہیں۔اہلیہ کے نام صرف انگریزی میں، جبکہ بچّوں کے نام انگریزی و اُردو دونوں ہی زبانوں میں خط لکھے ہوئے ملتے ہیں۔باقی تمام خطوط اُردو میں ہیں۔فیض کی اہلیہ بیگم ایلس کے نام لکھے خطوط کا خود انہوں نے ہی اُردو ترجمہ بھی کیا، جسے 1971ء میں ''صلیبیں میرے دریچے میں'' کے عنوان سے شائع کیا گیا۔فیضؔ کے [55] سے زیادہ خطوط 1988ء

میں ''دامنِ یوسف'' کے نام سے شائع ہوئے جو سب کے سب محترمہ سرفراز اقبال کے نام لکھے گئے تھے۔ پھر 2011ء میں فیضؔ کے [38] خطوط کا مجموعہ ''فیضؔ بہ نام افتخار عارف'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔ ظاہر ہے یہ سبھی خط افتخار عارف کو لکھے گئے تھے۔ فیض کے زائد از نصف خطوط صنف نازک کے نام ہیں جن میں بیوی بیٹیاں اور دیگر خواتین شامل ہیں۔ فیضؔ کے مجموعۂ خطوط ''صلیبیں میرے دریچے میں'' کے متعلق اشفاق احمد اعظمی اپنے ایک مضمون ''صلیبیں میرے دریچے میں - ایک مطالعہ'' میں لکھتے ہیں:

> ''صلیبیں میرے دریچے میں...... میں ایک سو پینتیس خطوط فیضؔ کی اہلیہ ایلس فیض کے نام ہیں اور آخر میں دو صفحے میں چند چھوٹے چھوٹے خطوط ان کی بچیوں سلیمہ اور منیزہ کے نام ہیں۔ جو اُنہوں نے ایام اسیری میں لکھے تھے۔ اس دوران میں وہ مختلف جیلوں میں منتقل کئے جاتے رہے۔ جون 1951 عیسوی تا مئی 1953ع حیدرآباد سندھ میں وہ قید رہے جہاں انہوں نے کل 92 خطوط لکھے۔ جون 1953ع تا اگست 1953ع آٹھ خطوط اور باقی 35 خطوط 1953ع تا اپریل 1955ع منٹگمری (ساہیوال) جیل میں لکھے۔ اس طرح ان خطوط میں فیضؔ کی زندگی کے دو تین ماہ کم چار سال کے حالات اور محسوسات قلمبند ہیں''۔
>
> [فیض فہمی ص ۱۰۲۶]

بقول تقی عابدیؔ: ''بڑی شخصیات کی چھوٹی باتیں بھی اس لئے بڑی ہوتی ہیں کہ ان سے بڑے بڑے مسائل اور وسائل کا پتہ چلتا ہے۔'' ......اور جہاں تک فیضؔ کی

بات ہے تو ان کے خطوط بے حد معلوماتی ہیں۔ان کے ذریعے ہمیں ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں مثلاً اہل وعیال سے حسنِ سلوک، اُن کے مطالعے، ذوق وشوق، دوست واحباب، ان کی تخلیقات کے محرکات نیز ان کی سیاسی وسماجی زندگی کے متعلق کافی معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ساتھ ہی ان خطوط سے ان کی شاعری کو بہتر طریقے سے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔یہاں میرا مقصد چونکہ ان کے خطوط کا ادبی مطالعہ کرنا ہے لہٰذا اسی حوالے سے چند باتیں آپ کے سامنے رکھتی ہوں۔

فیض کے تیس سے زائد خطوط میں ان کتابوں کے نام اور اشارے ملتے ہیں جن کا انہوں نے مطالعہ کیا تھا۔انھی خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ فیض نے جن کتابوں کا مطالعہ کیا ان میں سے (36) سے زائد کتابوں کے نام بھی ان خطوط سے معلوم ہوتے ہیں۔ مذکورہ (36) کتابوں میں نکلسن کی تاریخ ادبیاتِ عربی، شاہ عبداللطیف بھٹائی کے تراجم، رادھا کرشنن کی تاریخ فلسفۂ ہند، عروض کی کتابیں، نیز چیخوف کی (Three sisters) وغیرہ مشہور کتابیں بھی شامل ہیں۔میرا خیال ہے کہ اگر فیضؔ کے خطوط کتابی شکل میں چھپ کر سامنے نہ آتے تو ہم ایک ادبی سرمائے سے خالی ہاتھ رہ جاتے۔یوں تو فیض احمد فیضؔ کے زیادہ تر خطوط میں ادبی مواد موجود ہے۔لیکن ان کی بیگم ایلس کے نام لکھے گئے خطوط میں ادبی حوالے بہ درجۂ اتم موجود ہیں، چنانچہ اس مقالے میں اختصار کا پہلو دھیان میں رکھتے ہوئے میں بیگم ایلس کے نام لکھے گئے چند خطوط کو ہی بطور مثال پیش کرتی ہوں۔ملاحظہ کیجئے:

ایلس کے نام 9 نومبر 1951 عیسوی میں لکھے گئے خط کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''اپنی نئی نظمیں ایک نئے مجموعے کے لئے محفوظ رکھنا چاہتا
> ہوں۔یہاں آنے کے بعد بالکل غیر شاعرانہ کیفیت طاری ہے

لیکن میں جانتا ہوں کہ لیلائے سخن جلد لوٹ آئے گی۔''......

(فیض فہمی،ص945)

اسی طرح 28 نومبر 1951ع میں لکھے گئے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''کل رات ایک نئی غزل مکمل ہوئی۔کوئی ساڑھے دس بجے میں نے سب ساتھیوں کو سننے کے لئے بستر سے اُٹھایا۔اس کے معنی ہیں کہ آگ ابھی بجھی نہیں۔اور یہ ہے تو کسی چیز کا کیا غم''۔

(فیض فہمی،ص945)

14 دسمبر 1951ع کے ایک خط میں فیضؔ اپنی شاعرانہ کیفیت کا ذِکر کرتے ہوئے اپنے کلام پر خود ہی تنقید بھی کرتے ہیں۔چنانچہ لکھتے ہیں:

''تمھارے جانے کے بعد ہم ایک نظم میں اُلجھ گئے تھے جو آج ہی ختم ہوئی ہے۔شاعری کا دورہ کبھی کبھی پڑتا ہے اور جب پڑتا ہے تو ڈر لگتا ہے کہ اگر توجہ ذرا اِدھر اُدھر ہوئی تو یہ کیفیت کافور ہو جائے گی۔یہ نظم جو ابھی ہوئی ہے ایک طرح کا ترانہ ہے جو میں نے پہلے نہیں لکھا۔شعر تو شاید اچھے نہیں ہیں لیکن نعرے بازی بُری نہیں ہے''۔

(فیض فہمی،ص945)

اسی طرح 15 جنوری 1952ع کے خط میں اپنی ذہنی تھکاوٹ کا احوال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تین نظمیں لکھنے کے بعد دماغ تھک سا گیا ہے۔لیکن مجھے امید ہے کہ تھوڑے دنوں کے بعد پھر اِدھر رجوع کر سکوں''۔ (فیض فہمی،ص945)

شاعر کو شعر کہنے میں کس قدر ذہنی مشقت ہوتی ہے ،اس کا نقشہ فیضؔ نے 22 جنوری 1952ع کے ایک خط میں یوں کھینچا ہے۔ لکھتے ہیں:

''ایک دو نظمیں آدھی رکھی ہیں، جنہیں ختم کرنے کو بہت جی چاہتا ہے لیکن دماغ کام ہی نہیں کرتا۔ دوبارہ انتظار میں ہوں کہ عروسِ سخن لوٹ آئے۔ (فیض فہمی، ص945)

اچھا شعر کہنا شاعر کی اپنی مرضی کی بات نہیں بلکہ اس کے لئے الہامی کیفیت کا طاری ہونا لازمی ہے۔ اس بابت فیضؔ نے 23 مئی 1952ع کے خط میں کسرِ نفسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود کو دوسرے درجے کا شاعر لکھا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''میں لگا تار لکھ رہا ہوں۔ شاید زیادہ نہیں لکھا جا رہا ہے لیکن نہ لکھنے سے بہتر ہے۔ پھر اپنی مرضی یا ارادے سے تو شعر نہیں لکھا جاتا۔ بعض اوقات دو چار مصرعے صاف کرنے میں کئی دن لگ جاتے ہیں۔ اور جب تک سب دماغی کام رُکا رہتا ہے۔ غالباً یہ دِقعت ہم جیسے دوسرے درجے کے لکھنے والوں کو ہی پیش آتی ہے۔ اس لئے کہ ہمارے اوزانِ ہنر ناقص اور نا تسلّی بخش ہیں''۔

(فیض فہمی، ص946)

فیضؔ اس بات کے ایک حد تک قائل تھے کہ شاعر یا ادیب کو کچھ بھی نہ لکھنے سے کچھ لکھنا ہی بہتر ہے۔ دوسری بات یہ کہ شاعری کی کیفیت لگا تار نہیں رہتی بلکہ آتی جاتی رہتی ہے اور اکثر ایک کیفیت کا ادھورا چھوٹا ہوا کام کہیں دوسری تیسری کیفیت میں پورا کرنا پڑتا ہے۔ اُردو داں طبقہ اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ فیض کا ابتدائی کلام رومانی جذبے سے سرشار ہے۔ جب وہ حسرت موہانی اور اختر شیرانی سے متاثر تھے۔ لہٰذا اس کا اظہار بھی ان کے اس خط میں بخوبی ملتا ہے۔ اس کے متعلق 9

جولائی 1952ع کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میرا گذشتہ خط مِل چکا ہوگا جس کے ساتھ ایک نظم بھی بھیجی تھی۔ دو اور لکھ چکا ہوں، غالبًا ان میں سے ایک ایسی بُری نہیں ہے۔اس طرح بہت سے ادھورے کام کا بقیہ جس کا بوجھ ذہن پر تھا صاف ہو چکا ہے۔ کچھ نامکمل نظمیں تھیں کچھ متفرق اشعار تھے۔ یہ سب مکمل ہو چکے ہیں اور اب کوئی نئی چیز شروع کرنے کا ارادہ ہے لیکن اس طرح کی تحریروں سے اپنی تسلّی نہیں ہوتی۔ بیشتر اوقات صرف مایوسی اور آزردگی کا احساس ہوتا ہے اور جو بھی لکھا ہو بہت معمولی اور سطحی معلوم ہوتا ہے۔ ماضی میں ایسا نہیں تھا۔اُن دنوں ہم دل سے بہت مجبور ہو کر کبھی کبھار کچھ لکھتے تھے اور یہ اکثر کھر امال ہوتا تھا۔لیکن اپنے پر جبر کر کے مشق کے طور سے لکھنا بالکل دوسری چیز ہے۔اس میں جذبۂ دل کبھی ساتھ دیتا ہے کبھی نہیں دیتا۔ خیر اس میں یہ فائدہ تو ہے کہ کچھ نہ کچھ لکھا جاتا ہے۔ اور بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہنا بہ ہر طور بہتر ہے کچھ بھی نہ لکھنے سے۔لیکن میں اس بات کا زیادہ قائل نہیں ہوں''۔

(فیض فہمی،ص946)

بیگم ایلس کا مشرقی نام 'کلثوم' تھا اور یہ کہ اصطلاحات کے استعمال کے معاملے میں فیض بہت محتاط تھے۔اس بات کی تائید 12 اکتوبر 1952ع میں لکھے گئے ایک خط کے اس اقتباس سے بھی ہوتی ہے:

''رؤف سے کہہ دینا کہ آخری تین مصرعوں میں ہم شاید

کچھ ترمیم کریں۔لیکن اگر کچھ اور ذہن میں نہیں آتا تو جیسے ہیں
ٹھیک ہیں۔رہی انتساب کی بات تو اگر تم اپنے آپ کو ایلس کہنا
چاہتی ہو تو تمہیں اختیار ہے اس لئے کہ کتاب بھی تمھاری ہے۔
میں نے کلثوم اس لئے لکھا تھا کہ اوّل تو یہ مشرقی نام ہے۔
دوسرے یہ کہ اس کے بارے میں لوگ تم سے یہ سوال ضرور
کریں گے جو شاید تمھارے لئے تفریح طبع کا سامان ہو۔ بہ ہر
حال جو تمھارا جی چاہے کرو۔صرف ''میری بیوی کے نام'' پر
مجھے اعتراض ہوگا۔ یہ انگریزی میں تو ٹھیک ہے مگر اُردو میں کچھ
چھچھورا معلوم ہوتا ہے''۔

(فیض فہمی،ص947)

فیضؔ ایک بلند حوصلہ انسان تھے اور جیل کی چار دیواری بھی ان کے ادبی شوق کو مقیّد کرنے میں ناکام رہی تھی۔ چنانچہ جیل کے اندر رہ کر بھی وہ اپنی مطبوعات و تراجم کی نگرانی کرتے تھے،جس کی وضاحت ان کے خطوط سے بھی ہوتی ہے۔اس حوالے سے ایک خط کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''دستِ صبا کے ترجمے کے بارے میں وکٹر کا خط آیا تھا۔
ساری کتاب کا ترجمہ شاید ضروری نہ ہو۔غالباً بہتر ہوگا کہ دونوں
کتابوں سے انتخاب کرلیا جائے۔اس طرح کام کم ہو جائے گا
اور وکٹر نقشِ فریادی کے بہت سے حصّے کا ترجمہ بھی کر چکے ہیں۔
تم لوگ آپس میں طے کرلو''۔

(فیض فہمی،ص948)

ادیب اپنے ماحول سے متاثر ہو کر لکھتا ہے۔ساتھ ہی وہ دوسرے ادیبوں سے

بھی متاثر ہوتا ہے، اور یہ بات فیضؔ مرحوم پر بھی صادق آتی ہے۔ اس بات کا علم بھی ہمیں فیضؔ کے 22 مئی 1954ع کے ایک خط سے ہوتا ہے جس کا اقتباس دیکھئے:

''دو مختصر نظمیں بھیجتا ہوں۔ ایک لاہور جیل کا تاثّر ہے اور دوسری روزن برگ خطوط سے متاثّر ہو کر لکھی گئی ہے۔ ان میں ایسی کوئی کمال کی بات نہیں لیکن شاید وکٹر کو ترجمے کے لئے پسند آئیں''۔ (فیض فہمی، ص948)

فیض کسی بھی زبان کو لے کر تنگ نظر نہیں تھے اور نہ کسی قسم کا تعصّب رکھتے تھے۔ وہ اپنی مادری زبان پنجابی میں لکھنا بھی اُتنا ہی پسند کرتے تھے جتنا کہ اُردو میں۔ کوئی اگر یہ کہہ دے کہ فیضؔ کو پنجابی شاعری کا بھی شوق تھا لیکن بیگم ایلس اس کی مخالف تھیں، تو یہ بات ہمیں شاید آسانی سے قبول نہ ہو۔ مگر خود انہی کا خط مورخہ 9 جولائی 1952ع اس بات کی دلالت کرتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''میں بہت دنوں سے سوچ رہا ہوں کہ کیوں نہ پنجابی میں لکھنا شروع کر دوں اور دیکھوں کہ اپنی مادری زُبان میں کیسا لکھا جاتا ہے۔ اُردو ایسی مرصّع زُبان ہے کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا، اسے اپنے عوام تک پہنچانے کے لئے کس ڈھب سے لکھیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم جیسے پنجابی کے مخالف اس پر برہم ہوں گے لیکن زبان کے بارے میں تنگ نظری اور تعصّب بہت غیر معقول بات ہے''۔

(فیض فہمی، ص948)

فیضؔ امرتسر کے ایک کالج میں پروفیسر تھے اور انگریزی تسلّط کے دوران فوج میں افسر بھرتی ہو گئے تھے۔ اور اس بات پر انہیں بظاہر پچھتاوا بھی تھا کیوں کہ انہیں

اپنے اندر ایک اُستاد کی صلاحیتیں زیادہ محسوس ہوتی تھیں۔ نیز یہ کہ فیضؔ مرزا غالب کے بڑے مداح تھے۔ یہ بات بھی ان کے ایک خط سے عیاں ہوتی ہے:

'' آج کل رات کو کھانے کے بعد میں اپنے ساتھیوں کو غالبؔ کی شاعری کا درس دیتا ہوں اور بہت لطف آتا ہے۔ اپنی بڑائی کی بات نہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ میں بہت اچھا اُستاد ہوں ۔اور مجھے مُدرّسی چھوڑ کر کبھی فوج میں نہیں جانا چاہئے تھا''۔ (فیض فہمی، ص948)

یہ چند مثالیں ہمیں یہ باور کرانے کے لئے کافی ہیں کہ فیضؔ کے خطوط اُردو ادب کے محققین کو فیضؔ کی ادبی، سماجی اور گھریلو زندگی کے کئی اہم گوشوں سے روشناس کراتے ہیں۔ ساتھ ہی کہیں کہیں ان کے معاصرین سے متعلق ان کے خیالات اور باہمی روابط کے متعلق بھی اچھی خاصی واقفیت بہم پہنچاتے ہیں۔ فیضؔ کے خطوط میں کثیر تعداد میں ایسے ادبی حوالے بھی ملتے ہیں جو محققین کے لئے کئی پہلوؤں سے معلومات کا وسیلہ ہیں۔ لہٰذا خطوط ہمارا وہ ادبی سرمایہ ہیں جو کسی بھی محقق و نقاد کے لئے بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر حیف کہ اُردو داں طبقہ اس سرمائے سے محروم ہوتا چلا جا رہا ہے کیونکہ خطوط نگاری کی روایت بہت حد تک دم توڑ چکی ہے۔

کرشن چندر کے افسانوں میں رومانی حقیقت نگاری

محمد شکیل
ریسرچ اسکالر شعبہ اُردو، جموں یونیورسٹی

ریوتی شرما لکھتی ہیں:

''وہ کرشن چندر) چلاتا ہے کہ زندگی تلخ ہے۔ سماج جابر ہے خدا خیال خام ہے اور حقیقت ایک اڑیل گینڈا ہے لیکن وہ یہ کہنے سے نہیں گھبراتا کہ صبح حسین ہے۔ شام سہانی ہے، رات نشہ بار ہے اور برف چاندی کی طرح چمکتی ہے اور پھول بوسوں کی طرح دمکتے ہیں۔''(۱)

اس میں شک نہیں کہ زندگی ہمیشہ ایک جیسی نہیں رہتی ہے زندگی میں شب وفراز، خوشی وغم، ترقی اور تنزلی، محبت اور عداوت اور وصال وہجر کے عنصر ہمیشہ کارفرما رہے ہیں۔ زندگی پھولوں کا سیج نہیں بلکہ کانٹوں کا تاج ہے۔ زندگی روز روشن کے مترادف نہیں بلکہ تاریک کھائی ہے۔ زندگی کیا ہے؟ کیسے ہے؟ اور کیوں ہے؟ یہ وہ نقطے ہیں جن کو سلجھانے کیلئے دانشوروں نے اپنی جوانیاں ختم کرلیں، بڑھاپا بھی اسی سوچ میں گزرا اور بالآخر ابدی نیند سو گئے لیکن زندگی سے متعلق ان پیچیدہ گتھیوں کو سلجھا نہ سکے۔ اس کے باوجود کہ زندگی سے متعلق مسئلہ حل نہ ہوسکا لیکن دانشوروں، مفکروں اور ادیبوں نے اپنی سوچ وفکر کے مطابق زندگی سے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ ریوتی سرن

شرما کے لفظوں میں کرشن چندر کے نزدیک زندگی تلخ ہے۔اس کے علاوہ زندگی جو ہے جوسو ہے!! وہ اس پر غور نہیں کرتے ہیں۔ ریوتی سرن شرما کی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ کرشن چندر کے نزدیک سماج جابر ہے اور خدا خیال خام ہے۔ یعنی سماج یقیناً سماج سے مراد یہاں ہندوستانی سماج ہے جہاں حق وانصاف اور حقیقت پر مبنی ایک آواز جو کسی عوام کے جسم غفیر سے آتی ہے وہ مذہبی انتہا پسندی کا شکار ہو جاتی ہے اور ہمیشہ کے لئے دفن ہو کر رہ جاتی ہے۔ جابر سماج سچائی سے کوسوں دور رہتا ہے، اندھی تقلید میں مست جابر لوگ نئی سوچ کے لوگوں کو راستہ نہیں دیتے۔ ان کے نزدیک انسانوں کے خدا سے متعلق تیار کردہ نظریے خام ہیں۔ اور حقیقت تک ابھی حضرت انسان کی پہنچ نہیں ہوئی یعنی حقیقت اٹل ہے۔ کرشن چندر زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ جیسے خشک موضوع منھ پھیر لیتے ہیں اور ان پر زندگی کا ایک خوبصورت پہلو عیاں ہوتا ہے اور وہ ہے رومان کا پہلو۔ ان کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ظلم وجبر کی تاریک رات میں گھبرائے نہیں ہیں بلکہ انھیں تاریک رات کے بعد حسین صبح نظر آتی ہے۔ ان کی تحریروں میں برف چاندھی کی طرح چمکتی ہے اور پانی میں کھلے پھول کسی حسین پری پیکر کے بوسوں کا لطف دیتے ہیں۔ کرشن چندر کی رومانیت میں حقیقت کا عنصر پایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں شکیب بنازی لکھتے ہیں:

> ''کرشن چندر کا خمیر بھی رومانیت کے زیر اثر تعمیر ہوا تھا مگر ان کا رومانیت کا تصور متذکرہ ادیبوں سے کہیں زیادہ فکر انگیز اور انقلاب انگیز تبدیل کا نام تھا کرشن چندر نے رومانیت کے وسیلے سے جس حقیقت کا ادراک کیا اور پھر اسے جس طرح اپنے فن میں سمویا وہ اپنے آپ میں ایک بہت بڑا کارنامہ ہے............ میں نے جا بجا ان کے افسانوں اور ناولوں

کی روشنی میں یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے اوراس نتیجے
پر پہنچا ہوں کہ کرشن چندر کی رومانیت خالی خولی ماورائیت، تجرید
اور تخیل کا آمیزہ نہ تھی بلکہ وہ زندگی آموز و زندگی آمیز عناصر سے
ترکیب عناصر سے ترکیب پائی ہے نیز جوان کے فنی ارتقا کے پہلو
بہ پہلو تبدیل ہوتی رہی......(۲)

انیسویں صدی عیسوی میں یورپ اور فرانس میں انگریزی اور فرانسیسی ادب میں رومانیت کے تصور نے ایک باقاعدہ تحریک (Moment) کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس رومانی تحریک کا اثر دُنیا کی دوسری زبانوں کے ساتھ اردو ادب بھی متاثر ہوا۔ اُردو ادب میں رومانیت ایک رجحان ہی رہی البتہ مجنوں گورکھپوری، سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری کی تحریریں اسی رجحان کی نمائندہ تھیں۔

کرشن چندر کا پہلا افسانوی مجموعہ

''ظلم خیال'' اس بات کی دلیل ہے کہ ان پر رومانیت کے رجحان کا اثر تھا لیکن وہ عورت زدہ رومانیت کے محدود دائرے میں قید نہیں رہے انہوں نے رومانیت کے تصور کو وسیع تناظر میں پیش کیا۔ کرشن چدنر کے یہاں رومانیت زندگی کا بہترین جوہر ہے۔ ان کے افسانوں میں رومانیت اور حقیقت ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

کرشن چندر کے مزاج میں محبت اور رومانیت کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ان کا بچپن پونچھ (مینڈھر) کی حسین وادی میں گزرا۔ یہ یوجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں حقیقت اور رومانیت اپنے آب وتاب کے ساتھ شامل ہے۔ ان کا افسانہ ''گرجن کی ایک شام'' حقیقت اور رومانیت کی بہترین مثال ہے۔ اس افسانے میں فطری رومان اور حقیقت کا بے مثال امتزاج ملتا ہے۔

کرشن چندر کو انسانیت سے گہری محبت اور فطرت کا گہرا احساس ہے۔ وہ بذاتِ خود مذہب کی الجھنوں سے دور کھڑا فقط ایک انسان ہے۔ وہ ہندو ہیں نہ مسلمان!! انہیں تو صرف ایک انسان ہونے پر فخر ہے۔ ان کے ہاں حسن وحقیقت کی جستجو اور بہتر دنیا کی تلاش ہے۔ ایک نئی دنیا جہاں کوئی انسان دکھی نہ ہو۔ جہاں کسی پر ظلم وستم نہ ہوتا ہو۔ جہاں عدل وانصاف کی بات ہو۔ جہاں فطرت کا قانون ہو اور جہاں سب سے بڑھ کر انسانیت ہو۔ کرشن چندر کے ہاں پائی جانے والی رومانیت میں عورت کے حسن وجمال کا حصہ بھی ہے۔ وہ عاشق مزاج ہیں اور حسن ان کی طاقت بھی ہے اور کمزوری بھی!!! کرشن چندر ایک سچے رومان پسند ہیں جن کی رومانیت میں مجہولیت اور قنوطیت شامل نہیں ہے۔ کرشن چندر کی سچی رومانیت سے متعلق محمد حسن عسکری لکھتے ہیں:

''سچی رومانیت کے معنی ہیں زندگی اور انسانیت سے گہری محبت فطری کا شدید احساس، انسان کے مستقبل کو روشن بنانے کی آرزو دنیا کے ظلموں کے خلاف بغاوت انسانوں کے روحوں کو سمجھنے کی صلاحیت ان کے مصائب پر غم کھانا، دنیا کے دکھ درد کو یکسر مٹا دینے کی خواہش ایک نئی اور بہتر دنیا کی تلاش حسن اور حقیقت کی جستجو...... اس مفہوم کو ذہن میں رکھ کر مڈلٹن میری نے کہا تھا کہ ہر بڑے مصنف اور شاعر میں رومانیت کا کچھ نہ کچھ عنصر ضرور ہوتا ہے اور یہ بھی واقعی سچ ہے کیونکہ ان باتوں کے بغیر وہ ہمارے دل پر حکمرانی کیسے کرسکتا ہے۔ ہمارے قانون ساز کیسے بن سکتا ہے اگر رومانیت سے یہ مطلب لیا جائے تو میں کہوں گا کہ کرشن چندر کی رگ رگ رومانی ہے اور وہ اس رومانیت کی اردو میں عظیم ترین مثال ہے۔''(۳)

عاشقانہ مزاج کے ادیب کرشن چندر کو آگے چل کر سماجی اقتصادی اور سیاسی حالات نے حقیقت نگار بنا دیا، یہی وجہ یہ کہ کرشن چندر کے افسانوں میں ہمیں حقیقت اور رومان کا بہترین امتزاج ملتا ہے۔ ان کا افسانوی مجموعہ ''ہم وحشی ہیں'' 1948ء میں منظر عام پر آیا۔ ان کا یہ افسانوی مجموعہ پاکستان میں ''پشاور ایکسپریس'' کے نام سے شائع ہوا جس میں وہی سات کہانیاں ہیں جو افسانوی مجموعہ ''ہم وحشی ہیں'' میں شامل تھیں۔ اس مجموعے میں شامل افسانہ ''پشاور ایکسپریس کرشن چندر کا شہکار افسانہ ہے۔ یہ افسانہ قارئین میں کافی مقبول ہوا اور اس افسانہ کی وجہ سے کرشن چندر ادبی حلقوں میں بحث کا موضوع بھی بنے رہے۔

ہندوستان انگریزوں کی دوسو سال کی غلامی کے بعد 1947ء میں آزاد ہوا لیکن انگریزوں کی سازش اور یہاں کے سیاسی رہنماؤں کی آپسی رسہ کشی کی وجہ سے یہ ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اور دُنیا کے نقشے پر پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔ ہندوستان کی آزادی اور بٹوارہ ایک تاریخی واقع ہے۔ وطن عزیز کی آزادی کی خاطر عورتیں بیوہ ہوئیں۔ بچے یتیم ہوئے، عزتیں تا تار ہوئیں اور خون کے دریا بہائے گئے۔ اس پرُفتن دور کے ساتھ ہی ملک کی تقسیم کا المیہ پیش آیا۔ ہم وطنوں نے ایک دوسرے کو مذہب کے نام پر قتل کیا۔ ایک فرقے نے دوسرے فرقے کے لوگوں کے گھروں کو ویران کیا۔ زمین کی چھاتی پر خونی لکیر کھینچ دی گئی۔ ہندوستان سے پاکستان مسلم آبادی اور پاکستان سے ہندوستان ہندو آبادی کو منتقل کیا جانے لگا۔ سرحد کے اس طرف دس لاشیں گریں تو دس لاشیں اس طرف بھی گرا دی گئیں۔ افسانہ ''پشاور ایکسپریس'' ایک ریل (Train) کی کہانی ہے۔ یہ ریل پاکستان کے ریلوے اسٹیشن پشاور سے چلتی ہے اس ریل کے ڈبوں میں زیادہ تر ہندو لوگ بیٹھے ہوتے تھے جو اپنے آپ کو پاکستان میں محفوظ نہ پا کر ہندوستان کی طرف چل نکلے تھے، ان لوگوں نے مغربی پنجاب پہنچ

کرسکوں کا سانس لیا۔ یہاں سے تھوڑی آگے گاڑی نکلی تو سنسان جگہ پر زنجیر کھینچ کر ریل کو روک دی گئی۔ اس سے آگے کا نقشہ کرشن چند افسانہ ''پشاور ایکسپریس میں''یوں کھینچتے ہیں۔

''بلوچی سپاہیوں نے ہر ڈبے سے کچھ آدمی نکال کر مجمع کے حوالے کئے پورے دوسو آدمی نکالے گئے ایک کم نہ ایک زیادہ۔ لائن لگاؤ کافرو اسرغنے نے کہا۔ سرغنہ اپنے علاقہ کا سب سے بڑا جاگیردار تھا اور اپنے لہو کی روانی میں مقدس جہاد کی گونج سن رہا تھا کافر پتھر کے بت بنے کھڑے تھے، مجمع کے لوگوں نے انہیں اٹھا اٹھا کر لائن میں کھڑا کیا۔ دوسو آدمی، دوسو زندہ لاشیں............''(۴)

اس سنسان جگہ پشاور ایکسپریس انسانی خون سے لت پت ہوکر آگے بڑھی تو کہیں مقامات پر روک کر انسانیت کو شرمسار کیا گیا۔ یوں پشاور ایکسپریس لالہ موسیٰ سے گزرتے ہوئے وزیرآباد پہنچتی وزیرآیا کے ریلوے اسٹیشن کے پلٹ فارم نمبرا پر پشاور ایکسپریس کو روکا گیا۔ یہاں پر ایک بار پھر''لے کی ہوا نے انسانیت کو لہولہان کردیا۔افسانہ''پشاور ایکسپریس سے اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

''مجھے نمبرا ایک پلیٹ فارم پر کھڑا کیا گیا............ابھی ابھی نمبر۲ پلیٹ فارم پر جو مسلم مہاجرین کی گاڑی آگے رُکی تھی اس میں چارسو مسلمان مسافر کم تھے اور پچاس مسلم خواتین اغوا کرلی گئی تھیں۔اس لئے یہاں پر عورتیں چن چن کر نکالی گئیں اور چار سو ہندو مسافروں کو تہ تیغ کیا گیا تاکہ ہندوستان اور پاکستان میں آبادی کا توازن برقرار ہے............''(۵)

افسانے کا قصہ کتنا ہی بیباک ،خوفناک اور ڈراونہ کیوں نہ ہو۔ اس میں کرشن چندر رومانی ماحول پیدا کر لیتے ہیں۔ یہی ان کی سب بڑی خوبی ہے۔اس سلسلے میں ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''جالندھر سے ادھر میٹھا خون کا ایک گاؤں تھا ....
جہاں گیہوں کے کھلیان لگائے جاتے تھےاور سرسوں کے پھول مسکراتے تھےاور عفت ماب بیباں اپنے خاوندوں کی نگاہ شوق کی تاب نہ لاکر کمزور شاخوں کی طرح جھکی جھکی جاتی تھیں۔اسی وسیع میدان میں جہاں پنجاب کے دل نے ہیر رانجھےاور سوہنی مہیوال کی لافانی الفت کے ترانے گائے تھے............ پنجاب میں کبھی طغیانی نہ آئے گی ،مشاہدات کوئی وارث شاہ کی ہیر نہ گائے گا............''(٦)

پشاور ایکسپریس میں ہندو عورتوں کی عزتیں پاکستان میں اور ہندوستان پہنچنے پر مسلم خواتین انتہا پسند ہندوؤں کے عتاب کا نشانہ بنیں۔سرحد کے اس پار ہندوؤں کو تہہ تیغ کیا گیا تو سرحد کی اس طرف بے گناہ مسلمانوں کا سر قلم ہوا۔کرشن چندر مسلمان خواتین ساتھ ہوئےظلم و جبر کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں۔

''مسلمان ڈپٹی کمشنر کو گاڑی میں سوار کر دیا گیا............
ڈپٹی کمشنر کی ایک نوجوان لڑکی تھی ، اور بڑی خوبصورت وہ کسی کالج میں پڑھتی تھی۔ دو ایک نوجوانوں نے سوچا اسے بچالیا جائے ۔ یہ حسن یہ رعنائی ، یہ تازگی یہ جوانی کسی کے کام آسکتی ہے............لڑکی جنگل میں گھاس کے فرش پر تڑپ تڑپ کر مرگئی............ اس کے روح میں کسی سے محبت کرنے کسی کو

چاہنے، کسی کے گلے لگ جانے، کسی بچے کو دودھ پلانے کا جذبہ
ہوگا۔ وہ لڑکی تھی، وہ ماں تھی، وہ بیوی تھی، وہ محبوبہ تھی، وہ کائنات
کی تخلیق کا مقدس راز تھی اور اب اس کی لاش جنگل میں پڑی تھی
اور گیڈر اور گدھ اور کوے اس کی لاش کو نوچ کر کھائیں
گے......"(۷)

کرشن چندر کے افسانہ "پشاور ایکسپریس" کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ جب متحدہ ہندوستان کے دو ٹکڑے ہوئے تو سرحد کی دونوں جانب انسانیت شرمندہ ہوئی۔ مذہبی جنون والوں نے نعرۂ تکبیر مست سری اکال اور ہر ہر مہادیو کہہ کر بے گناہ انسانوں کی زندگیاں لیں جنہیں نہ ہندوستان کا علم تھا اور نہ پاکستان کا پتہ!

فساد کے دوران مرنے والے کو یہ معلوم نہ تھا کہ اُسے کس گناہ کی سزا دی جا رہی ہے۔ مذہبی انتہا پسندی نے انسانیت کی سفید چادر کو لہولہان کیا۔ کرشن چندر نے رومان کا سہارا لے کر تقسیم ملک سے پیدا ہونے والے فسادات کی حقیقت کو پیش کیا ہے۔ ان کی رومانی حقیقت نگاری کا اردو ادب میں کوئی دوسرا افسانہ نگار مقابلہ نہیں کر سکتا ہے۔ کرشن چندر کے رومانی طرز ادا پر مبنی ایک اقتباس افسانہ "پشاور ایکسپریس" سے ملاحظہ فرمائیں:

"میں لکڑی کی ایک بے جان گاڑی ہوں لیکن پھر بھی میں
چاہتی ہوں کہ خون اور گوشت اور نفرت سے مجھے نہ لادا جائے
...... میں اپنے ڈبوں میں کسانوں اور مزدوروں کی خوش حال
ٹولیاں لے کر جاؤں گی اور باعصمت عورتوں کی میٹھی نگاہیں
اپنے مردوں کا دل ٹٹول رہی ہوں گی ...... جب کوئی ہندو ہوگا نہ

مسلمان سب مزدور ہوں گے اور انسان ہوں گے۔'' (۸)

الغرض کرشن چندر کے افسانہ ''پشاور ایکسپریس'' کے بغور مطالعہ سے یہ نقطہ سامنے آتا ہے کہ وہ دوسرے رومان پسند افسانہ نگاروں کی طرح زندگی سے فرار حاصل کرنا نہیں چاہتے بلکہ وہ زندی کے تلخ حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں۔ کرشن چندر کے یہاں رومانیت کا ایک خوبصورت، صحت منداور توازن نظریہ ملتا ہے۔ جس کی بنیاد پرانہیں رومانی حقیقت نگار کہا جاسکتا ہے۔

حواشی

۱۔ فلیپ۔ ''ہم وحشی ہیں'' کرشن چندر، ناشر ایشیاء پبلشرز، اے 36 پلاٹ نمبر ۲/۲۷، سیکٹر 9 چیتک اپارٹمنٹس، موہنی نئی دہلی ۸۵۔ سال اشاعت ۲۰۰۲ء

۲۔ کرشن چندر کے افسانوی ادب میں حقیقت نگاری۔ شکیب نیازی، ناشر موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، سال اشاعت ۱۹۹۵ء۔ ص ۱۳

۳۔ اردو ادب میں ایک نئی آواز ماخوذ کرشن چندر نمبر، بمبئی 1967ء، ص 407)

۴۔ افسانہ ''پشاور ایکسپریس مشمولہ افسانوی مجموعہ ''ہم وحشی ہیں'' ایشیا پبلشرز، سال اشاعت 2002ء، ص نمبر 67

۵۔ ایضاً۔ ص نمبر 71

۶۔ ایضاً۔ ص نمبر 73

۷۔ ایضاً۔ ص نمبر 75

۸۔ ایضاً۔ ص نمبر 76

اردو میں منظوم مکتوب نگاری

مہناز کوثر
ریسرچ اسکالر پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ

اگر چہ اُردو مکتوب نگاری کا با قاعدہ آغاز مرزا غالبؔ سے ہوتا ہے لیکن اُردو مکتوب نگاری کے ابتدائی نقوش منظوم مکتوب سے ہی ملتے ہیں۔ بعض محققین کے مطابق اُردو کا پہلا دستیاب شدہ خط ۶ دسمبر ۱۸۲۲ء میں لکھا گیا لیکن نئی تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ اس سے بہت پہلے اُردو مکتوب نگاری کا رجحان عام ہو چکا تھا۔ اور وہ جو رجحان عام ہوا تھا وہ منظوم مکتوب نگاری کا تھا۔ اُردو کے قدیم ترین خطوط نظم کی ہئیت میں ملتے ہیں۔ شیر محمد خاں ایمانؔ نے اُردو کا پہلا منظوم خط ۱۸۰۶ء میں ''نامۂ منظوم'' کے عنوان سے تحریر کیا۔ لیکن اُردو مکتوب نگاری کی روایت سے واضح ہوا کہ ۱۸۰۶ء سے قبل اُردو خط نظم کی ہئیت میں موجود تھے۔ ایمانؔ کے منظوم مکتوب میں سے ایک خط نمونے کے طور پر یہاں پیش کرتی ہوں جس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ منظوم خط مثنوی کی ہیت چن میں رقم ہوا ہے جس میں بیانیہ تکنیک برتی گئی ہے۔ ایمان کے علاوہ بھی جن منظوم مکتوب کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے قریب قریب وہ سارے خطوط بھی مثنوی کی ہیت میں ہیں ۔ ایمان کا منظوم خط ملاحظ ہو:۔

موزوں تمہارا پہنچا ہے نامہ

مژ گان ِ آہو جس کا تھا خامہ
مضمون تازہ اس میں تھے مرقوم
وقت سے معنی ہوتے تھے معلوم
تحسیں تو سو بار نکلے زباں سے
خوش رکھے اللہ امن و اماں سے
تھی نثر میں یہ تر قیم نادر
ٹک ایک شکوہ ہو تا تھا سادر
یعنی کہ اپنی خط و کتابت
خاطر پہ لائے سایۂ کدورت

مذکورہ بالا اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ ایماؔن نے اپنا منظوم خط کسی نثری خط کے جواب میں اپنی وفات سے پہلے تحریر کیا تھا۔اُن کی وفات ۱۸۰۶ءمیں ہوئی تھی ۔ جہاں تک منظوم اردو خطوط کا تعلق ہے تو سب سے قدیم خطوط ۱۷۶۱ء سے قبل دورِ آصف جاہی منصب داروں مرزا یار علی بیگ اور میر ابراہیم جیو کے دریافت ہوئے ہیں۔ یہ خطوط ادارۂ ادبیات اور حیدر آباد کی ایک قلمی بیاض میں محفوظ ہیں مرزا یار علی بیگ کا منظوم خط مولانا ابراہیم جیو کے نام ملاحظہ ہو:

جا صبا کر بندگی ہراک عنوان سے
صاحب مشفق مہرباں خان والا شان سے
ہے تمہارے مخلصوں میں کمتریں یا علی
یاد سامی ہے سدا جس کوں تمہاری از دلی
دم بدم ہر لحظ و لمحہ تمہاری یاد ہے
یہ دل محزوں تمہاری یاد میں نت شاد ہے

مرزا یار علی بیگ کے منظوم خط کا جواب مرزا ابراہیم جیو منظوم خط کی ہی صورت میں یوں دیتے ہیں:

رکھو ایزد تمہیں امن واماں میں
کرم اپنے سیتی دونوں جہاں میں
جو مرزا یار علی تم کا اسم ہے
یقیں ہے تم پہ سرداری ختم ہے
کہوں کیا وصف میں تمنا کے اشعار
کیا حق نے ازل سے تم کوں سردار

واجد علی شاہ کے خطوط کا آخری مجموعہ جس کے مرتب خواجہ محمد رؤف عشرت ہیں۔ یہ خطوط تقریباً منظوم ہیں، جن میں مخصوص بیگمات کے نام درج ہیں۔ ملکۂ سمتین کے نام جو خط لکھا گیا ہے، اس میں انہوں نے اپنے عشق و عاشقی کی داستان، ہجر و وصال کا تذکرہ بیان کیا ہے۔ یہ طویل خط ہے جس میں کل ۱۹۲ اشعار ہیں۔ اس کا تیسرا خط بھی ملکۂ سمتین کے نام ہی ہے، جس میں ہجر و فراق کی باتیں درج ہیں۔ منظوم خط ملاحظہ کیجئے:

سر بزانو ہو درد دے اے جاں
شب سے رہتا ہوتا سحر گریاں
نہ ملاقات بھاتی ہے مجھ کو
نہ کوئی بات بھاتی ہے مجھ کو
ایسے عالم میں کیا بلاؤں گا
میں ہی انشا اللہ آؤں گا
پھول کی طرح سے رہے دل شاد

وصل اختر مبارک باد

واجد علی شاہ کے یہ خطوط قید و بند کے دوران لکھے گئے۔ اس لئے اس میں ہمیں قید کی داستان بھی ملتی ہے۔ دسویں اور گیارہویں خط میں جو اکلیل محل کے نام ہیں۔ لکھتے ہیں:

اے آہ فلک کو چاک کر دے
دامان محیط چاک کر دے
اے گنبد نیلگوں الٹ جا
اے سینۂ ارض جلد پھٹ جا
اے بحر الم اہل جہاں میں
اندھیر ہے صحر گلستاں میں
اے آہ غریب چل ہوا ہو
اے ناوک داد باد پا ہو
اے اخؔتر راز ہو نہ بے ہوش
دیکھا ہے بصیر نے بھی خاموش

ایک اور خط جو جہانگیر بیگم کے نام ہے، جس میں واجد علی شاہ نے اپنی بیماری کی شدت کا ذکر کیا ہے:

جلاتا ہے شعلہ بواسیر کا
لپک کام کرتی ہے شمشیر کا
رخ حسن یا رب ترو تازہ باد
جمالت بروئے چمن غاز ہ باد

یہ منظوم خطوط مثنوی کے انداز میں لکھے گئے ہیں۔ اس میں درد والم اور ہجرت کی

تکالیف وغیرہ کا تفصیلاً ذکر ملتا ہے۔اس کرب کی شدت کے باوجود جو زبان میں سادگی وشگفتگی ملتی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے ۔واجد علی شاہ کے منظوم مکتوب میں ایک بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ وہ قید و بند کے زمانے میں اپنی مصیبتوں کا اظہار کرتے ہوئے نظر نہیں آتے ۔اس بات کی تصدیق ہمیں ان خطوط سے ہوتی ہے جو انہوں نے نورزماں بیگم کے نام لکھے ہیں۔

اس زمانے میں نظم میں خط لکھنا قابلیت اور علمیت کی دلیل سمجھا جاتا تھا اور ایک پڑھے لکھے آدمی کا یہی طرۂ امتیاز بن چکا تھا۔ چنانچہ واجد علی شاہ کی بیگمات نے بھی اکثر منظوم اشتیاق نامے لکھے، جو ادب میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ذیل میں نواب شیدا بیگم کے ایک منظوم خط کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں:

بہار آئی کہاں تو ساقیا ہے
تصور ہر گھڑی مجھ کو ترا ہے
زمرد ہو گئی ساری زمیں ہے
ہر ایک سو باغ میں سبزہ کھلا ہے
وہ پانی نہر میں صاف جاری
کہ جس پر دل مرا لہرا رہا ہے
ملاروں کی کہیں آتی ہے آواز
کسی جا شاخ میں جھولا پڑا ہے
وہ جو بن اب ہمارا ہے کہ ہر دم
پری بھی حور بھی ہوتی فدا ہے
مسی ہونٹو ں پر اور آنکھوں میں سرمہ
رچی ہاتھوں میں پاؤں میں حنا ہے

شیدا بیگم نے یہ خط نواب کے نام منظوم کیا ہے لیکن مذکورہ بالا خطوط سے یہ خط مختلف ہے، باقی جن خطوط کا ہم مطالعہ کرائے ہیں ان سارے خطوط کی ہئیت مثنوی کی ہے، لیکن شیدا بیگم کی شدت طرازی کی یہ دلیل ہے کہ اس زمانے میں جب کہ واجد علی شاہ مثنوی کی ہئیت میں خط منظوم کر رہے ہیں ،اس دور میں کیا بلکہ نواب کو جو خط شیدا بیگم نے لکھا ہے وہ مثنوی کی ہئیت میں نہیں بلکہ غزل کی ہئیت میں منظوم کیا ہے۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ جس زمانے میں یہ خطوط لکھے گئے اُس زمانے میں جو نثر تھی وہ نظم کی گرفت سے آزاد نہ ہو سکی۔ اور اس کا ایک علیحدہ اسلوب قائم نہیں ہوا۔ اسی لیے سوداؔ، مرزا جان تپشؔ ، اور انشا نے منظوم خطوط لکھے ہیں جن کا سلسلہ تسنیمؔ لکھنوی ، مضطر خیر آبادی اور ڈاکٹر اقبال تک جاری رہتا ہے لیکن سرور ، بے خبرؔ اور غالبؔ سے پہلے اُردو مکتوبات کے جو منظوم نمونے ملتے ہیں وہ تاریخ کی اہم کڑیاں ہیں اور اُردو خطوط نگاری کی تاریخ میں انہیں کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اُن کے ذکر کے بغیر اُردو خطوط نگاری کی تاریخ ادھوری ہے۔

حالؔی خطوط کے آئینے میں

ڈاکٹر رضا محمود
لکچر رشعبۂ اردو جموں یونیورسٹی

سرسید کے ہمعصروں میں مولانا حالؔی کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔انہوں نے نہ صرف اردو شاعری میں اپنی گراں قدر خدمات انجام دیں بلکہ وہ بیک وقت ایک شاعر، ادیب، نقاد اور سوانح نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔علاوہ ازیں اردو خطوط نگاری میں بھی انہوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے۔اردو خطوط نگاری کے حوالے سے اگر چہ انھیں بہت کم لوگ جانتے ہیں لیکن مولانا حالؔی کے مکتوبات اردو ادب میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ان کے تمام خطوط کو آپ کے فرزند خواجہ سجاد حسین نے دو جلدوں میں ''مکتوباتِ حالی'' کے عنوان سے شائع کروایا۔ان خطوط کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ یہ خطوط اُن کی شخصیت، کردار اور ادبی کارناموں کو بروئے کار لانے میں معاون ثابت ہوئے ہیں۔

سرسید کے رفقاء میں خواجہ الطاف حسین حالؔی کی شخصیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔سرسید کے خیالات کا عکس اُن کی زندگی میں نمایاں نظر آتا ہے۔انھوں نے اکثر خطوط اپنے ہمعصروں کو لکھے جن میں سے متعدد اُس دور کے ہیں جب مولانا حالؔی سرسیّد کی سوانح عمری ''حیات جاوید'' لکھ رہے تھے۔مولانا حالؔی کو اس کتاب کے لکھنے میں جن مشکلات اور محنت و مشقت کا سامنا کرنا پڑا اس کا ذکر ۱۰/ مارچ ۱۸۹۹ء میں نواب سید

؎ علی حسن صاحب کوایک خط اس طرح کرتے ہیں:

''میں تعمیلِ حکم کے لئے بسروچشم حاضر ہوں مگر آج کل سرسید مرحوم کی لائف لکھنے اور اس کے چھپوانے میں مصروف ہوں اسلئے جب تک کہ اس ضروری کام سے فارغ نہ ہو جاؤں کہیں نقل وحرکت کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ سرسید کی لائف اب تک کب کی ختم ہو جاتی مگر اول تو میں دو تین مہینہ بیمار رہا۔ پھر صاحب مطبع کی بیوی کا انتقال ہو گیا اس کے بعد وہ خود شدید بیمار ہو گئے اور کئی مہینے تک مطبع کا کاروبار بند رہا اس سبب سے حرجِ عظیم واقع ہو گیا اب چند روز سے پھر سے کام شروع ہوا ہے اور خدا کو منظور ہوا تو تین چار مہینہ میں کتاب ختم ہو جائے گی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔لائف میں سب سے زیادہ دشوار گذار مرحلہ ہے وہ تفسیر قرآن کا ریویو ہے اور آج کل یہی مقام زیرِ تحریر ہے۔۔۔۔۔۔۔'' [1]

کئی عرصہ کی محنت ومشقت کے بعد حالؔی کی اس کتاب کی طباعت ہوئی تو اکثر صاحبِ ذوق حضرات نے ان کی اس کتاب کی قدر نہ کی اور مولانا حالؔی کو بہت دُکھ ہوا جس کا ذکر ۱۷رجون **۱۹۰۱ء** کو مولوی حبیب الرحمٰن صاحب رئیس بھیکم پوری کو ایک خط میں یوں کیا ہے:

''لوگوں کو ضرور مشتاق ہونا چاہئے تھا مگر جہاں تک خیال کیا جاتا ہے مصنف کی بے وقتی نے ہیرو کی بھی قدر گھٹا دی ہے جن لوگوں سے اُمید تھی کہ اس کتاب کے منگوانے میں ایک دوسرے پر سبقت کریں گے۔ ان کی طرف سے سرد مہری کے سوا میں نے

کچھ نہیں دیکھا۔ اگر اس قلیل عرصے میں کتابیں توقع سے زیادہ
فروخت ہوگئیں ہیں مگر ایسی قدردانی سے وہی شخص خوش ہوسکتا
ہے جو تجارت کے سوا تصنیف و تالیف کا کوئی اور مقصد
خیال نہیں کرتا۔۔۔۔۔۔'' ۲؎

سرسید کی زندگی سے متعلق ''حیاتِ جاوید'' کو مرتب کرنے میں حالؔی کو کئی ناساز گار حالات سے دوچار ہونا پڑا اور جب یہ پایہ تکمیل کو پہنچی تو اس کا ذکر مولوی حبیب الرحمٰن صاحب بھیکم پوری کو مورخہ ۱۱/اکتوبر ۱۹۰۰ء میں لکھے ایک خط میں اس طرح کیا:

''میں نہایت ادب سے معافی چاہتا ہوں سرسید کی لائف
قریب اختتام ہے مجھے جلدی ہے کہ دسمبر تک شائع ہو جائے اور
کام بہت باقی ہے اسلئے سر کھجانے کی فرصت نہیں۔ پچھلے دو مہینے
نہایت پریشانی میں گزرے۔ میری اہلِ خانہ کا ہیضے میں انتقال
ہوگیا اور وبا نے نہایت پریشان رکھا۔ اب بخار پھیلا ہوا ہے۔
بارش کی طغیانی جیسی تمام ملک میں ہوئی ہے آپ کو معلوم ہوگا
ان وجوہ سے آپ کے حکم کی تعمیل نہیں ہوسکی۔'' ۳؎

حالؔی نے جن لوگوں کے نام خطوط لکھے اُن سے واضح ہوتا ہے کہ اُن کے گھریلو حالات نہایت پریشان کن تھے اس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ حالؔی کی بیوی کا مزاج بہت تیز تھا ممکن ہے اس وجہ سے گھر کا ماحول ایسا ہوا ہو۔ لیکن صالحہ عابد حسین صاحبہ نے ''یادگارِ حالی'' میں لکھا ہے کہ حالؔی اپنی بیوی کی گرم مزاجی کو بڑی نرمی اور محبت سے برداشت کرتے تھے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جائیداد کا کوئی خاندانی جھگڑا ہو مگر اس سلسلے میں کوئی شہادت نہیں ملتی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ حالؔی کی بیٹی عنایت فاطمہ کی شادی خواجہ عبدالعلی سے ہوئی تھی۔ خواجہ عبدالعلی کا برتاؤ کچھ اچھا نہ تھا جس کی وجہ سے اُ

نہوں نے اپنی بیوی اور حاؔلی کو ہمیشہ پریشان رکھا۔ ایسے کئی خطوط ہیں جن میں حاؔلی نے اپنے گھریلو حالات کی خرابی کا ذکر کیا ہے۔ مولوی محمد احسان اللہ خاں صاحب کے نام ۱۰؍ فروری ۱۹۰۵ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''دو تین مہینے سے خود عوارض نزلہ میں اُلجھا ہوا ہوں۔ ادھر میرا ایک نواسا مرضِ صرح میں مبتلا ہے جس کے علاج کے لئے سوا مہینے دہلی میں ٹھہر کر ابھی آیا ہوں پھر اس کا باپ (عبد العلی) سخت بیمار ہو کر رام پور سے آیا ہے۔ ان مکروہات میں اتنی مہلت نہیں ملتی کہ اپنی تحریرات نظم یا نثر نقل کر کے خدمت شریف میں بھیج سکوں۔'' ۴

مولانا حاؔلی نے اپنے نواسے عبد الولی جو صرح کے علاج مرض میں مبتلا تھا کی تیما داری میں آپ نے کوئی کسر باقی نہ رکھی اس نواسے کی بیماری کا ذکر نواب وقار الملک انتظار جنگ کو ۱۳؍ فروری ۱۹۰۴ء کو ایک خط میں یوں کرتے ہیں:

''میرے نواسے کو جس کی عمر ۹ سال ہے چار برس صرع کا مرض عارض ہے علاقہ تحصیل کرنال میں ایک زمیندار صرع کا علاج کرتا ہے وہاں اس لڑکے کو لے جاتا ہوں جلدی کا سبب یہ ہے کہ وہ ساون کہ مہینے میں علاج کرتا ہے جس کے کل چار پانچ دن رہ گئے ہیں۔'' ۵

اسکے علاوہ ۲؍ اپریل ۱۹۰۰ء کو احسان اللہ خاں صاحب کو جو خط لکھا اُس میں بھی اپنے نواسے کی بیماری سے متعلق لکھا ہے:

''مجھے اپنے ایک نوجوان نواسے کی بیماری نے جو صرع اور کسی قدر جنوں میں مبتلا ہے بالکل پاگل بنا دیا ہے اس کا باپ مر

گیا ہے اور بھائی پردیس میں ملازم ہے میں اور اس کی ماں ہر
وقت اس کی فکر میں غلطاں بیچاں رہتے ہیں''۔ ۶

حالؔی کے خطوط کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی شریکِ حیات سے حد درجہ محبت کرتے تھے اور جن خطوط میں اس کا ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی اہلیہ سے ادب واحترام سے پیش آتے تھے۔ ۲۲/اگست ۱۹۰۰ء کو ہیضے کی بیماری میں مبتلا ہو کر جب ان کی بیوی کی وفات ہو جاتی ہے جس کی اطلاع مولانا حالؔی اپنے بیٹے خواجہ سجاد حسین کو ایک خط میں یوں دیتے ہیں:

''پرسوں تمہاری والدہ کو دس بجے رات کے ہیضے کا اثر ہوا اور کل نو بجے رات انتقال ہو گیا۔۔۔۔۔۔ اگر چہ اس حادثہ ناگہانی سے جو صدمہ سب عزیزوں اور متعلقوں اور ہمسایوں اور راہ چلتوں کو ہوا ہے اس کا بیان کرنا مشکل ہے اور سمجھتا ہوں کہ اُن کی اولاد کو سب سے زیادہ صدمہ ہوا ہے اور ہوگا۔ مگر میری جان! والدین کا اولاد کے سامنے گذر جانا والدین کی خوش نصیبی اور اولاد کا قدیم ورثہ ہے۔ تمہاری والدہ کی جیسی عمدہ زندگی اور عمدہ موت ہوئی ہے اس کی ہر شخص کو تمنا ہونی چاہیے۔ خدا کا شکر ہے کہ انہوں نے سعادت منداولاد چھوڑی ہے۔۔۔'' ۷

مولانا حالؔی کو گھریلو حالات نے اس قدر پریشان کر دیا تھا کہ وہ کسی بھی جگہ سکون حاصل کرنا اپنے لئے ناممکن سمجھتے تھے۔ چنانچہ ۶ جون ۱۹۰۵ء کے ایک خط میں خواجہ لطیف احمد کو اپنی ذہنی تکلیف سے ان الفاظ میں مطلع کرتے ہیں:

''میری حالت اب ایسی ہے کہ گھر کے سوا جہاں جا کر رہوں گا۔ وہاں میرا ہونا سب برباد ہو جائے گا۔ مگر مشکل یہ ہے

کہ وہاں بھی چین کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ میرے حسبِ حال ذوقؔ کا یہ شعر ہے:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے۸؎

مولانا حالؔی کو شمس العلما کا خطاب ملنے پر اُن کے مداحوں اور عزیزوں نے کئی خط لکھے کیونکہ یہ ایک ایسا اعزاز تھا جو حالؔی کے زمانے میں کسی بھی عالم یا ادیب کے لئے فخر کی بات سمجھی جاتی تھی۔ کرنل ہالرائیڈ کی سفارش پر حکومت نے اُن کو شمس العلماء کے خطاب سے نوازا اور چار سو نقد انعام بھی دیا۔ یہ انعام حالؔی کو ناول ''مجالس النسا'' پر دیا گیا۔ اس اعزاز کی مبارک بادی کے لئے حالؔی کے نام کئی خطوط آئے جن میں اکثر کا جواب بھی دیا۔ پھر یہ بھی سوچنے لگے کہ کیوں نہ اخبار کے ذریعے خطوط اور تار بھیجنے والوں کا شکریہ ادا کر دیں چنانچہ ۲ جولائی ۱۹۰۴ء کے ایک خط میں تصدق حسین کو یوں لکھتے ہیں:

> ''اس خط کے اب ملنے پر جو خوشی اور دلچسپی پبلک کی طرف سے ظاہر ہوئی ہے۔ وہ بالکل توقع اور اُمید سے بالاتر ہے۔ مبارک باد کے تاروں اور خطوں کا اس قدر ہجوم رہتا ہے کہ اول اول دس بیس کا جواب دینے کے بعد اب اس کے سوا کوئی اور چارہ معلوم نہیں ہوتا بذریعہ اخبارات کے عام طور پر سب کا شکریہ ادا کر دیا جائے۔'' ۹؎

حالؔی بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت کرتے تھے۔ چھوٹوں کے ساتھ بھی نہایت ادب و احترام کے ساتھ پیش آتے تھے۔ مولوی عبدالحق اور حمید الدین جو مسلم یونیورسٹی میں طالب علم تھے اس دوران حالؔی علی گڑھ میں تھے۔ یہ دونوں ملاقات کے

لئے حالی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔حالی اُن دونوں کے استقبال کے لئے کھڑے ہو گئے حمید الدین نے مودبانہ عرض کیا کہ ہمارے استقبال کے لئے کھڑے ہو کر شر مندہ کرتے ہیں۔حالی نے جواب دیا:

''آپ لوگوں کی تعظیم نہ کروں تو کس کی کروں آئندہ آپ
ہی تو قوم کے ناخدا ہونے والے ہیں۔'' ۱۰

مولوی عبدالحق اگر چہ عمر کے لحاظ سے حالی سے کم سن تھے لیکن پھر بھی حالی کا اندازِ بیاں ملاحظہ فرمائیں کہ وہ کس قدر ایک ادب شناس شخصیت سے مخاطب ہیں اور اُن کا اعترف اس قدر کر رہے ہیں کہ اُن کی برتری اور بزرگی بالکل ظاہر ہو رہی ہے۔حالی کی اس قدر دانی سے متعلق مولوی عبدالحق اپنی رائے یوں دیتے ہیں۔

''اگر وہ دل ایسا ہو جو سراسر درد سے لبریز ہو۔۔۔۔۔۔۔
جو پریم کے رس سے نچے گیا ہو تو بتاؤ۔اس کے دل کی تراش کیسی
ہوئی؟اگر تم اس دل کی زیارت کرنا چاہتے ہو تو آؤ دیکھو وہ پاک
دل ان خطوط میں لپٹا ہوا ہے۔۔۔۔۔'' ۱۱

حالی کو زبان اور لغت کے مسائل سے گہری دلچسپی تھی۔اُن کے زمانے تک جن مو ضوعات پر جتنا کچھ لکھا گیا تھا وہ اُن کے نزدیک ناکافی اور غیر اطمینان بخش تھا۔ چنانچہ اُنہوں نے مولوی عبدالحق کو انجمن ترقی اُردو کے سکریٹری کا عہدہ سنبھالنے پر ۶ مارچ ۱۹۱۳ء کو مبارک باد دینے کے ساتھ ساتھ یہ مشورہ بھی دیتے ہیں:

''اصلاحاتِ علمیہ کی ڈکشنری مرتب کیجیے اور اسکے بعد اُردو
زبان کی ڈکشنری کی طرف متوجہ ہونا چاہیے اگر آپ کی کوشش
سے یہ دونوں لغات تیار ہو جائیں تو آپ قوم کی ایسی خدمت
سے عہدہ برآہ ہوں گئے جو قومی ترقی کی جڑ ہے۔'' ۱۲

حالؔی کو اردو ادب اور بلخصوص ادبی مشغلوں سے بھی گہرا شغف تھا۔ اپنی جسمانی پریشانیوں کے باوجود ادبی مشغلوں میں شرکت کرتے تھے۔ خصوصاً اپنے احباب و اکابر کی تصانیف پڑھنا اُن کی اصلاح کے لئے ہمیشہ کوشش کرتے لیکن جب آپ کی علالت حد سے زیادہ بڑھ گئی تو اس وقت آپ کو یہ مشاغل اور لکھنا پڑھنا ترک کرنا پڑا جس کا ذکر آپ نے کئی خطوط میں کیا ہے۔ چنانچہ ۱۸؍ اکتوبر ۱۹۱۰ء میں نواب سید علی حسین کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''آپ کی تصنیف ''فطرتِ اسلام'' کا ایک نسخہ عطیہ خاکسار کے پاس پہنچا۔۔۔۔۔۔۔رسید اور شکریہ بھیجنے میں اس وجہ سے تاخیر ہوئی کہ میں ایک عرصہ علیل چلا آ رہا ہوں۔ اگرچہ اب تک کوئی عرضِ مہلک عارض نہیں ہوا مگر لکھنا پڑھنا بالکل چھوٹ گیا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ ''فطرتِ اسلام'' کے مطالعہ سے مستفیض ہونے کے بعد جواب عرض کروں لیکن ضعفِ بصارت اور ضعفِ دماغ نے مجبور کر دیا ہے۔ اکثر احباب و اکابر اپنی تصنیفات بھیج کر ممنون فرماتے ہیں مگر میں اُن سے بہت کم ہی مستفیض ہوتا ہوں۔۔۔۔''[۱۳]

حالؔی کو پان تمباکو اور حقے کی بے حد عادت تھی۔ حالؔی نے ۲؍ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو اپنے نواسے عبدالولی کے نام جو خط لکھا اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُنہیں افیون کھانے سے بے حد دلچسپی رہی ہے اور وہ اس خط میں عبدالولی کو یہ ہدایت دی ہے کہ وہ اپنی والدہ یعنی حالؔی کی صاحب زادی عنایت فاطمہ سے کہہ دیں:

''میرے واسطے افیون کی گولیاں بہت سی، جیسی کہ تم میرے واسطے بنایا کرتی ہو، بنا کر رکھ لو۔ جب بھائی یہاں آنے

لگیں تو اُن کے ہاتھ بھیج دینا۔۔۔۔۔۔میں نے دانتوں کے سبب پان کھانا بہت کم کر دیا ہے۔تھوڑا سا بُنا ہوا پان تمبا کو کو مع چھپالیا کے تیار کر کے وہ بھی بھیج دینا۔'' ۱۴

حالؔی نے بعض خطوط میں اپنی بیماری کے ذکر کے ساتھ ساتھ اور وقت پر علاج نہ کرانے کا جواز دیتے ہوئے دوسروں کو نصیحت بھی کی ہے۔ چنانچہ خواجہ سجاد حسین نے حالؔی کو اپنی بیماری کا جب حال لکھا تو اس کے جواب میں ایک خط ۷ جنوری ۱۸۹۴ء میں لکھتے ہیں۔

''تمہارا کارڈ جو اس وقت پہنچا ہے، اس کو پڑھ کر نہایت تردد ہوا مجھے اس قسم کی شکایتیں چالیس برس کی عمر میں ہوئی تھیں ۔تم کو دردِ از حال ابھی سے زکام، کھانسی اور خدانخواستہ دردِ سینہ کی شکایت ہونے لگی۔ میں نے اپنی غفلت اور بے پروائی سے ان امراض کو بڑھا لیا کبھی باقاعدہ علاج نہ کیا۔ فصدیں متواتر کھلوا کر خون کی مقدار بہت کم کر لی غذا وغیرہ کا کبھی اہتمام نہیں کیا مگر تم کو مجھ سے عبرت اور نصیحت لینی چاہیے۔'' ۱۵

آخری عمر میں حالؔی طرح طرح کی بیماریوں کے شکار ہو گئے ۔اُن کے دانتوں میں درد شروع ہو گیا اور دھاڑیں ہلنے لگی جس کا ذکر ۲۱/اکتوبر ۱۸۹۵ء میں خواجہ سجاد حسین کو ایک خط میں یوں کرتے ہیں:

''میری طبیعت اچھی نہیں ہے اُوپر کی دھاڑیں جو ہلتی تھیں آج چار روز ہوئے اُکھڑوالی ڈالی۔مگر اس کے اکھڑوانے سے کچھ آرام نہیں ہوا اور دھاڑوں میں درد معلوم ہوتا ہے۔ اور چونکہ دھاڑ کے اکھڑوانے میں خون بہت نکل گیا ہے۔ اسلئے

ضعفِ دماغ ہوگیا ہے۔'' ۱۶؎

حالی کو نزلے اور کھانسی کی شکایت ہمیشہ رہتی تھی جس سے بلغم بھی زیادہ ہونے لگا ان بیماریوں کا ذکر خواجہ سجاد حسین کو ۲۰ مارچ ۱۸۹۶ء میں لکھے گئے ایک خط میں یوں کرتے ہیں:

''میں اچھا ہوں مگر جب سے ناک اور خلق سے رطوبت اور بلغم بکثرت نکلنے لگا ہے۔ضعف روز بروز زیادہ ہوتا جاتا ہے کچھ طاقتِ بخار نے سلب کی تھی ، کچھ رہی سہی زکام کی نذر ہوگئی ، دماغ بالکل کھوکھلا ہوگیا ہے۔'' ۱۷؎

حالی کو زندگی کے آخری ایام میں موتیا بند کی شکایت ہوگئی تھی لیکن حالی کو اس کا اندازہ اُس وقت ہوا جب وہ حیدر آباد میں تھے۔اس سلسلے میں اُنہوں نے اپنے عزیز واقارب کو کئی خطوط لکھے اُن میں سے ایک خط حیدر آباد سے پانی پت کی واپسی پر ۱۶ / جون ۱۹۰۶ء کو خواجہ سجاد حسین کو تحریر کیا جس میں وہ لکھتے ہیں:

''میں حیدر آباد سے تندرست نہیں آیا۔دائیں آنکھ میں پانی اُترتا معلوم ہوتا ہے اس میں برائے نام روشنی رہ گئی ہے اور روز بروز کم ہوتی جارہی ہے۔'' ۱۸؎

مولانا حالی کی سیرت اس قدر پاک اور صاف تھی کہ لوگوں کا ہجوم آپ کے ساتھ رہتا تھا اس سلسلے میں نہ صرف آپ اپنے عزیزوں کی مدد کرتے بلکہ جو کوئی بھی مالی اور عملی طور سے مدد مانگتا اُسے ہر حالت میں پورا کرنے کی کوشش کرتے اور اگر کسی وجہ سے نہ کر پاتے تو اس کا عذر اپنے خطوط میں لکھ دیتے مولوی محمد یحییٰ صاحب اکثر اپنی شاعری کی اصلاح کی خواہش کا اظہار آپ سے کرتے تھے جس کے جواب میں ایک خط یوں لکھتے ہیں:

''آپ میں شاعری کی عمدہ قابلیت معلوم ہوتی ہے مگر
افسوس ہے کہ مجھ سے آپ کو کوئی مدد نہیں مل سکتی میری ایک آنکھ
میں موتیا کا پانی اُتر آیا ہے اور اس کی روشنی بالکل زائل ہوگئی ہے
ہاں آنکھ بننے کے بعد جہاں تک مجھ سے ہو سکے مدد کروں
گا۔'' 19

حالؔی کے مکتوباتی مجموعے کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے زیادہ تر خطوط اپنے عزیز و اقارب کے لئے لکھے جن میں اپنی گھریلو پریشانیوں اور روزمرہ کے حالات و واقعات کو بیان کیا ہے۔لیکن کچھ خطوط ایسے بھی ہیں جن میں خوشیوں کا تذ کرہ بھی ملتا ہے۔اپنی پوتی کو ایک خط لکھتے ہیں:

''کہاں اچھی ہوتی کہ تم وہاں سے ایسی موٹی تازی ہو کر آؤ
کہ یہاں تمہیں کوئی پہچان نہ سکے اور تم قسمیں کھا کھا کر یقین
دلاؤ کہ میں وہی۔۔۔۔۔۔۔ہوں''۔ 20

مجموعی طور پر مکتوباتِ حالؔی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی دوسری تخلیقات کی طرح آپ کے خطوط نہایت مفید، دلچسپ اور بصیرت افروز معلومات کے حامل ہیں۔ان کے خطوط میں جہاں نصیحتوں اور حوصلہ افزائیوں کا بیان ہے وہیں خا نگی معاملات کا ذکر بھی ملتا ہے۔یہ خطوط حالؔی کی شخصیت کے تمام نشیب و فراز کو پیش کر نے میں معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں۔یہ خطوط حالؔی کے رہن سہن کے حالات اور طرزِ فکر پر بھی روشنی ڈالتے ہیں گویا حالؔی کی شخصیت کا پورا عکس اُن کے خطوط ہیں اور یہی خطوط اُن کی شخصیت کا آئینہ دار بھی ہیں۔

حواشی:

۱) نقوش مکاتیب نمبر۔نومبر ۱۹۵۷ء۔ص۱۴۰
۲) نقوش مکاتیب نمبر نومبر ۱۹۵۷ء۔ص۱۴۴
۳) نقوش مکاتیب نمبر۔محمد طفیل نومبر ۱۹۵۷ء۔ص۴۲
۴) مکتوباتِ حالی (حصہ اول)۔الطاف حسین حالی۔ص۱۲۳
۵) مکتوباتِ حالی (حصہ اول) الطاف حسین حالی۔ص۲۶
۶) مکتوباتِ حالی (حصہ اول) الطاف حسین حالی۔ص۱۹۶
۷) یادگارِ حالی۔ص۴۶۔۴۷
۸) مکتوباتِ حالی (حصہ اول)۔الطاف حسین حالی۔ص۱۹۶
۹) خطوطِ حالی۔الطاف حسین حالی۔۳۶۰۔۳۶۱
۱۰) الطاف حسین حالی تحقیقی وتنقیدی جائزے۔ص۹۴
۱۱) مکتوباتِ حالی (حصہ دوم)۔سجاد حسین ۔ص۱۵
۱۲) اردو میں ادبی خطوط نگاری کی روایت اور غالبؔ (ڈاکٹر نیلوفر)۔ص۸۱
۱۳) نقوش مکاتیب نمبر۔محمد طفیل نومبر ۱۹۵۷ء۔ص۱۴۸
۱۴) الطاف حسین حالی تحقیقی وتنقیدی جائزے۔ص۱۰۹۔۱۱۰
۱۵) خطوطِ حالی۔الطاف حسین حالی۔ص۱۸۵
۱۶) خطوطِ حالی۔الطاف حسین حالی۔ص۲۱۰
۱۷) خطوطِ حالی۔الطاف حسین حالی۔ص۲۶۶
۱۸) خطوطِ حالی۔الطاف حسین حالی۔ص۳۸۰
۱۹) مکتوباتِ حالی (حصہ دوم)۔سجاد حسین ۔۱۳۳
۲۰) تنقیدیں۔ڈاکٹر خورشید الاسلام۔ص۳۲

خطوط شبلی پر ایک نظر

رابعہ بانو میر

ریسرچ اسکالر شعبہ اردو جموں یونیورسٹی

مولانہ شبلی کا شمار اردو ادب کے اہم اور بڑے ستونوں میں کیا جا سکتا ہے۔ ایم۔مہدی حسن نے انہیں سر سید احمد خان ،محمد حسین آزاد، ڈپٹی نظیر احمد اور مولانہ حالؔی کے ساتھ ساتھ اردو کے عناصرِ خمسہ میں شمار کیا ہے۔ادب کی صف میں مولانا شبلی ان کے ساتھ ساتھ شانہ بہ شانہ ضرور کھڑے ہیں لیکن ان کے کینوس پر جتنے مختلف قسم کے اور متنوع رنگ کے مرقعے ملتے ہیں وہ کسی اور کے یہاں دکھائی نہیں دیتے۔مولانا شبلی کی زندگی کا بیشتر حصہ تصنیفی کاموں میں گذرا ہے۔الفاروق، المامون اور سیرۃ العنان جیسی بلند پایہ کتابیں ادب میں ان کی خدمات کے طبل وعلم کی کہانی بخوبی بیان کرتی ہیں۔یہ اردو کی خوش قسمتی تھی کہ مولانہ سید سلیمان ندوی کو اپنے استاد محترم کے مکاتیب جمع کرنے کا خیال آیا اور اس طرح 1914 اور 1917 میں ان کے مکاتیب کی دو جلدیں منظر عام پر آئیں۔

شبلی نے جو خطوط عطیہ بیگم اور زہرا بیگم دو بہنوں کے نام لکھے ہیں انھیں مولوی محمد امین زبیری نے 1925 میں ''خطوط شبلی'' کے نام سے بھوپال سے شائع کیا۔شبلی کی غزلیں جہاں ان کے لئے محبوب کی تعریف کا ذریعہ بنی رہیں تو وہیں مکتوب نگاری کے

ذریعے اظہار دل کی ترجمانی کرتے رہے۔ممبئی کے قیام کے دوران شبلی کی دلچسپی کا مرکز کون تھا، ان کے خطوط سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔عطیہ بیگم فیضی نے ان خطوط کو شائع کرنے کی اجازت دے کرادب پر بڑا احسان کیا ہے۔اگر یہ منظر عام پر نہ آتے تو شبلی کی زندگی کا ایک بیش قیمتی پہلو ہم سے پوشیدہ رہتا۔

شبلی کی مکتوب نگاری کا آغاز 1922 سے ہوتا ہے۔اس وقت ان کی عمر 25 برس کی تھی اور اس کے بعد یہ سلسلہ تا حیات جاری رہا۔ان کے خطوط میں سادہ بیانی، موزوں عبارتیں، طنزیاتی فقرے اور تعلیم نسواں کے موضوعات دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ان خطوط میں زمانے کی مایوسی اور قوم کی بدمذاقی کا ماتم بھی صاف صاف دکھائی دیتا ہے۔تنقید کے اعلیٰ نمونے اور علمی واصلاحی مشورے اور قومی وملکی مسائل کی ترجمانی بھی ان کے خطوط کا خاصہ ہے۔مولانا کے خطوط کی تحریر مختصر ہونے کے باوجو بہت کچھ کہہ جاتی ہے۔

مولانا شبلی کے مکاتیب پر مختلف مجلسوں اور سیمیناروں میں مقالے پڑھے جاچکے ہیں اور تنقیدی مضامین لکھے جاچکے ہیں۔مہدی حسن نے مکاتیب شبلی کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے:

> ''مولانا (شبلی) میں یہ خاص جامعیت تھی کہ جس طرح
> بولتے تھے،اسی طرح لکھتے بھی تھے اور نہایت خوش خط لکھتے تھے''

ایک طرف جہاں مولوی عبدالحق صاحب کو ''خطوط شبلی'' میں ظرافت، ذہانت، طرز ادا، بےتکلفی، آزادروی، محبت وخلوص کا جذبہ جیسا کہ خطوط غالب میں موجود ہے تو وہیں دوسری طرف شیخ محمد اکرام صاحب بھی مکاتیب شبلی کے بارے میں اپنے تجربات کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں:

> ''خطوط شبلی'' (عطیہ اور زہرا کے نام) مشرقی ادب میں

ایک بالکل انوکھی چیز ہے۔ بہ ظاہر تو یہ ایک چند صفحات کا ایک
مختصر رسالہ ہے لیکن ان چند صفحات میں ایک مکمل ڈرامہ آگیا
ہے۔(اور اس انداز سے کہ اس میں آورد اور تصنع کا شائبہ نہیں)
ان خطوط میں آپ دیکھتے ہیں کہ ایک ندی ہے جو پہاڑی چشموں
سے پھوٹتی ہے، پہلے گلزاروں اور مرغزاروں کی سیر کرتی ہیں،
پھیلتی ہیں اور تیز تر اور تند تر ہوتی جاتی ہے پھر آہستہ آہستہ مایوسی
اور سرد مہری کے صحرا میں جا کر آنکھ سے نہاں ہو جاتی ہے''۔

علامہ شبلی کا دور مشرقی قدروں کے عروج کا دور تھا۔ جس میں زندگی کے ہر شعبے پر ایک مشرقی اقدار کی ایک گہری چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ مشرقی رسم ورواج سے ہٹ کر وقوع پذیر ہونے والا چھوٹا سا عمل بھی سنگین صورت حال پیدا کر سکتا تھا۔ شاید یہی وہ وجہ بھی ٹھہری کہ مولانا اور عطیہ فیضی کے ادبی تعلقات بعض لوگوں کے لئے تنقید کا سبب بھی بنے۔ مولانا شبلی کے وہ خطوط جن کو بنیاد بنا کر شبلی کی نرگسیت' جنوں کی حد تک عشق اور مزاج کی رنگینی کی عمارت کھڑی کرنے کی ہر ممکن سعی کی گئی ہے، کے مطالعے سے اندازہ ہوتا کہ وہ تعلیم نسواں کے قائل تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ مسلم عورتوں میں سے کوئی سروجنی نائیڈو کی طرح مقرر بن جائے۔ اپنے ایک خط (عطیہ کے نام) میں اپنے اس احساس، تمنا اور خواہش کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں:

''میں چاہتا ہوں کہ آپ اُن مشہور عورتوں کی طرح اسپیکر
اور لیکچرار بن جائیں جو انگریزی اور پارسی قوم میں ممتاز ہو چکی
ہیں۔ لیکن اردو میں، تاکہ ہم لوگ بھی سمجھ سکیں۔ آپ میں ہر قسم
کی قابلیت موجود ہے لیکن مشق کی ضرورت ہے''۔

پھر آگے چل کر تقریر کے فن کے بارے میں ہدایات دیتے بھی نظر آتے ہیں:

''اردو تقریر میں اصل مضمون کی خوبی سے زیادہ طرز ادا کی
خوبی کا لحاظ ہونا چاہیے۔ بمبئی کے جلسے میں سروجنی نائیڈو گرچہ
نہایت عمدہ بولیں، ڈلیوری بھی اچھی تھی لیکن تصویر کی طرح غیر
معرک رہیں۔ تقریر میں تمام اجزاء کو زبان کا ساتھ دینا چاہیئے''۔

مولانا شبلی کے خطوط ان کی زندگی کے مختلف احوال اور ان کے چیزوں کو دیکھنے کے نظریوں کو بھی سامنے لاتے ہیں۔ مثلاً مولانا شبلی دیگر لوگوں کی طرح فن موسیقی کو برا نہیں مانتے تھے۔ مذہبی حوالوں کی دلیلیں پیش کر کے اس فن پر کسی قسم کے فتویٰ صادر نہیں کرتے ہیں بلکہ اپنے ایک خط میں وہ بار بار عطیہ بیگم صاحبہ کو اس فن کے سیکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔

'' .... ان باتوں کے ساتھ اگر تم موسیقی سے بھی
واقف ہوتو اجازت دو کہ لوگ تم کو پوجیں........''

اس سلسلے میں ایک دوسرے خط کی تحریر بھی ملاحظہ ہو:

''گانے کے ذکر پر ایک بات یاد آئی جو مدتوں سے دل میں
تھی مگر کہنے کی جرأت نہ تھی۔ میں نے ایک دفعہ تم سے خواجہ حافظ
کے شعر سنے۔ خدا نے تم کو خوش آواز عطا کی ہے اور نہایت موثر
آواز ہے۔ لیکن افسوس ہوا کہ تم کو ہندوستانی موسیقی سے واقفیت
نہیں اس لئے تم بالکل بے سر گا رہی تھیں۔ موسیقی کی معلومات
ضرور رکھیں ورنہ بے لطفی پیدا ہوتی ہے''

ان کے خط کی اور تحریر سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عورتوں اور مردوں کو برابر دیکھنے کے قائل تھے۔ کسی بھی طرح کی جانبداری کے حق میں نہ تھے۔ خصوصاً تعلیمی میدان میں اس بات کے حق میں تھے کہ عورتوں کے ساتھ کسی بھی طرح کا امتیاز روا نہ

رکھا جائے:

''نصاب تعلیم کے متعلق میں سرے سے اس کا مخالف ہوں کہ عورتوں کے لئے الگ نصاب ہو۔ یہ ایک اصولی غلطی ہے جس میں یورپ بھی مبتلا ہو رہا ہے۔ کوشش ہونی چاہیے کہ ان دونوں میں جو فاصلہ پیدا ہوا ہے وہ کم ہوتا جائے نہ کہ بڑھتا جائے اور بات چیت، رفتار و گفتار، نشت برخاست مذاق زبان سے الگ ہو جائیں''۔

اسی طرح ایک دوسرے خط میں اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ 'عورتیں خود کمائیں اور کھائیں' تا کہ وہ مرد کے دست نگر نہ رہیں۔ دراصل اس زمانے میں یعنی عطیہ اور زہرا بیگم کے زمانے میں ایک بلند پایہ عالم اور ادیب سے مراسلت کرنا بڑی غیر معمولی بات تھی۔ اور یہ وہ زمانہ بھی تھا جب مشرقی اقدار کمزور پڑ رہی تھی اور سبھی معاشروں و شعبوں میں عورت ایک محرک اور بھرپور کردار ادا کر رہی تھی۔ لیکن یہ دونوں بہنیں ایسے آزادانہ ماحول میں پلی بڑھی تھیں دوسری طرف شبلی ان مصلحتوں کے پیشِ نظر جن کا ذکر پہلے آ چکا ہے ان بہنوں کے عملی اور ادبی شوق کو دیکھتے ہوئے ان کی ہر طرح سے تربیت کرنے کے خواہاں تھے۔ بحیثیت معلم شبلی اپنے کئی خطوط میں اصلاح کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

'''اپنا ہاتھ بتاتی ہیں' ــــــ یہ محض غلط محاورہ ہے، نہ لکھا کیجیے'' (مکتوب 11)

'''قبول ہو' کو آپ 'قبو لھو' لکھتی ہیں ـــــ یہ املا بالکل نامانوس ہے'' (مکتوب 2)

''ڈاکٹر کہتے ہیں سور ہو ـــــ 'سو رہو' کے بجائے 'لیٹے رہو' لکھنا چاہیے'' (مکتوب 7)

غرض شبلی ایک معلم کی طرح تقریر کرنے کا طریقہ، اشعار کی تشریح کر کے سخن فہمی کے سبق، یہاں تک کہ ان دونوں بہنوں کے شوق کو دیکھ کر ان کے لئے مراسلاتی

کورس شروع کروادیتے ہیں۔

شبلی کو اپنے خطوط کے بارے میں دل میں کوئی چور نہ تھا۔ وہ تو عطیہ کے خطوط اپنے دوستوں کے علاوہ اپنی بیٹی کو بھی دکھاتے تھے۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان خطوط میں ویسی کوئی ذاتی آرائش نہیں تھی جو ان کے بعض ناقدین کی تحریوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ درحقیقت خطوطِ شبلی شائع ہوتے ہی ناقدین نے اپنی عمل دخلی کچھ اس طرح سے شروع کر دی کہ اپنی مرضی کے مطابق معنی پہنا دیے اور بسا اوقات اس بات کا دھیان بھی نہیں رکھا کہ کون سا خط کس کے نام ہے اور اس خط کا پس منظر کیا ہے۔اس ضمن میں ابن فرید نے بجا فرمایا ہے:

> ''اکثر اقتباسات کو جو زہرہ بیگم کے خطوط سے ہیں، عطیہ کی طرف منسوب کر کے زبردستی حیات معاشقہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس سے اور کچھ تو نہیں نیتوں کا حال معلوم ہوتا ہے''۔

ابن فرید کے بیان کے بعد بھی بعض ناقدین کو خطوطِ شبلی میں راز و نیاز کی سرگوشیاں، محبت و خلوص کی بو اور حسن و عشق کی داستان دکھائی دیتی ہے تو ایسے ناقدین کے معیار تنقید پر یقیناً سوالیہ نشان لگایا جا سکتا ہے۔

شبلی کے خطوط کے بارے میں میں معین الدین انصاری کے ان الفاظ سے میں اپنی بات مکمل کرنا چاہوں گی:

> ''اگر یہ خط منظر عام پر نہ آتے تو اصلی شبلی ہم سے پوشیدہ ہی رہتے، ہم صرف ان کے تقدس کا احترام کرتے لیکن دل میں ان کے لئے وہ جگہ نہ بنتی جو آج ہے''۔

مولانا محمد حسین آزاد کے سوانحی جھلکیاں
مکاتیبِ آزاد کے آئینہ میں

جاوید احمد شاہ
ریسرچ اسکالر، یونیورسٹی آف جموں

سرسید اور غالبؔ کے بعد خطوط نگاری میں جو اہم نام آتا ہے وہ مولانا محمد حسین آزاد کا ہے۔ان کے خطوط کا پہلا مجموعہ مکتوباتِ آزاد کے نام سے سر عبدالقادر مرحوم کی کوششوں اور میجر سید حسن بلگرامی کی محبت سے ۱۹۰۷ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ مکتوبات آزاد مع دیباچہ مولفہ سید جالب دہلوی، مارچ ۱۹۰۷،مکتوباتِ آزاد مرتبہ آغا محمد طاہر ۱۹۲۳ءاور مکاتیبِ آزاد مرتبہ سید مرتضٰی حسین فاصل ۱۹۶۶ءلاہور سے شائع ہو چکے ہیں۔مولانا کے خطوط تعداد میں کم ہیں لیکن ان کے یہ خطوط تعداد میں کم ہونے کے باوجود اپنی قدر و قیمت میں ہزاروں پر بھاری ہیں۔مکاتیبِ آزاد مرتبہ سید مرتضٰی حسین فاصل کے مجموعے میں شائع شدہ خطوں کے علاوہ ان کی تقریباً پچپیس نادر تحریریں شامل ہیں۔ یہ تحریریں تاریخی لحاظ سے بہت اہم ہیں۔مولانا آزاد نے اپنے خطوط میں حد درجہ صاف اور شستہ زبان استعمال کی ہے۔دقیق اور قدیم اردو کا رنگ ان کے خطوط میں بالکل نہیں ہے اور نہ ہی فارسی استعارے اور مرکب جملوں کا سہارا لیا ہے۔ان کے خطوط پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دلی کی زبان بول رہے ہیں۔ مولانا آزاد کی خطوط نویسی میں مرزا غالب کا انداز نمایاں دکھائی دیتا ہے بلکہ بعض

خطوط ایسے ہیں جن میں یہ فرق کرنا مشکل ہے کہ یہ مولانا کے خطوط ہیں یا مرزا غالب کے۔ مولانا آزاد کے خطوط میں بے ساختگی اور برجستگی ہے۔ تصنع اور آورد بالکل نہیں ہے۔ ہر خط سے خلوص اور محبت کی چاشنی ملتی ہے۔

مکتوباتِ آزاد میں ہمیں مولانا آزاد کی سوانح کی جھلکیاں جا بجا ملتی ہیں ساتھ ہی ساتھ ان کی زندگی کے کئی گوشوں تک ہماری رسائی ہوتی ہے۔ مولانا کے خطوط کو سامنے رکھ کر سوانح آزاد کا مرقع تیار کیا جا سکتا ہے۔ مولانا کی خاندانی کیفیت کیا تھی، وسائل معاش کیا کیا تھے، کن کن علاقوں اور شہروں میں گھومے پھرے، اخلاق و مزاج کیسا تھا، دوست احباب کون تھے، شاگردوں کے ساتھ کیسا برتاؤ تھا، کن کن اداروں سے وابستہ رہے غرض زندگی کے تمام پہلوؤں کی جھلک مکتوباتِ آزاد میں ملتی ہے۔ مثلاً ان کی محکمہ تعلیم میں ملازمت کے متعلق ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد محکمہ تعلیم میں ملازمت کے کس قدر خواہاں تھے۔ نوکری کے سلسلے میں آزاد ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''نوکری کا ابھی تک فیصلہ نہیں ہوا۔ یونیورسٹی لیت و لعل کر رہی ہے اور کہتی ہے کہ ہم تجویز کر رہے ہیں۔ بہت خوب اور اچھا! میری عقل ناقص میں اگست کی چھٹیاں بھی اسی میں گزر جائیں گی''۔ [1]

ایک اور خط میں اپنے دوست میجر سید حسن بلگرمی کو لکھتے ہیں:

> ''میرا حال یہ ہے کہ ڈائریکٹر صاحب نے گورنمنٹ کے حکم کے بہ موجب لکھ بھیجا ہے کہ یکم اکتوبر سے میری تنخواہ یونیورسٹی سے ملا کرے۔ گویا اس تاریخ سے میں ان کے ماتحت سمجھا جاؤں گا۔ یا قسمت! یا نصیب''۔ [2]

مولانا محمد حسین آزاد اپنی رہائش کے متعلق کارندہ راجا صاحب۔ جن کا نام

دھیان سنگھ راجا تھا اور وہ سید مبارک والا کے مکان کے مالک تھے، جس میں مولانا ۱۸۷۹ء سے ماہوار ۹ روپے کرایہ پر رہتے تھے۔ایک خط میں فرماتے ہیں:

''آپ کو معلوم ہو کہ میں ایک مدّت معہود تک مکان سید مبارک والا میں رہا، لیکن افسوس ہے اس کی حقیقت حال نہیں معلوم ہوئی، وہ میں لکھتا ہوں، یکم جنوری ۱۸۷۹ء سے آ کر رہا نو روپے ماہوار کرایہ ٹھہرا۔۔۔۔۲۷ مارچ ۱۸۸۲ء کو سخت تقاضوں سے اور نہایت تکلیف کے ساتھ وہاں سے اُٹھایا گیا۔۔۔'' ۳؎

مولانا آزاد ۱۸۶۵ء میں وسط ایشیا کے سفر پر گئے جس کے متعلق اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''جب ہم کابل سے بلخ کو روانہ ہوئے تو 'کتل دندان شکن' سے اُترتے ہوئے ہمارے قافلہ سالار کا گھوڑا گرا اور اترائی بھی میل بھر سے کم نہ تھی۔ایسے مقاموں پر گر کر گھوڑے یا اونٹ کا سنبھلنا ممکن ہی نہیں۔گھوڑا چور چور ہو گیا۔سامنے ہی ایک گاؤں تھا لوگ وہاں کے سنتے ہی دوڑے اور تکہ بوٹی کر کے لے گئے۔ اور اپنی ہانڈیاں جا گرم کیں۔'' ۴؎

مولانا محمد حسین آزاد کے تعلقات ڈاکٹر لائٹز سے دوستانہ تھے۔لیکن بعد میں یہ تعلقات بگڑ گئے اس کی وجہ یہ تھی کہ مولانا آزاد ''اخبار ہمائے پنجاب'' میں کام کرتے تھے۔سیالکوٹ کے ایک نامہ نگار سید بہادر شاہ کی طرف سے ''اخبار ہمائے پنجاب'' میں ایک خط بابت چوری ملازمین محکمہ ڈاک شائع ہوا۔اس نامہ نگار نے لکھا تھا کہ سیالکوٹ کے ڈاک خانے میں کرنٹے ملازمین نے ایک طوفان اُٹھا رکھا ہے۔وہ خطوط ضائع کر دیتے ہیں، ٹکٹ اتار لیتے ہیں اور لوگوں کے ساتھ بڑی بدتمیزی سے

پیش آتے ہیں۔اس خط کی اشاعت پر بڑا ہنگامہ ہوا۔ پوسٹ ماسٹر جنرل پنجاب نے صدر انجمن سے باضابطہ طور پر شکایت کی اور آزاد کے خلاف کاروائی شروع ہوگئی۔ آزاد اس سلسلے میں ڈاکٹر لائٹز کو فروری ۱۸۷۱ء میں لکھتے ہیں:

''مضمون مندرجہ مورخہ ۲۰ جنوری ۱۸۷۱ء بابت ڈاک خانہ جات کے باب میں حقیقت حال یہ ہے کہ وہ تحریر موجب خط سید بہادر شاہ منشی تحویل خانہ سیالکوٹ کے درج ہوئی تھی۔اس قسم کے خطوط اور مسودے کچھ میرے پاس بھی رہا کرتے تھے اور باقی سر رشتہ انجمن میں ہوتے تھے۔میں نے اپنے مسودوں میں خوب دیکھ لیا، خط مذکور نہیں ہے۔۔۔۔اب صورت اس دریافت کی کچھ مشکل نہیں کاتب کا خط مسل کورٹ میں موجود ہے اور اسی کا خط اخبار عام میں بھی آیا تھا،معلوم نہیں وہاں اصل خط موجود ہے یا نہیں؟ یہ حال انجمن بذریعہ تحریر کے کاتب مذکور سے دریافت کرسکتی ہے'' ۵

مولانا آزاد ڈاکٹر لائٹز سے اپنے تعلقات بگڑنے کا ذکر اپنے شاگرد دلالہ دنی چند سے اپنے ایک خط میں کچھ اس طرح کرتے ہیں:

''مجھ سے ڈاکٹر صاحب سے اب کی دفعہ بڑی سخت طور جنگ ہوئی،نہیں جانتا کہ اب پہاڑ سے اُتر کر کیا رنگ ہو یا تو بھارت کا یدھ ہوا یا گول مول ہوگئی''۔ ٦

مولانا محمد حسین آزاد کی والدہ وفات پا گئیں تو پھوپھی نے آپ کو پالا۔۱۸۵۷ء کی تباہی کے وقت وہ بھی مولانا کے ساتھ تھیں۔دلی برباد ہورہی تھی ان کو مولانا آزاد کے سالگرہ کی فکر تھی۔ان ہی حالات میں وہ گھر سے مولانا کے لئے پھل، مٹھایاں لانے کو جاتی ہیں۔جب تک وہ زندہ رہیں ہر سالگرہ کے موقع پر سات پھلوں، سات

مٹھائیوں پر نذر دلواتی اور شام کے وقت چراغ جلا کر دریا میں بہاتی تھیں۔ ان کے انتقال پر اپنے شاگرد لالہ دنی چند کے نام ۲۷ فروری ۱۸۷۷ء کے خط میں لکھتے ہیں:

''ہمیں ان دنوں صدمہ عظیم ہوا وہ یہ کہ میری پھوپھی صاحبہ نے مجھے پالا تھا اور جو ہمیشہ گھر کی مالک تھیں، ان کا انتقال ہو گیا۔ وہ نہایت نیک نہاد اور خوش اوقات تھیں۔ ان کے سبب سے دل بڑا قوی رہتا تھا۔ اچھا جو اللہ کی مرضی، وہی مالک ہے گھر میں اندھیرا نظر آتا ہے اور وحشت ہوتی ہے''۔ ۷

مولانا آزاد کے مکاتیب میں ایسی تحریریں بھی ملتی ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا آزاد کو اپنے بچوں کے مرنے کا کس قدر افسوس تھا، اور اپنے بیٹے آغا محمد ابراہیم کے لئے فکر مند رہتے تھے کہ جلد سے جلد ان کا گھر آباد ہو جائے۔ آزاد ۱۸۷۵ء کو اپنے شاگرد دلالہ دنی چند کو خط لکھتے ہیں:

''میرے پیارے دو خط تمہارے برابر پہنچے۔ خدا تمہیں خوش رکھے اور آئندہ تمہاری دعاؤں میں اثر دے! مگر ملا باقر عید کے دوسرے دن صبح کو سات بجے مر گئے خیر خداوند عالم آیندہ کو خیر کرے''۔ ۸

مولانا اپنی بیگم کا بھی خیال رکھتے تھے۔ ان کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنے بیٹے، بیوی اور گھر کا کس قدر خیال تھا۔ ۱۳ دسمبر ۱۸۸۶ء کو نواب حسین مرزا کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اب عرض مکرر ہے کہ اس مبارک کام کے سرانجام میں دیر نہ ہو۔ یہاں گھر شنشان، کاروبار ابتر، چیزیں برباد ہیں، کوئی سنبھالنے والا نہیں۔ ایک برخوردار ابراہیم کی والدہ، اس دل شکستہ کے حواس

بجا نہیں رہے خدا جلد وہ دن دکھائے کہ عزیزہ نور چشم ذکیہ بیگم
آئیں، اپنے گھر کو سنبھالیں، وہ جانیں اوران کا گھر''۔ ۹

مولانا محمد حسین آزاد علمی کاموں کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیفات میں مصروف رہے اپنے متعدد مکتوبات میں انہوں نے جا بجا اپنی مصروفیت کا ذکر کیا ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''مجھے آج فرصت مرنے کی بھی میسر نہیں آتی، تمہاری کس
کس بات کا جواب دوں'' ۱۰

ایک اور خط ملاحظہ ہو:

''زندہ ہوں کہ اتنی مدّت کے بعد تمہارے خط کا جواب
لکھتا ہوں۔ کیا کروں مشاعرے کے سبب سے میں بہت عدیم
الفرصت اور پریشان دماغ ہوگیا ہوں''۔ ۱۱

مولانا آزاد کے خطوط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس قسم کا لباس پہنتے تھے اور اپنی پسند کی چیزیں دوسری جگہوں سے منگواتے تھے۔ اپنے شاگرد لالہ دنی چند کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''دو چوتھیاں جگراؤں سے لے کر بھیجئے قیمت فی چوتھی پانچ
پانچ روپے تک، چادر جوڑا باحاشیہ، ایک جبہ پشمینہ کشمیری کالا
حاشیہ دار'' ۱۲

مولانا محمد حسین آزاد کا اپنے شاگردوں کے ساتھ رویہ بہت مشفقانہ ہوتا تھا۔ وہ ان کے ساتھ بڑی محبت سے پیش آتے، ان کی مدد کرتے، ان کی خوشی سے خوش ہوتے اوران کے دکھ سے افسردہ ہوتے تھے۔ اپنے شاگرد لالہ دنی چند کو نائب تحصیل دار کا امتحان پاس کرنے پر لکھتے ہیں:

''عزیزمن! لو، صاحب مبارک ہو! نایب تحصیلداری کیجئے
اور جس طرح چاہیے ہم رعیتی لوگوں کو دبایئے الحمداللہ! الحمداللہ!
اگر چہ یہ میں جانتا تھا کہ ''کوہ نور'' نکلنے والا ہے تمہیں خبر ہو ہی
جائے گی مگر خوشی کے مارے مجھ سے رہا نہ گیا۔ خیر اللہ مبارک
کرے۔۔۔'' ۱۳؎

اپنے اسی شاگرد کو مولانا محمد حسین آزاد وکیل بنوانا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں آزاد نے بہت کوشش کی۔ مکتوبات آزاد میں لالہ دنی چند کے نام جو خطوط ہیں وہ آزاد کی کوششوں اور ہمدردی کا آئینہ ہیں کہ انہوں نے اپنے شاگرد کو وکالت کا امتحان دلوانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ چنانچہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''پندرہ کو آپ کی عرضی برائے سفارش منصفی صاحب رجسٹرار کو دی
تھی، ابھی جواب نہیں ملا۔ نواب سے بھی وعدہ سفارش کا لیا ہے'' ۱۴؎

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

''میں تم سے بہت شرمندہ ہوں کہ اب تک کچھ نہیں کر سکا۔
امید ہے کہ ڈاکٹر صاحب کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے۔ میں نے
ان سے دو دفعہ کہا مگر موقعہ درست نہیں بیٹھا''۔ ۱۵؎

مکتوباتِ آزاد میں سوانح آزاد کی جھلکیاں جگہ جگہ ملتی ہیں۔ مولانا آزاد کی ۱۸۵۷ء سے پہلے کی زندگی، اس کے بعد کی زندگی، دوست احباب کے متعلق، ملازمت کی مصرفیات، غرض زندگی کے بہت سے ایسے مخفی پہلو ہیں جو ہمارے سامنے آتے ہیں۔ جس طرح غالبؔ کے مکتوبات سے غالبؔ کی مکمل سوانح حیات لکھی جا سکتی ہے ٹھیک اسی طرح مولانا محمد حسین آزاد کے مکتوبات سے ہم ان کے بہت سے مخفی حالات سے شناسا ہوتے ہیں جن کے بغیر سوانح آزاد مکمل نہیں ہو سکتی۔

حواشی:

۱۔ مکاتبِ آزاد، مرتبہ سید مرتضٰی حسین فاضل لکھنوی، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۶ء، ص ۱۸۰۔
۲۔ ایضاً۔ص ۲۱۹۔
۳۔ ایضاً۔ص ۱۶۱۔
۴۔ ایضاً۔ص ۴۱۔
۵۔ ایضاً۔ص ۶۴۔
۶۔ ایضاً۔ص ۲۵۲۔
۷۔ مکاتبِ آزاد، مرتبہ سید مرتضٰی حسین فاضل لکھنوی، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۶ء ص ۳۷۔۱۳۶۔
۸۔ ایضاً۔ص ۹۹۔
۹۔ ایضاً۔ص ۲۵۲۔
۱۰۔ ایضاً۔ص ۲۴۵۔
۱۱۔ ایضاً۔ص ۹۰۔
۱۲۔ ایضاً۔ص ۱۴۴۔
۱۳۔ ایضاً۔ص ۱۰۲۔
۱۴۔ ایضاً۔ص ۱۰۷۔
۱۵۔ ایضاً۔ص ۱۱۹۔

اردو میں داغ دہلوی کی خطوط نگاری

محمد اقبال
ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی

خط کو انگریزی میں لیٹر اور پہاڑی اور ڈوگری میں چھٹی کہتے ہیں۔ خط اس تحریر کو کہتے ہیں جو دو دلوں کا راز ہوتی ہے اور جس کو کسی تیسرے انسان کو پڑھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ خط لکھنے والے کو کاتب یا نامہ نگار کہتے ہیں اور جس کے نام خط لکھا جاتا ہے اس کو مکتوبِ الیہ کہتے ہیں۔ خط ایک سچی دستاویز ہوتا ہے جس میں کوئی جھوٹ اور مبالغہ نہیں ہوتا ہے۔ خط انسان کی شخصیت کا بھی آئینہ ہوتا ہے۔

خط کا رواج زمانہ قدیم سے ہی چلتا آ رہا ہے اور ہر دور میں کافی تعداد میں خطوط لکھے گئے۔ اگرچہ موجودہ ددور میں خط کا عام رواج نہیں رہا اور اس کی جگہ الیکٹرونیک میڈیا یعنی (Whatsapp) اور فیس بک (Facebook) نے لے لی۔ لیکن پھر بھی کسی نہ کسی شکل میں آج بھی خط لکھے جا رہے ہیں چاہے وہ سیاسی اعتبار سے ہوں یا تعلیمی اعتبار سے۔ زمانہ قدیم میں مذہبی، سیاسی، ادبی، معاشی اور سماجی ہر شعبۂ جات میں خطوط لکھے گئے اور مشہور بھی ہوئے اور ان کا بہت سارا سرمایہ محفوظ بھی رہا۔

جہاں تک ادبی خطوط کا تعلق ہے تو جو خطوط شاعروں اور ادیبوں کے ہاتھوں لکھے گئے وہ ادبی خطوط کہلائے جیسے مکاتیبِ غالبؔ، مکاتیب مولانا ابوالکلام آزاد، مکاتیب حالیؔ، مکاتیبِ فیضؔ وغیرہ وغیرہ۔ ان کے خطوط کا بہت سارا سرمایہ آج بھی

ہمارے پاس موجود ہے۔۱۹۳۶ء میں جب ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا تو بہت سے شاعروں اور ادیبوں نے جو اس تحریک سے وابستہ تھے ایک دوسرے کو خطوط لکھ کر اس تحریک کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا۔جن میں سجاد ظہیر کے خطوط قمر رئیس کے نام، عصمت چغتائی کے خطوط ڈاکٹر یوسف کے نام قابل ذکر ہیں۔ان ہی ادیبوں ااور شاعروں میں ایک نام داغ دہلوی کا بھی ہے۔جنھوں نے اردو خطوط نگاری میں کافی اضافہ کیا ہے۔ان کے خطوط کی کل تعداد ۲۳۹ ہے۔اب تک ان کے خطوط کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں ''انشائے داغ'' اور ''زبانِ داغ'' قابل ذکر ہیں۔''انشائے داغ''ان کے خطوط کا پہلا مجموعہ ہے جس کو داغ کے شاگرد احسن مارہروی اور ان کے فرزند سید رفیق مارہروی نے مرتب کر کے داغ کے انتقال کے بعد دہلی اردو اکادمی سے شائع کروائے جس میں کل ۱۴۰ خطوط ملتے ہیں۔سید رفیق مارہروی جو احسن مارہروی کے بیٹے تھے''زبانِ داغ'' کے نام سے داغ کے خطوط کا دوسرا مجموعہ ترتیب دیا۔اس مجموعہ خطوط میں سو غیر مطبوعہ خطوط کے ساتھ ایک سو چالیس وہ خطوط بھی شامل ہیں جو پہلے مجموعے میں شامل ہو چکے تھے۔اس مجموعۂ خطوط میں کل ۲۳۶ خطوط شامل ہیں جو ۱۹۵۶ء میں لکھنؤ بک ڈپو سے شائع ہوا۔داغ نے ۲۸ تلمذہ کے نام خطوط لکھے ہیں ان میں سب سے زیادہ مولانا سید علی احسن صاحب کے نام ہیں جو تعداد میں ۴۷ ہیں۔یہ وہی احسن مارہروی ہیں جنھوں نے ''انشائے داغ'' کے نام سے ان کے خطوط کا پہلا مجموعہ شائع کیا۔ان خطوط میں داغ نے روزمرہ محاوروں کا استعمال بھی کیا ہے۔

احسن مارہروی نے لطفِ زبان اور زورِ بیان کو مدِ نظر رکھتے ہوئے''انشائے داغ''میں داغ کے خطوط کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔پہلے حصے میں ان خطوط کو شامل کیا ہے جو اولینِ ریاست، حکام اور امرا کے نام لکھے ہیں۔

دوسرے حصے میں وہ خطوط شامل ہیں جو خاص اعزاو تلمذہ کے نام ہیں ،تیسرے حصے میں وہ خطوط شامل ہیں جو شاگردوں کے نام ہیں۔داغ کے اکثر خطوط کی ابتدا بغیر القاب وآداب کے ہوتی ہے۔خطوط کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ داغ نے مختلف النواع کے القاب استعمال کیے ہیں۔ ہر نئے خط کا القاب نیا اور بدلا ہوا ہوتا ہے۔مگر نواب کلب علی خان کے لئے ہر خط میں ''غریب پرور فیض گستر سلامت'' کا لقب استعمال کیا ہے۔داغ دہلوی نے جو خطوط اپنے دوستوں کے نام لکھے ہیں ان میں شوخیِ ظرافت کے ساتھ لطافت اور دلاویزی بھی پائی جاتی ہے۔اور جو خطوط طوائفوں کے نام لکھے ہیں ان میں رندانہ شوخی بھی پائی جاتی ہے۔داغ کا وہ خط جو انھوں نے منی جان طوئف کے نام ۲۳ جنوری ۱۹۰۳ء میں لکھا تھا وہ شوخی ظرافت سے لبریز ہے۔

> '' حور کی صورت ، نور کی مورت خوش رہو اور ہم سے ملو۔۔۔۔۔کیوں جی تم سے کیوں کر ملیں ،تم کو کیوں کر دیکھیں ،کیوں کر سنیں اور نہ دیکھیں تو کیوں جیں۔جواز لی عاشق مزاج ہو خیال کرو اس کا کیا حال ہوگا ،تم سے یہ امید نہیں کہ خواب میں بھی کبھی نہ آ ؤ۔ہائے مجبوری وائے مجبوری۔''
>
> (سید رفیق مارہروی،زبانِ داغ،ص ۲۰۱)

ایک اور خط جس میں داغ کی شوخی وشرارت پائی جاتی ہے اور جو منی بائی حجاب کے نام لکھا ہوا ہے ملاحظ فرمائیں۔

> ''غضب تو یہ ہے کہ دور بیٹھی ہو پاس ہوتیں تو طبعیت سیر ہوتی کبھی تمہارے گرد گھومتا اور شولہ جوالہ بن جاتا ،کبھی تمہیں شمع قرار دیتا اور پتنگا بن کر قربان ہو جاتا۔کبھی بلائیں لیتا اور کبھی

صدقے قربان ہوجاتا۔"

(سید رفیق مارہروی، زبان داغ ص ۱۸۴)

داغ کے خطوط میں حجاب کے ساتھ ساتھ بے حجابی بھی ہے۔تکلف کے ساتھ ساتھ بے تکلفی بھی ظاہر ہوتی ہے۔داغ بیک وقت میں عشق پرست اور عیش کوش نظر آتے ہیں۔ان کے خطوط میں مکالماتی انداز بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔داغ کے خطوط سے ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔داغ اپنے شاگردوں اور دوستوں سے اپنے معاشقوں کا حال بھی نہیں چھپاتے تھے۔وہ یہ سب کچھ خطوط کے ذریعے ظاہر کردیتے تھے۔خط لکھنے والے کی شخصیت کے ساتھ ساتھ خط میں اس دور کے حالات وواقعات بھی ظاہر ہوجاتے تھے۔اس وجہ سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ خط ہی انسان کے جذبات،میلانات،اخلاقیات،عادات ورجحانات کا بہترین ذریعہ ہے۔

داغ نے اپنے خطوط میں عام بول چال کی زبان استعمال کی ہے۔ان کے یہاں ڈرامائی اور افسانوی انداز بھی ملتا ہے۔اس سلسلے میں ملاحظ ہواس خط کا اقتباس جو انھوں نے منی بائی حجاب کو لکھا تھا۔

"دلدار و دل نواز کیا غضب ہے آنکھ سے اوجل ہوتے ہی تماری نگاہیں پھر گئیں۔وہ سب قول وقرار یک لخت فراموش کر دیے۔خط روانہ کیا تھا وہاں کی دلچسپیوں میں اتنی محو کہ جواب دینا محال،کیا میرے سینے میں دل نہیں، یا دل میں تڑپ نہیں۔کیا بے قرار ہونا مجھے نہیں آتا۔کیا تلملانا میں نہیں جانتا۔ااس خط کا جواب جلد سے جلد نہ آیا تو خود بازار جا کر زہر لاؤں گا اور بے موت مرکر دیکھاوں گا۔"

(سید رفیق مارہروی، زبانِ داغ ص ۹۱)

داغ نے جوخطوط اپنے رشتہ داروں اوراعزیزوں کو لکھے ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ داغ کے دل میں ان کے لئے کتنی ہمدردی، دل نوازی، دل سوزی، وفاداری غم خواری اور دل داری کا جذبہ موجود ہے۔ملاحظ ہو وہ خط جس میں اپنے رشتے کی ایک بہن اولیاء بیگم کے مقدمہ ہارنے پر کہتے ہیں۔

''تم کسی طرح نہ گھبرانہ، بہت اطمنان رکھو۔انشا اللہ تعالیٰ لاہور سے اس مقدمے میں ہم فتح پائیں گے۔فقط وصیت نامے کے خارج ہونے سے کیا ہوتا ہے۔''

(سید احسن مارہروی، انشائے داغ ص ۴۵)

ان سطور سے یہ پتہ چلتا ہے کہ داغ اپنے رشتہ داروں کی پریشانیوں سے کتنے فکرمند ہوتے تھے اور پریشانی کے موقعے پر کس طرح حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان خطوط سے داغ کی سوانح عمری پر بھی روشنی پڑتی ہے اوران کی شاعرانہ خصوصیات بھی ظاہر ہوتی ہیں۔ان کے خطوط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ داغ حسنِ جمال کے نہ صرف پرستار تھے بلکہ طلبگار بھی تھے۔ان کے خطوط سے اس زمانے کے بہت سے واقعات اورحادثات کی طرف اشارہ بھی ملتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط کی اہمیت

ڈاکٹر ریش پال شرما
گورنمنٹ وومن کالج کٹھوعہ
رابطہ نمبر۔94193-77210

''میں مسلمان ہوں،اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں اسلام کی شہرہ ہو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثہ میں آئی ہیں۔ میں تیار ہوں کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تہذب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں:

مولانا نے یہ الفاظ اپنی صدارتی تقریر میں کانگریس کے مارچ ۱۹۴۰ء کے اجلاس میں بولے تھے مولانا آزاد دُنیا کی اُن چند شخصیات میں سے ایک ہیں جنہوں نے اپنی ساری زندگی ملک وقوم کی خاطر صرف کردی۔ وہ ایک منجے ہوئے سیاست دان، عالم دانشور قلم کار مقرر اور تحریک آزادی کے نقیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نامور صحافی ہوگذرے ہیں۔ اُن کی زندگی کے حالات کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو پتہ چل جاتا ہے۔ اُنہوں نے تحریک آزادی کے سلسلے میں قید وبند کی مصیبتیں سہی اور اُن کی زندگی کا بہت سا حصہ جیل میں گذرا ہندو مسلم اتحاد کو قائم رکھنا اُن کی زندگی کا مقصد بن گیا تھا۔ وہ ہندوستان کو آزاد دیکھنا چاہتے تھے اور اُن کی ان تھک کوششوں سے ہمارے ملک کو آزادی ملی۔ کل ۳۵ سال کی عمر میں کانگریس کے صدر کا عہدہ سنبھالا۔ اس کے علاوہ

بھی ملک میں کئی علمی ، دینی و دنیاوی تنظیموں کی سر براہی کی۔ آپ کی تحریر وتقریر میں بھلا کا جادو ہے ایک فٹ میں ۸ تا ۱۸۵ الفاظ بولتے اور ہزاروں کے جملے کو اپنی بہ معنی تقریروں سے مفید کرتے۔ عمر بھر اُردو کی خدمت کرتے رہے۔

مولانا آزاد صحافت وسیاست کے میدن میں اپنی انفرادی حیثیت رکھتے تھے مگر اُنھیں ادب کے ساتھ گہری دلچسپی تھی۔ اُن کی تمام تر تصانیف اُردو زبان وادب کے لئے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں چاہیے وہ قران مجید کا ترجمہ ہو یا ''الہلال''، ''البلاغ'' کے مختلف شمارے یا اُن کے خطبات جن میں زندگی جینے کا درس ہے۔ مولانا کو زبان وبیان پر پوری دسترس حاصل تھی اُن کا اسلوب تحریر وتقریر منفرد ہے۔

چوں کہ میرا موضوع مولانا آزاد کے خطوط کی ادبی اور تہذیبی اہمیت کو واضح کرنا ہے۔ اس لیے میں مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط کے مجموعہ ''غبار خاطر'' جو اُنھوں نے قلعہ احمد نگر میں نظر بندی کے دوران ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۵ء کے بیچ اپنے ایک مخلص دوست حبیب الرحمان شیروانی کو لکھے مگر پوسٹ نہیں کر سکتے اِن خطوط میں مولانا کی مجموعی شخصیت واضح ہو جاتی ہے۔ اس نظر بندی کے دور میں بھی آپ نے لکھنے پڑھنے کے کام کو جاری وساری رکھے ہوئے تھے۔ ''غبار خاطر'' پر روشنی ڈالتے ہوئے مشہور و معروف محقق ونقاد مالک رام یوں رقمطراز ہیں:

ا۔ ''مولانا آزاد کا یہ سلسلہ قید وبند کوئی تین سال تک رہا۔ اولاً اپریل ۱۹۴۵ء میں وہ احمد نگر سے بانکواڑا جیل میں منتقل کر دیے گئے اور یہیں سے بالاخر ۱۵ جون ۱۹۴۵ء کو رہا ہوئے۔ اس نظر بندی کے زمانے کا شمرہ کتاب ''غبار خاطر'' ہے۔ غبار خاطر مولانا آزاد مرحوم کی سب سے آخری تصنیف ہے جو ان کی زندگی میں شائع ہوئی''

غبار خاطر پہلی مرتبہ ۱۹۴۶ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آئی یہ کتاب بظاہر مولانا کے خطوط کا مجموعہ ہیں مگر جن موضوعات پر یہ خطوط لکھے گئے ہیں اُن سے مولانا کی

شخصیت اُن کے حالات زندگی اور دیگر سوانحی حالات واقعات کی زندہ مثال ہے مولانا کا انداز بیان اسلوب نگارش اور سوانح نگاری پوری آب وتاب سے دکھائی دیتی ہیں۔اُن کی طرز نگارش اور ''غبار خاطر'' کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مالک رام لکھتے ہیں۔

''اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں انھوں نے بہت کچھ لکھا اگر ہم اس پورے مجموعے پر تنقیدی نظر ڈالیں تو تسلیم کرنا پڑ گیا کہ زبان وبیان کے لحاظ سے اُن کے اسلوب نگارش کا نقطہ عروج ''غبار خاطر'' ہے اس کی نثر اتنی نپی تُلی ہے اور یہاں الفاظ کا استعمال اس حد تک افراط وتفریط سے بری ہے کہ اس سے زیادہ خیال میں نہیں آ سکتا''

آزاد کا طرز بیان منفرد ہے اپنے ایک خط میں جو ۳ اگست ۱۹۴۲ء کا لکھا ہوا ہے یوں رقمطراز ہیں۔

''رات ایسی حالت میں کٹی جسے میں نہ تو اضطراب سے تعبیر کرسکتا ہوں نہ سکون سے۔آنکھ لگ جاتی تھی تو سکون تھا کھل جاتی تھی تو اضطراب تھا۔گویا ساری رات متضاد خوابوں کے دیکھنے میں بسر ہوگئی۔ایک تعمیر کی نقش آرائی کرتا تھا دوسرا تہذیب کی براہم زن'' اضطراب اور سکون کی یہ مثال شائید ہی کسی دوسرے مفکر کے ہاں ملتی ہو یہ کمال آزاد صاحب کی تحریر میں ہی ملتا ہے۔مولانا کے قلم میں وہ طاقت ہے کہ وہ بڑے سے بڑے مسلے کو نہایت سادگی سے بیاں کر دیتے ہیں۔اُن کی تحریر میں دریا کی روانی اور سیلاب کا جوش محسوس ہونے لگتا ہے۔

سیاسی نظر بندی کیلئے جب اُنھیں احمد نگر لے جایا جارہا تھا تو اس جگہ کا خیال آتے ہی یوں لکھتے ہیں۔

''یہی احمد نگر کا قلعہ ہے جس کی منگی دیواروں پر برہان نظام
شاہ کی بہن چاند بی بی نے اپنے عزم شجاعت کی یادگار زمانہ
داستانیں کندہ کی تھیں اور جنہیں تاریخ نے پتھر کی سلوں سے
اُتار کر اپنے اوراق اور دفاتر میں محفوظ کرلیا ہے۔اس احمد نگر کے
معرکوں میں عبدالرحیم خانخاں کی جوانمردی کا وہ واقعہ نمایاں ہوا
تھا۔جس کی سرگذشت عبدالباقی نماوندی اور صمصام الدولہ نے
نہیں سنائی ہے''

آزاد کی خطابت دُنیا بھر میں مشہور ہے۔وہ اپنے دور کے بہترین مقررین میں سے ایک ہیں اُن کی خطابت میں جادوگری بیان میں شگفتگی اُن کی باتیں سامعین کے دلوں پر اثر کرتی تھیں۔اُن کی تقریر میں نغمگی معلوم ہوتی ہے یہی انداز اُن کی تحریروں میں دکھائی دیتا ہے ایک کے بعد دوسرا جملہ اس طرح چنتے ہیں کہ آنے والے واقعہ کی حقیقی تصویر قارئین کے سامنے آجاتی ہے۔مثال کیلئے اُن کے خطہ کے چند جملے ملحوظ فرمائیں۔

''جس قید خانے میں صبح مسکراتی ہو جہاں شام ہر روز پردہ شب میں چھپ جاتی ہو جس کی راتیں کبھی ستاروں کی قندیلوں سے جگمگانے لگتی ہوں کبھی چاندنی کی حسن افروزیوں سے جہاں تاب رہتی ہوں، جہاں دوپہر روز چمکے ہر روز نکھرے، پرند ہر صبح وشام چہکیں اُسے قید خانہ ہونے پر بھی عیش ومسرت کے سامانوں سے خالی کیوں سمجھ لیا جائے۔

آزاد صاحب کا یہ منفرد انداز بیان تقریر وتحریر دونوں میں یکساں ملتا ہے ایک گہری سنجیدگی اور متانت اُن کی خطوط میں دکھائی دیتی ہے جو پڑھنے والے کو غور وفکر کرنے پر مجبور کردیتی ہے۔معمولی معمولی واقعات کو بھی بڑی خوش اسلوبی اور چابکدستی سے بیان کرتے ہیں کہ اُس کا اثر قارئین کے دل ودماغ پر دیرپا رہتا ہے۔آزاد ایک روشن ذہن کے مالک تھے۔اُن کے تمام تر مضامین جو خطوط کی شکل میں قارئین کو سوچنے اور

غور وفکر کرنے پر مجبور کرتے ہیں اور ایک گہری معلومات اخلاقی درس کی شکل میں اُن کے خطوط میں ہمیں ملتی ہیں۔

اُردو زبان وادب کے ساتھ اُنہیں بلا کا عشق رہا اُنہوں نے عربی، فارسی پر عبور حاصل کیا تھا اور انگریزی زبان کا بھی استعمال کرتے تھے مگر تا عمر اُردو کے حق میں نعرہ بلند کرتے رہے ایک تقریر بحیثیت وزیر تعلیم اُردو کانفرنس میں دی جس میں وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو صدارت فرما رہے تھے۔ اُس میں اُنہوں نے کہا۔

''اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اُردو کی جگہ کہاں ہے اس کی وہی حیثیت ہے جو دوسری زبانوں کی ہے بہت لوگ اب بھی رقیب کی حیثیت سے دیکھنے لگے ہیں۔ حالانکہ اب یہ بات نہیں ہے اب یہ سوال تو اُٹھتا ہی نہیں کہ پورے ملک کی زبان کون سی ہوگی۔ ہندی کو جو جگہ ملنی چاہیے وہ اُسے مل گئی۔ اب ہر ہندوستانی کا خاص فرض ہے کہ اس کے آگے سر جکائے لیکن اس کے ساتھ اُردو کی جو جگہ ہے وہ اسے ملنی چاہیے۔'' مولانا کی ادبی زندگی تین ادوار پر مشتمل ہے پہلا دور وہ ہے جب ۱۴ سال کی عمر میں اُنھوں نے زبانوں اور اخباروں میں لکھنا شروع کیا یہ دور ۲۸ سال کی عمر تک رہا جب اُنہوں ابلاغ والہلال جیسے اخبار نکالے اور ''تذکر'' تصیف کیا۔ دوسرا دور ۱۹۳۶ء تک ہے جو دینی ودنیاوی علم وتعلیم کا زمانہ ہے جس دور میں اُنھوں نے قران مجید کے ترجمہ اور تفسیر میں معروف تھے تیسرا دور ۱۹۳۶ء سے ۴۵ء تک کا ہے اسی زمانے میں انھوں نے خطوط کا مجموعہ قلم بند کیا جس کو ۱۹۴۶ء میں شائع کیا گیا جس کا عنوان ''غبار خاطر'' ہے جس میں اُن کے ذاتی تجربات اور مشاہدات کو نہایت ہی سنجیدہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس دور کی ادبی خدمات اور اُس دور کے اسلوب پر اظہار خیال کرتے ہوئے سید عابد حسین صاحب یوں لکھتے ہیں۔

۱۸۶ء انشائیات ۔ تیسرے دور میں مختلف عوامل نے مولانا کی طبعیت پر اس

کے ساتھ ساتھ ان کے ادبی اسلوب پر گہرا اثر ڈالا ہے عمر تجربے اور قومی ذمہ داری کے بوجھ نے اُن کے مزاج کی لے کو اور تیز کر دیا تھا پھر بیس سال تک قران مجید کے فہم و تفہیم میں مصروف رہنے سے ان کے مذہبی احساس میں جذبے پر سلوک کا رنگ غالب آ گیا تھا۔ اس کے علاوہ مغربی ادب کے مطالعے نے جس کی طرف غالباً مولانا نے اس زمانے میں زیادہ توجہ کی ان کی فکر اور تحریریں نے ضبط و اعتدال پیدا کر دیا۔

''غبار خاطر'' کی اہمیت و افادیت پر اظہار کرتے ہوئے رام صاحب یوں لکھتے ہیں۔

''مولانا مرحوم کے حالات، بالخصوص ابتدائی زمانے کے اتنی شرح و بسط سے کسی اور جگہ نہیں ملتے جتنے اس کتاب میں ان کے خاندان، ان کی تعلیم اور اس کی تفصیلات، حادثات، نفسیات، کردار کی تشکیل کے محرکات ان سب باتوں پر جتنی تفصیل کے ساتھ اِن خطوں میں لکھا ہے۔ اور کہیں نہیں لکھا اور ان کے سوانح نگار کیلئے اس سے بہتر اور موثق تر اور کوئی ماخذ نہیں''

مولانا کی یہ تصنیف اس اعتبار سے بھی قابل ذکر ہے کہ اس میں عربی فارسی کی شکل ترکیب نہ ہونے کے برابر ہیں جو کہ اُن کی دوسری تمام تر تصانیف میں نظر آتی ہیں اُن کی اس تصنیف میں دلکشی ہے کہیں الجھاؤ نہیں ہے زبان و بیان کا اندازا ایسا ہے کہ قاری پڑھتا ہی جاتا ہے اور لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ایک خط میں جیل کے کمرہ کا حال یوں بیان کرتے ہیں۔

''گذشتہ سال جب ہم یہاں آئے تھے تو ان چڑیوں کی آسیاں سازیوں نے بہت پریشان کر دیا تھا چند دنوں تک میں نے صبر کیا لیکن پھر برداشت نے صاف جواب دے دیا اور فیصلہ کرنا پڑا کہ اب لڑائی کے بغیر چارا نہیں یہاں میرے سامان میں چھتری بھی آ گئی تھی میں اُٹھائی اور اعلان جنگ کر دیا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد معلوم ہو گیا اس کوتا دستی کے ساتھ ان حریفان شقف و بام کا مقابلہ ممکن نہیں۔ اب کسی

دوسرے ہتھیار کی تلاش ہوئی۔ برآمدے میں جالا صاف کرنے والا بانس پڑا تھا دوڑتا ہوا گیا اور اُسے اُٹھا لایا اب کچھ نہ پوچھیے کہ میدان کارزار میں کس زور کا رن پڑا کمرے میں چاروں طرف حریف طواف کر رہا تھا اور میں بانس اُٹھائے دیوانہ وار اُس کا پیچھا کر رہا تھا آ کر میدان اپنے ہاتھ میں رہا اور تھوڑی دیر بعد کمرہ ان حریفان شقف وغرہ سے بالکل خالی تھا۔

مولانا آزاد مرحوم نے اپنے خطوط میں کہیں چائے کی کیفیت اور لذت کو بڑے مزے سے پیش کیا ہے تو کہیں سگرٹ نوشی کی علت کو ایک خط میں چائے کی تعریف میں لکھتے ہیں۔

۴۸ ''آپ کہیں گے کہ چائے کی عادت بجائے خود علت تھی۔اس پر مزید علت ہائے نافرجام کا اضافہ کیوں کیا جائے۔اس طرح کے معاملات میں امتزاج وترکیب کا طریقہ کام میں لانا علتوں پر علتیں بڑھانا، گویا حکایت بادہ تریاک کو تازہ کرنا ہے۔ میں تسلیم کرونگا کہ تمام خود ساختہ عادتیں بلاشبہ زندگی کی تلخیوں میں داخل ہیں لیکن کیا کہوں جب کبھی معاملے کے اس پہلو پر غور کیا طبعیت اس پر مطمین نہ ہوسکی کہ زندگی کی غلطیوں کو پلسر معصوم بنا دیا جائے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس روزگار خراب میں زندگی بنائے رکھنے کیلئے کچھ نہ کچھ غلطیاں بھی ضرور کرنی چاہیے۔

مولانا نے غبار خاطر میں اپنے سگرٹ نوشی کی علت پر یوں لکھتے ہیں۔

۴۹ ''جس دن علی الصباح مجھے رہا کیا گیا تو قید خانہ کے دفتر میں سپرنٹنڈنٹ نے اپنا سگرٹ کیس نکالا اور ازراہ تواضع مجھے بھی پیش کیا یقین کیجئے۔جس درجہ کے عزم کے ساتھ دو سال پہلے سگریٹ ترک کیا تھا اتنے ہی درجہ کی آمادگی کے ساتھ پیش کش قبول بھی کرلی نہ ترک میں دیر لگی تھی اور نہ اختیار میں جھجک ہوئی''۔

مولانا کا حافظہ بڑا تیز اور خیالات میں وسعت تھی ایک خطہ میں اپنی قید خانے کی

زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔ خط نمبر ۶

۶۳۔ ''قید و بند کی زندگی کا یہ چھٹا تجربہ ہے پہلا تجربہ ۱۹۱۶ء میں پیش آیا تھا۔ جب مسلسل چار برس تک قید و بند میں رہا۔ ہر ۱۹۲۱ء ۱۹۳۱ء ۱۹۳۱ء اور ۱۹۴۰ء میں یکے بعد دیگرے یہی منزل پیش آتی رہی اور اب پھر اسی منزل سے قاملہ باد پیانے عمر گذر رہا ہوں''

مولانا کی پیدائش ایک ایسے گھرانے میں ہوئی تھی جو مذہبی اعتبار سے کٹر مسلمان تھے مگر مولانا نے اپنی راہ خود اختیار کی جس کا ذکر ایک خط میں یوں کرتے ہیں۔

۶۷۔ ''عام حالات میں مذہب انسان کو اس کے خاندانی ورثہ کے ساتھ ملتا ہے اور مجھے بھی ملا کلین موروثی عقائد پر مانع نہ رہ سکا۔ میری پیاس اس سے زیادہ نکل سیرابی وہ دے سکتے تھے۔ مجھے پرانی راہوں سے نکل کر خود ہی اپنی نئی راہیں ڈھونڈنی پڑیں۔ زندگی کے ابھی پندرہ برس بھی پورے نہیں ہوے تھے کہ طبعیت اپنی نئی جستجوؤں سے آشنا ہو گئی تھی اور موروث عقائد جس شکل و صورت میں سامنے آ کھڑے ہوئے تھے اُن پر متمعین ہونے سے انکار کرنے لگی تھی''

مولانا نے ایک خط میں اپنے بچپن کی عادت کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

۷۸۔ میری ابھی دس گیارہ برس کی عمر ہوگی کہ یہ باتیں کام کر گئیں تھیں۔ بچپن کی نیند سر پر سوار رہتی تھی مگر میں اس سے لڑتا رہتا تھا صبح اندھیرے میں اُٹھنا اور شمع دان روشن کر کے اپنا سبق یاد کرتا۔ بہنوں سے منتیں کیا کرتا تھا کہ صبح آنکھ کھلے تو مجھے جگا دینا وہ کہتی تھیں یہ نئی شرارت کیا سوجی ہے اس خیال سے کہ میری صحت کو نقصان نہ پہنچے۔ والد مرحوم روکتے لیکن مجھے کچھ ایسا شوق پڑ گیا تھا کہ جس دن دیر سے آنکھ کھلتی دن بھر پشمانس سا رہتا آنے والی زندگی میں جو معاملات پیش آنے والے تھے یہ اُن سے میرا پہلا سابقہ تھا۔

مولانا کے خطوط کی ادبی اور تہذیبی اہمیت ہر لحاظ سے قابل قبول ہے۔ اُنھوں نے جو مکاتیب ''غبار خاطر'' کی شکل میں اُردو کو دیئے وہ نہ صرف مولانا کی شخصیت اور

حالات زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں بلکہ اُن میں ادبیت کے تمام تر گروگن رواں ہے۔ اُن کی نثر میں لفظ ومعنی کا توازن فکر کی ہمدردی اُن کا چکمانہ اسلوب اُن کے خطوط میں بھی جاری وساری ہے بھلے ہی یہ خطوط طوالت لیے ہوئے الگ الگ مسائل وموضوع کی دلائل ہیں۔ مگران میں جوتفکر سماجی وسیاسی مسائل قلم بند ہیں وہ اپنے اندر ایک وسیع تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اُن کے ان تمام تر مکاتیب میں جوادبی زبان جس صحت وہمواری اورتوازن سے استعمال کی ہے وہ اُنھیں اُردو دُنیا میں بلند مقام عطا کیے ہوئے ہے۔ اُن کی تحریروں میں ادبیانہ اسلوب ہے جومغربی ادب کے بڑھے بڑے انشاپردازوں کے ہاں ملتا ہے۔ اُن کی انشاپردازی اس خط میں دیکھئے۔

۱۸۷۔ ''انسان کی دماغی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی روک اس کے تقلیدی عقائد ہیں اسے کوئی طاقت اس طرح جکڑ بندنہیں کرسکتی جس طرح تقلیدی عقائد کر دیتے ہیں۔ وہ ان زنجیروں کوتوڑنہیں سکتا اس لئے کہ توڑنا چاہتا ہی نہیں۔ وہ انھیں زیور کی طرح محبوب رکھتا ہے۔ ہرعقیدہ ہرعمل ہرنقطہ نگاہ جواسے خاندانی روایات اور اابتدائی تعلیم وصحبت کے ہاتھوں مل گیا ہے۔ اس کیلئے ایک مقدس ورثہ ہے وہ اس ورثے کی حفاظت کرے گا بسا اوقات موروثی ورثے کی پکڑ اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ تعلیم اورگردوپیش کا اثر بھی اُسے ڈھیلانہیں کرسکتا''

محمد اجمل صاحب جنہوں نے غبار خاطر کا مقدمہ لکھا لکھتے ہیں۔ اور پہلی بار اسے شائع کروایا۔ یوں رقمطراز ہیں۔

'' قلعہ احمد نگر کے اکثر مکاتیب اسی طرز تحریر میں لکھے ہیں انھوں نے نثر میں شاعری کی ہےاور جب مطلب کوادا کیا ہےاس طرح کیا ہے جدت کھر نقش آرائی کر رہی ہےاور وسعت تخیل رنگ وروغن بصر رہی ہے۔ اجتہادفکر اورتجدید اسلوب مولانا کی عام اور ہمہ گر خصوصیت ہے۔ قلم اورزبان کے ہرگوشے میں وہ طرز عام اسے اپنی

زندگی کی روش الگ رکھیں گے اور الفاظ وتراکیب سے لے کر مطلب اور زاویئے مطالب کے طرز تک ہر بات میں تقلید عام سے گریزاں اور اپنے مجتہدانہ اواز میں بے میل اور بے لچک نظر آئیں گے۔

غبار خاطر میں کل ۲۴ خطوط ہیں جو مولانا کے قلم سے لکھے گئے انھوں نے اِن خطوط کے متعلق دیباچہ میں لکھا ہے۔

''یہ تمام مکاتیب نج کے خطوط ہیں اور اس خیال سے نہیں لکھے تھے کہ شائع کئے جائیں گے لیکن رہائی کے بعد جب مولوی محمد اجمل خان صاحب کو اس کا علم ہوا تو مُصر ہوئے کہ انہیں ایک مجموعہ کی شکل میں شائع کر دیا جائے''

نواب صدر یار جنگ کے نام

۹/ اگست ۱۹۴۲ء نظر بند

۱۵/ جون ۱۹۴۵ء

مولانا آزاد نے اِن خطوط میں بھی اپنا شاعرانہ رنگ رواں رکھا ہے اُنھیں عربی فارسی پر عبور حاصل تھا اور دینی اور دنیاوی تعلیم اُن کی گھی میں وراثت سے پڑی تھی لہذا جابجا اِن خطوط میں قران پاک کی آیات کو شعری صورت میں قلم بند کیا ہے۔ ایک ایک خط میں درجنوں اشعار قلم بند ہیں اور اپنی بات مکتوب عالیہ تک لے جانے کیلئے خاص خاص جگہ پر ان اشعار کا ذکر ملتا ہے۔ مگر ان تمام خطوط کی تعریف میں مالک رام ایک جگہ لکھتے ہیں۔

۱۵۱۔ ''اس مجموعے کے بعض خطوط بادی النظر میں بہت معمولی باتوں سے متعلق ہیں مثلاً حکایت ذاغ وبلبل خط ۱۸ یا چڑیا چڑے کی کہانی خط ۱۹۔۲۰ بظاہر ایسے عنوان ہیں جن سے متعلق خیال نہیں ہوتا کہ کچھ زیادہ لکھا جا سکتا ہے لیکن مولانا آزاد کی جولانی قلم کا یہ کرشمہ ہے کہ ان پر ۴۵ صفحے قلمبند کر دیے ہیں۔

مولانا آزاد نے غبار خاطر میں جابجا فلسفیانہ، ادبی اخلاقی علمی، تہذیبی، سماجی

مسائل کوموضوع بنایا ہےطنز ومزاح کا پہلو بھی اِن خطوط کی جان ہے اُنھوں نے ایک دوخطوط میں خدا کی ہستی پر بھی بحث کی ہے قدرتی مناظر اور مسائل کو بیان کیا گیا ہے۔ اُن کا حافظہ اتنا قومی ہے کہ ہر خط ایک علیحدہ مضمون لئے ہوئے ہے۔ چڑیا چڑے کی کہانی کے حوالے سے جو خط ہے اس میں بھی زندگی کی نفسیات کے متعلق کئی باریک باتوں کو بیان کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

۲۱۷۔''ایک دن خیال ہوا کہ جب صلح ہوگئی تو چاہیے کہ پوری طرح صلح ہو یہ ٹھیک نہیں کہ رہیں ایک ہی گھر ہی اور رہیں بیگانوں کی طرح۔ میں نے باورچی خانے سے تھوڑا سا کچا چاول منگوایا اور جس صوفے پر بیٹھا کرتا ہوں اس کے سامنے کی دری پر چند دانے چھٹک دیئے ہو اس طرح سنبھل کے بیٹھ گیا جیسے ایک شکاری دام بچا کر بیٹھ جاتا ہے۔''

ایک دوسرا خط جس میں اُنھوں نے اپنی شریک حیات کا ذکر کیا ہے جو اِن کی نظر بندی کے دوران ہی رحلت فرما گئیں تھی جس موقعہ پر حکومت نے چند شرائط کے ساتھ مولانا کو گھر جانے کی اجازت دے رکھی تھی مگر اُنھوں نے نظر بندی میں رہنا پسند کیا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں۔

۲۳۹۔''اس زمانے میں میرے دل و دماغ کا جو حال رہا میں اسے ہتھیانہ نہیں چاہتا میری کوشش تھی کہ اس صورت حال کو پورے صبر وسکون کے ساتھ برداشت کر لوں اس میں بظاہر کامیاب ہوا لیکن شائد باطن نہ ہو سکا میں نے محسوس کیا کہ اب دماغ بناوٹ اور نمائش کا وہی پارٹ کھیلنے لگا ہے۔ جو احساسات کے ہر گوشہ میں ہم ہمیشہ کھیلتے ہیں اور اپنے ظاہر کو باطن کی طرح نہیں بننے دیئے۔''

عرض مولانا آزاد صاحب کے خطوط موضوعاتی اور معنوی اعتبار سے اُردو زبان و ادب کے ارتقا میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں جن میں عام فہم زبان اور سادہ طرز

بیان سے زیادہ دینی اور دُنیاوی، ادبی، سماجی، سیاسی، اقتصادی تہذیبی اور تمدنی اخلاقی ودرسی مسائل کو بیان کیا گیا ہے۔آزاد صاحب کا شمار چوٹی کے قلم کاروں میں ہوتا ہے وہ اُن کی ادبی اور علمی صلاحتوں کا کرشمہ ہے۔خطوط نگاری کا جب کبھی اُردو دُنیا میں ذکر ہوگا مولانا کی ''غبار خاطر'' کو سرفہرست رکھا جائے گا۔ان مکاتیب میں مولانا کا وسیع تجربہ ومشاہدہ پوشیدہ ہے۔ایک منجھے ہوئے قلم کار وانشا پرداز کی حیثیت سے جیسا موضوع ہے ویسی ہی زبان کا استعمال کیا ہے۔ میں سمجھا ہوں کہ میرے جیسے قاری کیلئے اتنی بڑی شخصیت پر لکھنا سورج کو چراغ دکھانے کے برابر ہے اُن کی تحریروں کو سمجھنے کیلئے باشعور دل ودماغ کی ضرورت درکار ہے۔

ایسی ہمہ جہت شخصیت کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے میرؔ کا یہ شعر پڑھنا چاہوں گا۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

اس مقالہ کو تیار کرنے کیلئے جن کتابوں کی قدر حاصل کی گئی۔

۱۔ غبار خاطر — مولانا ابوالکلام آزاد
۲۔ خطبات آزاد — مولانا ابولکلام آزاد
۳۔ مولانا ابولکلام آزاد کے بارے میں — مالک رام کلکتہ جامع اسلامیہ دہلی
۴۔ ادب اور ادیب — ڈاکٹر اعجاز حسین ادارا انیس اُردو آلہ آباد
۵۔ انشائیات — سید عابد حسین مکتہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
٦۔ تسلسل جون تا دسمبر ۲۰۰۲ء شعبہ اُردو جموں یونیورسٹی

ریڈیوڈراموں کاارتقائی سفر

زُلفی رام
ریسرچ اسکالرشعبۂ اُردوجموں یونیورسٹی

اُردو میں ریڈیوڈراموں کی ایک باضابطہ طور پرایک صنف کی حیثیت رکھتی ہے۔ ریڈیو جونشریات کا باقاعدہ آغاز 1927ء میں ہوا۔ یوں تو ریڈیو کی ایجاد مارکونی کے ہاتھوں ہوا تھا۔اور مارکونی اٹلی کے رہنے تھے۔اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ریڈیو کی ایجاد یا ابتداء اٹلی سے ہوا تھا۔اردو زبان کی ہرایک اصناف سخن کی طرح ڈرامے کے آغاز کے بارے میں مختلف نظریے ہیں۔ریڈوڈرامے کی نشریات کے بارے میں جی سی اوستھی کا کہنا ہے کہ ''1927 میں کولکتہ کے مشہور تھیٹر ''ناٹیہ مندر'' کے ڈرامیے کلتہ ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوئے تھے'' اردو ڈراما۔تاریخ وتنقید کے مصنف عشرت رحمانی ریڈیوڈرامے کے آغاز کے متعلق کہتے ہیں:۔

1936ء کے قریب اس برصغیر میں آل انڈیا ریڈیو کے ذریعہ نشریات کا آغاز ہوا اورادبیات کی ہرصنف نثری پروگرام کالازمیہ قرار پائی۔لہٰذا ڈراما پر جوفنون لطیفہ کا اہم جزواور خصوصاً نثری سرمایہ کالازمی عنصر ہے۔،اص توجہ دی گئی۔ابتداء میں قدیم اسٹیج ڈراموں کومختصر کر کے ہنگامی ضروریات کو پورا کیا گیا لیکن رفتہ رفتہ مخصوص ارباب ادب نے نثری ڈرامے کی مفاہمت کا بیڑا اٹھایا اور پوری توجہ سے خالص نثری ڈرامے لکھنے شروع کر دیئے۔''

عشرت رحمانی کے اس خیال سے کہ اردو میں ریڈیو ڈرامے کا آغاز 1936ء میں ہوا پوری طرح سے ٹھیک نہیں ہے کیونکہ ریڈیو ڈرامے کا آغاز اردو میں 1927ء میں ہی ہو چکا تھا یہی وجہ ہے کہ اردو ریڈیو ڈرامے کی باضابطہ طور پر آغاز کی صحیح اور جامع تاریخ دستیاب نہیں البتہ یہ ایک خیال کیا جاتا ہے کہ اردو میں ریڈیو ڈرامے کی درمیانی تاریخ 1927ء سے 1953ء کے درمیار ہے۔

ریڈیو سے اُردو میں نشر ہونے والی چیزوں میں اسٹیج ڈراموں کے علاوہ ناول، افسانہ، مثنویاں، فیچر Docementry روئیداد، رپورتاژ، سفرنامے، خودنوشت وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ریڈیو ڈراموں کو شروعات ہی عوام کافی کیا کرتی تھی کیونکہ جس وقت ریڈیو ڈراموں کا آغاز ہوا تھا اس وقت ہندوستان میں انٹرنیٹ، ٹیلی ویژن، سڑک، بجلی، کمپیوٹر وغیرہ کے سہولیات میسر نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں ریڈیو ڈرامے زیادہ کامیاب نظر آتے ہیں۔ بلکہ آج بھی بہت سی جگھوں، بہت سے خطوں پر عوام ریڈیو کا ہی استعمال کرتی ہے۔ یہ بات درست ہے کہ ہماری نوجوان نسل ریڈیو کو پسند نہیں کرتی اور ریڈیو ڈراما زوال کی طرف گامزن ہے۔ 1935ء سے ----19 کے درمیان ریڈیو ڈرامے میں بہت ساری تبدیلیاں ہوئی اور ساتھ ہی یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ریڈیو ڈراما کا یہ دور عروج دور کہا جائے گا کیونکہ اس دوران دوسری عالمگیر جنگ کے وقت ریڈیو ڈراما Profaganda کا زبردست ذریعہ بنگیا تھا۔ یہی وجہ یہ کہ یہ دور ریڈیو ڈرامے کا امیاب دور بھی کہلاتا ہے۔ اس دور میں زندگی کی ابتری وتفریح کے موضوعات نے ریڈیو ڈرامے کو بہت مقبول کر دیا اور ریڈیو ڈراما پر آدمی کی زبان زد بن گیا ہوا تھا کیوں کہ ڈراموں کی کامیابی یا ناکامی کا درومدار ہر عوام سے ہوتا ہے۔ اس دور میں ڈرامے میں عظیم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ چاہئے فن کے لحاظ سے یا موضوعات کے حوالے سے۔ ایم. جی ویدیا کا کہنا ہے کہ:

''اس زمانے میں ریڈیو ڈراموں کی پیش کش میں بہت
سے اسٹوڈیوز کا استعمال متروک تھا۔ ریڈیو ڈرامے جلد لکھے اور
پیش کر دیئے جاتے تھے۔ ریہرسل پر کم وقت صرف ہوتا تھا اور
ریڈیو میں اچھے صداکار ملازم رکھے جاتے تھے اور ریڈیو ڈرامے
سے اجنبیت ختم ہوگئی تھی۔''

بنیادی طور پر ریڈیو ڈراماریت سماعتی فن ہے اس میں راوی کو ہر قدم پھونک پھونک کر چلنا پڑتا ہے کیونکہ راوی کی ایک چھوٹی سی غلطی سے پوری کہانی بے اثر پڑ جاتا ہے۔ بہر حال اردو میں ریڈیو ڈرامے کا پہلا کامیاب ڈرامایا پہلا کامیاب مجموعہ کس کا ہے۔ کہاں لکھا گیا کس نوعیت کا ہے اس میں کرشن چندر کو اولیت حاصل رہی ہے۔ اوران کا مجموعہ ''دروازہ'' ایک پہلا اور بہترین ریڈیو ڈرامے کا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ 1937ء میں لکھا ہے اوراسی سال نشر بھی ہوا تھا۔ کرشن چندر بھی ریڈیو سے منسلک رہے ہیں اور زیادہ تر کرشن چندر کے ڈرامے آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوئے ہیں۔ کرشن چندر کے اس مجموعے ''دروازہ'' میں کل چھ ڈرامے شامل ہیں جس میں ''قاہرہ کی ایک شام'' دروازہ، حجامت، بیکاری، نیل کنٹھ، اور سرائے کے باہر شامل ہیں۔ قاہرہ کی ایک شام چھ مناظر پر مشتمل ہے۔ ایک ایکٹ کا ڈراما ''دروازہ'' حقیقی زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ بیکاری کرشن چندر یک بابی ڈراما ہے۔ جس میں بھیالال اور سندرلال راجورلا جو کردار مانے جاتے ہیں کرشن چندر کے نمایاں ڈراموں میں سے ایک دروازے کھول دو ہے جس میں ایکتا اور بھائی چارے کے مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ یوں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کرشن چندر کے ڈراموں میں اونچے، نیچے ودرمیانی طبقے کے مسائل ہمیں دیکھنے کو ملتے ہیں جو آئے دِن ہمارے سماج کی سنگین حقیقت بن چکی ہے۔

ریڈیو ڈرامے جب لکھے گئے وہ تب صرف اورصرف نشریات کے لئے ہی لکھے جانے لگے مگراس سے پہلے بہت سے ریڈیو ڈراموں کو اسٹیج بھی کیا گیا جس سے ڈرامے کے فن پر یہ ڈرامے پوری طرح سے نہیں اتر سکےاورنہ ہی ان ڈراموں کی اسٹیج کوئی باضابطہ تاریخ تھی۔مثلاً ''مرزا جنگی'' جوعظیم بیگ چغتائی کامشہور ڈراما ہے۔ اس پہ شاہداحمد دہلوی لکھتے ہیں کہ:

''اس ڈرامے کو لکھے سولہ سترہ سال ہو گئے اس عرصے میں
متعدد بار ریڈیو سے نشر کیا گیا اوراسکولوں اور کالجوں میں ان
گنت بار اسٹیج کیا جاتا ہے۔''

اس سے ہم اندازہ لگاسکتے ہیں کہ ریڈیو ڈراماایک سماعتی فن ہےاوراسٹیج ڈراماایک نظری فن کی حیثیت رکھتا ہے۔ جو دونوں بالکل ایک دوسرے مختلف ہیں لیکن اس دوران ریڈیو ڈرامے بھی اسٹیج ہوتے گئے۔

کرشن چندر کے ساتھ راجندر سنگھ بیدی نے بھی ریڈیو ڈرامے کے متعلق اپنے دو مجموعے یادگار چھوڑے ہیں جن میں ''اسٹ کھیل''اور''بے جان چیزیں'' شامل ہیں۔ بے جان چیزیں 1943ء میں اورسات کھیل 1946ء میں منظر عام آئے بے جان چیزیں میں چارڈرامے شامل ہیں جن میں کارکی شادی، روح انسانی، اب تو گھبرا کےاور بے جان چیزیں شامل ہیں۔دوسرا مجموعہ سات کھیل میں سات ڈرامے شامل ہیں جن میں خواجہ سرا، چانکیہ، تلچھٹ،نقل مکانی، آج، رخشندہ اور پاؤں کی سوچ وغیرہ شامل ہیں۔ بیدی بھی کرشن چندرکی طرح آل انڈیا ریڈیو میں ملاؤ اٹھے۔ بیدی کے ڈراموں کا مواد ہماری سماج کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے مسائل پرمبنی ہے۔بہرحال اس دوران جن جن ڈرامانگاروں نے ریڈیو ڈرامے لکھے ہیں ان میں ایک لمبی فہرست شامل ہے۔

ناصر شمسی کا ''سحر ہونے تک''،فضل الحق قریشی کا ریڈیو ڈرامے،اپندر ناتھ اشک کے ''ازلی راستے'' شوکت تھاونی کا سنی سنائی ہے مجھے خرید لو،رقاصہ،سعادت حسن منٹو کا منٹو کے ڈرامے، جنازے،آؤ، تین عورتیں، پھندے، اپندر ناتھ اشک تو لیے پڑوسن کا کوٹ،سوکھی ڈالی، چھٹا بیٹا،رفعت عروش کے عروج آدم،شاہجہاں کا خواب، اس دیوار کے سایے،اظہر افسر ننھا قیدی، بھول ہی بھول،موج در موج غالب چچا اور نارنگی کی خوشبو،شمیم صنفی کا مٹی کا جلاوا، مجھے گھر یاد آتا ہے۔ زندگی کی طرف، بازار میں نیند،آفاق احمد نے مجموعوں میں تین ڈرامے،کڑی دھوپ گھنی چھاؤں، وہ آدمی، جال ، رام لعل، آتش خود، کشمیری لال ذاکر کا سلاخ ٹوٹتی ہے، ڈاکٹر محمود حسن کا پیسہ اور پرچھائیں ،تماشا اور تماشائی، کرتار سنگھ دگل کا دیا بجھ گیا۔ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اردو ریڈیو ڈراما نگاروں کی ایک طویل فہرست موجود ہے جس میں اپر دیئے ہوئے فنکاروں کے علاوہ اور بھی کافی تعداد میں شامل ہیں۔ان ڈراما نگاروں نے صرف اور صرف طبع زاد ڈرامے لکھے اور بے شمار موضوعات پر اپنے قلم کو اٹھایا جس سے عوام نے سیدھا الور سے ان ڈراموں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ان ڈراما نگاروں نے افسانوں، داستانوں، تاریخی، مختلف ڈراموں وکہانیوں س ے فائدہ بھی اٹھایا۔

مسئلوں کو نہ صرف اُجاگر کیا بلکہ Indirectly ان مسئلوں کے خلاف لڑائی لڑی اور عوام کے جذبے کو ابھارا گیا۔ بلکہ سیدھے طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ریڈیو ڈرامے نے بھی ہندوستانی تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرادیا۔ اور قوم ملک میں امن، بھائی چارہ،خوشحالی کا ایک واضح پیغام دیا۔ چین اور پاکستان سے ہندوستان کی جنگوں پر بھی ریڈیو نے قومی یکجہتی، ایکتا وجذباتی ہم آہنگی پر زور دیا۔اسی طرح دوسری عالمگیر جنگ عظیم کے موقعوں پر ریڈیو ڈراموں نے انسانیت کا پیغام دیا۔

فرقہ پرستی پر فسادات نہ صرف آج کے دور میں قائم ہیں اور فسادات برپا ہو رہے ہیں بلکہ ہندوستان کی آزادی سے پہلے اور ہندوستانی آزادی کے بعد بھی فرقہ واریت فسادات کی وجہ سے ہندوستان کی قوم تقسیم ہو رہی تھی ایسے میں ریڈیو ڈرامے کا اس مسئلے پر بہت اہم کردار رہا ہے کیونکہ ڈراما نگاروں نے اس مسئلے پر حقیقی زندگی کا آئینہ عوام کے سامنے رکھا۔

ریڈیو ڈرامے کا ایک بہت بڑا رول یہ بھی رہا ہے کہ کسی بھی بڑے شاعر وادیب کی یوم پیدائش ووفات وان کے ادبی کارناموں کو ان کے سوانحی حالات پر ڈرامے نشر کرائے ہیں جس سے اردوداں طبقے کو بڑے واسطہ بہت بڑا فائدہ پہنچتا ہے اردو ڈراما جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ یہ ایک صنف کی صورت اختیار کر چکی ہے ایسے میں ریڈیو ڈرامے نے نہ صرف ادبی لحاظ سے اپنے رول کو بخوبی انجام دیا ہے بلکہ غیر ادبی طور رطریقوں سے بھی لوگوں کو فائدہ پہنچایا ہے غالب کی صد سالہ تقریبات ہو یا مہاتما گاندھی کی پیدائش ہو، ریڈیو ڈراما ان تمام چیزیوں پر نزدیکی نگاہ رکھتا ہے اور ڈرامے کے ذریعے نشر کراتا ہے۔

مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ریڈیو ڈراما ایک مشکل فن ہے لیکن اس کے باوجود جس طرح سے ڈراما نگاروں نے ریڈیو ڈرامے لکھے ہیں جس میں کرشن چندر پریم چند، منٹو، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، محمد حسن وغیرہ جیسے ادیبوں نے ڈرامے اردو میں مایہ ناز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حالانکہ ریڈیو ڈرامے کی کوئی زیادہ لمبی تاریخ نہیں ہے لیکن اس چھوٹے سے عرصے میں ریڈیو ڈرامے سے متعلق بہت بڑا کام ہوا ہے جو شاید اسٹیج ڈرامے کے حوالے سے بھی نہیں ہوا ہوگا۔ ریڈیو ڈرامے میں بھی اسٹیج ڈرامے، فلموں و کہانیوں کی طرح فلیش بیک تکنیک استعمال کی گئی جو ریڈیو ڈرامے کو دلچسپی کی اور لے جاتی ہے۔ اردو ڈرامے کے حوالے کی ترقی سے بہت

سے ریڈیو اسٹیشن کا زبردست رول رہا ہے جس میں وودھ بھارتی، رتنا گر، ہوا محل، ڈرامے کا قومی پروگرام، ریڈیو کشمیر جموں، ریڈیو کشمیر سرینگر وغیرہ اہم مانے جاتے ہیں جنھوں نے معیاری واہم ریڈیو ڈرامے نشر کرائے ہیں، سینکڑوں، ہزاروں سامعین پیدا کئے جو ریڈیو ڈرامے میں دلچسپی دکھانے لگے۔ البتہ یہ بات حقیقی ہے کہ موجودہ دور میں ریڈیو ڈرامے میں عوام کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔ لیکن ریڈیو ڈرامے کی تاریخ و ریڈیو ڈراموں کو پڑھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اردو ریڈیو ڈرامے نے قلیل مدت میں فکری و فنی خوبیوں کے قابل ذکر فن پارے پیش کیے ہیں جو رہتی دنیا تک یاد کیے جائیں گے جس سے نہ صرف ادبی و اردو داں طبقے نے فائدہ اٹھایا ہے بلکہ غیر ادبی ومختلف زبانوں سے تعلق رکھنے والے افراد نے بھی خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ جس سے اردو ریڈیو ڈراما نے نیا بلند مقام حاصل کرلیا ہے۔

خطوط نگاری کی روایت واہمیت

نصیر احمد ڈار
پی ایچ ڈی اسکالر (برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال)

احساسات ، جذبات اور خیالات کو قلم کی مدد سے کاغذ پر اتارنے اور انھیں دوسروں تک پہچانے کا عمل کو خطہ نگاری کہلایا جاتا ۔ خطوط نگاری در اصل ترسیل خیالات واظہار کا بہترین وسیلہ ہے۔ خط کی تعریف بقول سید سلمان ندوی:

''خط دلی جذبات کا ، خیالات کا ، روزنامچہ اور اسرارِ حیات کا صیحفہ ہے۔ اسمیں وہ صداقت وخلوص ہے جو دوسروں کے کلام میں نظر نہیں آتا''۔

آپ نے عربی کا پرانا مقولہ سنا ہوگا المکتوب نصب الملاقات'' یعنی خط ادھی ملاقات ہوتا ہے ۔ خط آدھی ملاقات نہیں ہوتا ہے بلکہ ایک معنی میں پوری ملاقات ہوتے ہیں اور بعض اوقات یہ ملاقات ظاہری ملاقات سے بھی زیادہ دلچسپ اور کامیاب ہو جاتی ہے۔ اسے کہیں زیادہ بلیغ ، اسے زیادہ فرحت رسا ، خوشگوار اور مسرت بخش ۔ کہا جاتا ہے کہ ایک اچھے خط کیلئے مختصر صنفت تحریر ہوتا ہے اور اسکا حُسن اسکے اختصار میں نکھرتا ہے ۔ اسکے علاوہ خط میں رسمی مکالم بھی ضروری نہیں ، بلکہ صرف بول چال کی سی ہے بے تکلفی مطلوب ہے۔

اوپر سے جو تحریر ہم نے خط کے بارے میں پڑھا ہے اسے باآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ دراصل خط نگاری ایک ایسی صنف ہے جسے نہ اصول وضوابط کی قید میں جکڑا جا سکتا ہے اور نہ خیال کی۔ عام فہم باتیں ہوں یا عقل وخرد سے تعلق رکھنے والی بصیرت افروز باتیں، گفتگو خواہ کسی موضوع پر ہو مکتوب نگار اپنے خط کے ذریعے اسے کبھی ذاتی تو کبھی صفاتی، کبھی وقتی تو کبھی دائمی اور کبھی مقامی تو کبھی افاقی اور لازوال بنا دیتا ہے۔

خط نگاری کی اردو میں ادبی اور سوانحی اہمیت بیان کرتے تو یہاں ایک باکمال شخصیت پروفیسر گیان چند لکھتے ہیں:

> ''ادبی خطوط میں اس (مراد ادیب) کی ادبی شخصیت کھل کر سامنے آتی ہے۔ متعدد ادبی مسائل پر اسکی مختصر رائے معلوم ہوتی ہے۔ بعض ادبی خطوط میں تنقید وتحقیق کے جواہر پارے بھرے ہوتے ہیں۔ کسی ادیب کے ذہنی ارتقا ر ادبی سفر اور اسکی تصانیف کو سمجھنے میں اسکے مکاتیب سے جو مدد ملتی ہے، وہ سب سے مستند تحقیقی ماخذ ہے''۔ا

خطوط سوانحی خاکوں کو مرتب کرنے میں ایک اہم رول ادا کرتا ہے۔ فنکار کی زندگی کے حالات خاندانی عقائد ونظریات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ حسب ونسب کے متعلق اہم نکات بیان کرتے ہیں۔ سیرت وشخصیت کا علم خطوط کے ذریعے ہی ہوتا ہے۔ خط نگار اپنے پیش اور پرکھتا ہے۔ ان تمام باتوں کا اندازہ باسانی لگانے میں خطوط مدد کرتے ہیں۔ فنکار ہو یا ادیب، اسکی زندگی کے حالات مرتب کرنے میں مکاتیب مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

تاریخی اعتبار سے خطوط نگاری کی بڑی اہمیت وافادیت حاصل ہیں۔ بعض خطوط میں تاریخی مواد بہ کثرت موجود ہوتا ہے۔ مثلاً اردو میں غالب کے خطوط ۱۸۵۷ء کے

غدر کے دوران عوامی زندگی کی داستان سناتے ہیں۔خاندانِ تیموریہ کی معاشی بدحالی، برطانوی سامراج کے ظلم وستم کی داستان کو مختصر مگر جامع انداز غالب نے پیش کیا ہے۔

ا۔اردو میں ادبی خط نگاری کی روایت اور غالب (ڈاکٹر بیگم نیلوفر احمد) ص ۲۳:

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہندوستانیوں سے اپنی ہمدردی اور برطانوی سامراج کے خلاف براہ راست اوازنہیں اُٹھا سکتے تھے مگر اپنے خطوط کے ذریعے سب کچھ کہہ گئے ہیں ۔ غالب کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد صاحب نے قید میں رہتے ہوئے وقت کا صحیح استعمال ،غبارِ خاطر، کے خطوط لکھ کر کیا اور ان میں قید بند کے حالات بھی درج کیے۔اسی طرح حسرت موہانی کو بھی قید کیا گیا تھا۔انکے حالات کی عکاسی انکے خطوط سے ہو جاتی ہے۔منشی دیا نارائن نگم کے خطوط میں ان کے تاریخی دور بھی موجود ہیں۔

۱۹ویں صدی کی دین تھا اسی طرح خط نگاری میں بھی فارسی خط نویسی کی ہی تقلید کی۔بقولِ سعید محمد عبداللہ ’’اردو خط نگاری کا اولین دور فارسی انداز سے متاثر تھا۔وہی القاب وآداب، وہی سفر نامے، وہی عنوانات، وہی اختتامیے، وہی رنگ انشاء اور وہی رنگی،مگر انیسویں صدی کے ربع اول میں سادگی کا کچھ میلان پیدا ہوا‘‘۔(۱)

ان چند سطور سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساری باتیں من وعن فارسی سے منتقل ہو کر اردو میں وجود ہوئیں ۔ چنانچہ اردو خطوط کے ابتدائی مجموعے اسی انداز میں ہیں ۔ یہاں قاری کے ذہن میں یہ سوال بار بار اٹھتا ہے کہ اردو میں خط نگاری کا آغاز ہوا تھا۔اس سلسلے میں علمائے ادب کی ارا میں اختلاف پایا جاتا ہے۔مثلاً: مالک رام اپنے مقالے ’اردو کے منفرد مکتوب نگار‘ میں فرماتے ہیں۔’’غالب سے پہلے ’’فسانہ عجائب‘‘ رجب علی بیگ سرور نے خطوط لکھے اور شائع کیے‘‘۔

ا۔ارسالہ نقوش۔مکاتب نمبر۔جلد اول۔ص ۱۷

۲۔نقوش لاہور۔خطوط نمبر۔مدیر محمد طفیل۔اشاعت ۱۹۶۸ء۔ص ۳۹

حامد حسن قادری صاحب لکھتے ہیں ''بے خبر اردو میں نثر نویسی و خطوط نویسی کی طرف ۱۸۸۶ میں توجہ کی یعنی غالب سے بھی کچھ پہلے۔ڈاکٹر خلیل انجم نے اپنی کتاب 'غالب اور شاہان تیموریہ' میں اردو کے اولین خطوط کی طرف توجہ مرکوز کرائی ہے اور جان طپش اور راسخ عظیم آبادی کو اولین خط نگار مانا جاتا ہے'۔جن کا خط ۱۸۱۴ء سے پہلے لکھے گئے ہوں گے۔ایک تحقیق کے مطابق اردو کا پہلا خط ۱۸۲۲ء میں لکھا گیا۔ پروفیسر گیان چند جین لکھتے ہیں: ان سب کے برعکس پروفیسر ثریا حسین کے تحقیقی مقالے میں مشمولا خطوط کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو کا اولین خط جنوری ۱۸۱۰ء کو لکھا گیا جسکے مکتوب نگار افتخار الدین علی خان شہرت تھے۔یہاں بات بتانا میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کا شمار فورٹ ولیم کالج کے ملازمین میں ہوتا تھا۔

اوپر کے ان چند سطور سے ہم نے یہ چیزیں دریافت کیں ہیں کہ اردو میں غالب سے پہلے خط نگاری کی روایت میں رجب علی بیگ سرور صاحب کو اولیت حاصل ہے۔ سرور صاحب مرزا غالب کے ہم عصروں میں شامل تھے۔سرور صاحب ''انشائے سرور'' خطوط کا پہلا مجموعہ تھا جس کے مطبع نول کشور لکھنوی نے ۱۸۸۶ء میں شائع کیا۔ خط نگاری ان کا محبوب مشغلہ تھا۔سرور اپنی تحریر میں عبارت کی دلکشی اور اس کی جاذبیت کا خیال رکھتے ہیں۔وہ اپنے دور کی ترجمانی لکھنو کی معاشرتی زندگی ان کے خط نگاری میں نمایاں نظر آتی ہے۔دوسری طرف سے قارئین کرام کو غالب نظر آتا ہے اور اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ اردو میں خط نویسی کی ابتدا غالب سے ہوئی۔لیکن یہ درست نہیں ۔غالب سے پہلے رجب علی بیگ سرور نے خطوط لکھے اور شائع کیے جو میں نے اوپر بیان کیا ہے۔پر یہاں یہ سوال قاری کے ذہن میں بار بار کیوں آتا ہے کہ غالب کی مکتوب نگاری ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ہاں یہ سچ ہے کہ غالب نے خطوں میں ایسا

نیاانداز اختیار کیا کہ انھیں سحر حلال بنا دیا۔اس سے پہلے اور خود ان کے زمانے میں بھی فارسی خطوط میں لمبے لمبے القاب وآداب اور عبارت آرائی کی بھر مار تھی کہ سطریں پڑھ جایئے لیکن مدعی عنقا ہے اپنے عالمِ تحریر کا۔ یہ تو ممکن نہیں کہ کسی کو بھی اس اسلوب تحریر کی لغویت کا خیال نہ آیا ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ اسے ترک کر دینے یا اس میں اصلاح کی جرات نہیں ہوئی ۔اس کا سہرا بھی غالب کے سر رہا۔ بہر کیف مرزا غالب نے جس وقت اردو میں خط نگاری کا آغاز کیا تب تک اردو نثر سلاست کی راہ پر گامزن ہو چکی تھی ۔ غالب کے مکتوب نگاری کے بارے میں حالی نے کہا تھا کہ ۱۸۵۰ء میں غالب نے اردو نثر میں خط لکھنا شروع کیے ۔ غالب کے اردو اور فارسی میں ۱۲۱ ایسے خطوط دستیاب ہوئے ہیں جو انکی زندگی اور انکی شاعری کے بعض گوشوں پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔

مکاتب غالب ایک بہت بڑا سر چشمہ ہیں ،جس میں غالب کی زندگی ،شخصیت ، نفسیاتی رجحانات کی ایک طرف سادہ سلیس ،رواں اور خوب صورت اردو ملتی ہے۔اس کو ہم اردوئے معلیٰ کہتے ہیں ۔ دوسری طرح غالب کی زندگی کی طبقاتی کش مکش ،ان کے مذہبی عقائد ،ادبی نظریات ،معاشی اور تہذیبی قدریں ،ان کے خاندان کی روایت ،زندگی کے نشیب وفراز بھی ان خطوط میں ملتے ہیں ،جن سے اس دور کی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔

دیوان غالب میں ہمیں جو شخصیت ملتی ہے ، جو ذہین ملتا ہے ، جو فکر ملتی ہے ،انہیں قریب سے دیکھنے کا موقعہ صرف مکاتب سے ملتا ہے۔

غالب کے متعلق سوچتے ہوئے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ان کی شخصیت ٹیڑھی ہے سیدھی نہیں ۔"یادگار غالب" کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ مولانا حالی اپنی سیدھی سادھی شخصیت کے ساتھ غالب کی ٹیڑھی شخصیت کو نہ سمجھ سکے ، ورنہ یادگار

غالب سچ مچ یادگار غالب بن جاتی۔

مرزا غالب ۱۷۹۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۶۹ء میں انتقال کر گئے۔ان کی لگ بھگ ۷۳ برس کی کہانی بہت دلچسپ بھی اور طویل بھی ہے۔

مکاتیب غالب کے مطالعے سے ۱۹ویں صدی کا ہندوستان سامنے آتا ہے۔اس وقت کا نظام،اس وقت کا تصادم جو دو تہذیبوں کے ٹکرانے سے پیدا ہوا تھا۔ایک قدیم تہذیب جو صدیوں سے قائم تھی۔دوسری تہذیب جو انگریز اپنے ساتھ لائے تھے۔ ایک طرف مغلیہ سلطنت کا زوال بھی تھا اور نیا نظام بھی تھا، جو انگریزی تہذیب کا لایا ہوا تھا۔وہ نظام حیات جو انگریز اپنے ساتھ ہندوستان لائے تھے، برابر قدم جما رہا تھا ۔اس کش مکش میں حساس انسان الجھ کر رہ گئے تھے۔ان دونوں نظاموں کی کش مکش ان مکاتیب اور دیوان غالب میں نظر آتی ہے۔ غالب جانتے ہیں کہ سلطنت مغلیہ ختم ہو رہی ہے۔اس کی اعلیٰ قدریں ٹوٹ رہی ہیں۔ایک تہذیب کے مٹنے کا غم اور دوسری طرف مغربی تہذیب کو خوش آمد کہنے کی آرزو ان کے مکاتیب میں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔

مکاتیب غالب میں کہانی کا لطف بھی ملتا ہے اور مکالمے کا لطف بھی۔غالب نے اپنے مکاتیب میں آسان اور سادہ ادبی نثر لکھنے کا ایک اہم اور قابل قدر تجربہ ہے۔ اس نثر میں سادگی اور صفائی ہے۔روانی اور بہاؤ ہے۔اس میں مجموعی طور پر بڑی شگفتگی اور شادابی کا احساس ہوتا ہے۔اس میں سادگی کا حسن بھی ہے اور حسن کی سادگی بھی لیکن اس کے باوجود یہ رنگین اور پر وقار نظر آتی ہے۔

اردو خطوط نویسی میں مرزا غالب نئے اور انوکھے طرز تحریر کے موجد ہیں۔مرزا نے بقول ان کے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا اور اس پر دعوے سے اپنے تنقیدی خیالات بھی پیش کیے ہیں۔اپنے ایک عزیز حاتم علی میر کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

''ہزار کوس سے بزبان قلم باتیں کیا کرو۔ہجر وصال کے مزے لیا کرو''اردو نثر میں مرزا نے جوادبی سرمایہ چھوڑا ہے وہ ان کے نجی خطوط ہیں، جن میں ذاتی باتیں زیادہ تر ملتی ہیں۔لیکن غالب کے طرز تحریر میں وہ جادو ہے جن سے ان کے نجی خطوط ادبی حثیت اختیار کر گئے۔انہوں نے جگہ جگہ ادبی تجربے کی بہت اچھی مثالیں دی ہیں۔مکاتیب غالب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مرزا عام زندگی کی چھوٹی باتوں کو ادبی تجربے میں ڈال کر پیش کیا ہے۔

اردو کی تاریخ میں مکاتیب غالب، جمالیاتی اور فنی اعتبار سے بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ان میں نہ صرف خطوط نویسی کے فن کا نیا اور اچھوتا انداز بیان ملتا ہے بلکہ ادبی نثر کی ایک نئی اور انوکھی صورت نظر آتی ہے۔

مرزا نے اپنے فن کے ہر میدان میں روایت سے بغاوت کی ہے۔اپنے عہد کی روایت سے بغاوت کرنے کی سب سے بڑی مثال ان کا نیا اور انوکھا انداز ہے، جو مرزا سے پہلے کسی کو نصیب نہ ہوا اور نہ ہی مرزا کے بعد کسی کی قسمت میں آیا۔

حالاں کہ اردو نثر میں جن ادیبوں کو صاحب طرز کہا جاتا ہے اور جن کی تحریریں ان کی منفرد اسلوب کی وجہ سے شاہکار سمجھی جاتی ہیں، ان میں سے اول مرزا غالبؔ، محمد حسین آزاد، رجب علی بیگ سرور، میر امن، رتن ناتھ سرشار، سرسیدؔ، شبلی، نذیر احمد، مہدی افادی اور ابوالکلام ازاد ہیں۔ان میں ہر ایک ادیب کے اسلوب کی اپنی اپنی خوبیاں ہیں لیکن مولانا آزاد کی نثر کا اسلوب سب سے عمدہ اور منفرد تصور کیا جاتا ہے۔ جس طرح غالب کی شاعری کو اردو شاعری کی آبرو قرار دیا جاتا ہے۔اگر غالب کے کلام کو اردو شاعری سے الگ کر دیا جائے تو اردو شاعری جسد بے روح اور پیکر بے جان ہو جاتی ہے۔اسی طرح مولانا ابولکلام آزاد کی نثر اردو کی جان اور شان ہے اور یہ ایک ایسی شمع ہے جس کے بغیر اردو نثر کی بزم میں اجالا نہیں ہو سکتا ہے۔

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں مزہ نہ رہا

دوئم اس میں دریائے فصاحت کی روانی بھی ہے اور علم وفضل کا سکون بھی، صحت فکر، ہمواری اور توازن نے مولانا کی اس دور کی تحریروں میں منفرد اور تخلیقی اسلوب کی شان پیدا کردی جو جدید مغربی ادب کے گنے چنے انشاپردازوں کا طرہ امتیاز رہا ہے۔ مولانا آزاد کی شہرآفاق تصنیف 'غبار خاطر' اس کی مثال ہے۔

غبار خاطر نواب یار جنگ مولانا الرحمان خان شیروانی کے نام مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ ''غبارِ خاطر'' علمی اعتبار سے مولانا آزاد کی دیگر تصنیفات مثلاً ''ترجمان القرآن'' اور تذکرہ کے ہم پلہ نہیں ہے، لیکن ادبی اعتبار سے ''غبار خاطر'' صرف مولانا آزاد ہی کی نہیں، اردو کی عظیم تصنیف ہے۔ ''غبار خاطر'' کو جو مقبولیت حاصل ہوئی، وہ مولانا آزاد کی کسی دوسری تصنیف کو نہیں ملی۔

''غبار خاطر'' کا پہلا ایڈیشن حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی نے ۱۹۴۶ء میں شائع کیا تھا۔ ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ ایڈیشن ختم ہوگیا۔ مانگ پوری ملک میں تھی۔ دوسرے ہی ہفتے کتاب نایاب ہوگی۔ اگست میں اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا گیا، لیکن پھر بھی مانگ پوری نہ ہوئی۔ ''غبار خاطر'' کا تیسرہ ایڈیشن ایک خط کے اضافہ کے ساتھ مکتبہ ''لاہور نے ۱۹۴۷ء میں شائع کیا۔ تقسیم ملک کے بعد ہندوستان اور پاکستان سے غبار خاطر کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ ہندوستان میں غبارِ خاطر کا معیاری ایڈیشن ساہتیہ اکیڈیمی نئی دہلی نے ۱۹۲۷ء میں شائع کیا تھا۔ اس کے مرتب مالک رام تھے۔ یہ ایڈیشن اب نایاب ہے۔

غبار خاطر میں مولانا ابوالکلام نے جو اسلوب اختیار کیا ہے، وہ اردو کے تمام اسالیب نثر سے مختلف اور منفرد ہے، اس اسلوب کا موازنہ نہ تو رجب علی بیگ سرور

کے اسلوب سے کیا جا سکتا ہے، نہ میر امن کے اسلوب سے۔ مولانا کا اسلوب غالب کے اسلوب نثر سے بھی مختلف ہے اور سرسید اور حالی، ناصر علی، اور مہدی افادی کے اسالیب سے بھی ان کا انداز ہ جداگانہ ہے۔ مولانا کے غبار خاطر کے اسلوب کی مثال اردو ادب میں اور کہیں نہیں ملتی۔ اگر ملتی ہے تو صرف ان ہی کے بعض مضامین میں، جو الہلال اور البلاغ میں شائع ہوئے یا پھر ان کے خطوط کے دوسرے مجموعے ''کاروان خیال'' میں جو پہلی بار ۱۹۴۶ء کے آخر میں شائع ہوا۔

خلاصہ یہ کہ ''غبار خاطر'' مولانا ابوالکلام آزاد کی تمام تر ادبی تصنیفات میں سب سے زیادہ عظیم اور منفرد تصنیف ہے۔ یہ بھی واضح ہے کہ غبار خاطر کی انفرادیت اور تخلیقی حیثیت کی بنیاد اس کا اسلوب ہے لیکن اس کے ساتھ ہی مذکورہ بالا بحثوں میں عام طور پر یہ بات بھی سامنے آئی کہ غبار خاطر کا مطالعہ محض خطوط کے مجموعے کے طور پر نہیں کیا جانا چاہیے۔ یہ خطوط، خطوط کے علاوہ بھی بہت کچھ ہیں۔ خلیل الرحمان اعظمی کے الفاظ میں غبار خاطر ''محض خطوں کا مجموعہ سمجھ کر پڑھنا بھی زیادہ صحیح نہیں ہے خط یہاں محض ایک ''پردہ'' ہے۔ جس طرح مکالمات افلاطون پڑھتے وقت، ہم مکالمہ کے وہ معنی نہیں لیتے جو ڈرامے میں ملتے ہیں، اسی طرح ''غبار خاطر'' میں ہم مکتوب نگاری کے عام اسلوب یا معیار کو نظر انداز کر دینے پر مجبور ہیں۔

اس دور کے دوسرے مکتوب نگاروں میں امیر مینائی، مختصر القاب اور مقفیٰ و مسجع عبارت کیلئے مشہور ہیں جب کہ ریاض خیر آبادی برمحل و برجستہ الفاظ کیلئے جانے جاتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی بلند پایہ انشاء پرداز ہیں۔ دیگر تصانیف کی طرح خطوط میں بھی فصاحت و بلاغت اور روانی پائی جاتی ہے۔ ان کی زبان بے حد شگفتہ، شیریں اور پر کشش ہے جس کی تعریف اکبر الہ آبادی نے فراخ دلی سے کی ہیں۔ اسی روایت سے متاثر ہو کر قاضی عبدالغفار نے ''لیلیٰ کے خطوط'' لکھے، جنہیں ناول کے ذیل میں رکھا

جاتا ہے۔ پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴۔۱۹۱۸ء کے بعد ہندوستان کے افق پر کئی ممتاز ہستیاں ابھریں ان میں اقبال، محمد علی، شوکت علی، نیاز فتح پوری، سید سلیمان ندوی، عبدالماجد دریا آبادی، رشید احمد صدیقی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولوی عبدالحق، سجاد ظہیر، حسرت موہانی وغیرہ نے ادب اور سیاست دونوں میں عملاً حصہ لیا۔ یہ تمام بلند پایہ ادیب اور دانشور تھے۔ انھوں نے مختلف اوقات میں خط لکھے جو ادبی تاریخ میں قیمتی اثاثے کا درجہ رکھتے ہیں۔

خطوط غالب کی اہمیت ۔ ایک مطالعہ

اعجاز احمد
شعبہ اُردو جموں یونیورسٹی

مرزا اسداللہ خان غالبؔ وہ عظیم فنکار ہیں جنھوں نے شاعری اور نثر دونوں میدانوں میں اپنی امتیازی حیثیت کا لوہا منوایا ہے۔ غالبؔ سے قبل اور نثر پر فارسی کا گہرا اثر تھا اور یہی اثر خطوط میں بھی نمایاں تھا ۔ یہی وجہ تھی کہ طویل القاب اور تمہید میں سارا خط ختم کر دیا جاتا تھا اور مطلب کی بات پردے میں ادا کی جاتی تھی ۔ یہاں تک کہ نجی خطوط میں بھی یہ رنگ حاوی تھا۔ ابتدائی زمانے میں خطوط میں خیریت و عافیت معلوم کی جاتی تھی اور پھر استعاروں اور کنایوں کے پردے میں کچھ اظہارِ مطلب ہوتا تھا۔ گویا شاعری کی طرح رمز و کنایہ کا طرزِ بیان نثر میں بھی لاگو تھا اور پھر آخر میں عربی و فارسی کے دعائیہ جُملوں پر خطوط کا خاتمہ ہوتا تھا۔ ان تکلفات کے استعمال کی خاص وجہ غالباً یہ تھی کہ اس زمانے کے مزاج میں تکلف اور تصنع اذہان پر اس قدر غالب تھا کہ بغیر مقفیٰ و مسجع عبارت اور چست فقروں کی ادائیگی کے خط ہی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ علم و فضل کا سب سے بڑا ثبوت یہ ادبی مرصع کاری ہی تھی اور اِسے محمد شاہی روش کہتے تھے ۔ اس روش کو اُس وقت بہت پسند کیا جاتا تھا لیکن غالبؔ نے اس روش پر طنز کرتے ہوئے میر مہدی مجروح کو ایک خط میں لکھتے ہیں ۔

''تم کو خط نویسی کی محمد شاہی روشیں پسند ہیں کہ یہاں
خیریت ہے۔ وہاں کی خیریت مطلوب ہے۔ خط تمہارا بہت دن
کے بعد پہنچا جی خوش ہوا۔'' ۱؎

غالب کی پرورش پرداخت اور نشو ونما ایسے ماحول میں ہوئی تھی جہاں اُردو میں تصنیف وتالیف ایک معذرت سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی ۔ اپنی اہمیت اور عظمت کے لیے بار بار فارسی شاعری کو مثال بناتے ہیں ۔ ایسے میں نثر لکھتے وقت اُردو کی طرف آنا تو اور بھی ہتک ِ عزت کی بات تھی اسی لیے اُردو دیوان پر فارسی تفریظ اور سرسید کی اُردو کتاب پر بھی شعرِ فارسی سے کچھ غیر مناسب نہیں لیکن پھر ایک ایسا دور آیا جب انہیں محسوس ہوا کہ اُن کا ذہن علمی کام کے لیے تھک چکا ہے ۔جسم بڑھاپے کا شکار ہے ۔تخلیقی اعتبار سے اُن کے سوتے خشک ہو رہے ہیں ۔ایسے میں ایک سلسلے سے وہ اپنے عزیزوں ،شاگردوں اور قرابت داروں کو خطوط لکھنا شروع کرتے ہیں ۔اس وقت تک غالبؔ کی عمر پچاس کے قریب پہنچ چکی تھی ۔اُنہوں نے اپنیعمر کے آخری بیس برسوں میں یہ خطوط لکھے ہیں۔غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ خط ایامِ غدر اور اس کے بعد کے ہیں۔ غالب جس طرح اپنی اُردو شاعری کو اہمیت نہیں دیتے تھے اسی طرح اُردو میں لکھے ان رقعات کا بھی ان کی نگاہ میں کوئی رتبہ نہیں تھا۔شاگردوں نے انہیں جمع کر کے اشاعت کے لیے اجازت چاہی تو غالبؔ نے انہیں منع کر دیا۔ غالبؔ کا کہنا تھا کہ عبارت کو بنانے سنوارنے کا ان خطوط میں، میں نے کوئی کام کیا ہی نہیں ۔ایسی نثر بے رنگ آخر کیوں شائع ہو۔ غالب سمجھتے تھے کہ اُن کے ذہن میں کسی نئی بات کی طرف نہیں آتا ۔اس لیے بڑھاپے ،اضملال اور ٹھہرے ہوئے پانی کو کیوں عام کر کے رسوا سر بازار ہوا جائے ۔غالبؔ کی اس دلیل پر رنگ پہلے ان کی شاعری کی قدر دانی شروع ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اُن کے خطوط

کے مجموعے ''اردوئے معلیٰ'' اور ''عودِ ہندی'' میں شائع ہو گئے اور لوگوں میں مقبول عام ہو گئے۔

غالبؔ سے پہلے اور خطوط میں لمبے لمبے القابات لکھنے کا رواج عام تھا اور مکتوب الیہ کی جتنی تعریف ممکن تھی وہ سب شروع میں ہی کر دی جاتی تھی لیکن غالب نے لمبے لمبے القاب ترک کر کے مختصر القاب لکھنے کی بنیاد ڈالی اور بعض دفعہ بنا القاب و آداب خط لکھے ہیں اور سیدھے مطلب پر آ جاتے ہیں۔ ان خطوط میں جہاں انہوں نے تصویر کشی اور محاکات کا کمال دکھلایا ہے۔ وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ واقعات کو اس خوبی سے ادا کرتے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے تصویر سی پھر جاتی ہے اور کچھ دیر کے لیے قاری اپنے آپ کو اس بزم میں یا اس جگہ شریک پاتا ہے۔

غالبؔ عمر بھر تنگ دستی میں رہے لیکن ان کی طبیعت میں زندہ دلی، شگفتگی مزاج میں بلا کی شوخی و ظرافت ہمیشہ رہی وہ سب سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ اُن ہی تمام عناصر سے مل کر ان کے خطوط کی تشکیل میں معاون کردار ادا کیا۔ شوخی اور ظرافت کی بنیاد پر حالی نے ان کو ''حیوانِ ظریف'' کہا تھا۔ امراؤ سنگھ کی دوسری بیوی کا انتقال ہوا اور وہ تیسری شادی کا ارادہ کرنے لگے اس کے بارے میں مرزا شفتہ کو لکھتے ہیں۔

> ''امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں۔ ایک ہم ہیں کہ اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے نہ تو پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے۔ اس کو سمجھاؤ کہ میں تیرے بچوں کو پالوں گا تو کیوں بلا میں پھنستا ہے'' ۔۲۔

غالبؔ کے خطوط اپنے دور کی عکاسی میں معاون کردار ادا کرتے ہیں۔ دہلی کی

تباہی و بربادی ،ادبی محفلوں کا اجراء ،شعراء وادباء اور دیگر ساکنانِ دہلی کا دہلی کو خیر باد کہنا، دہلی کے کل حالات ،دوست واحباب ، بربادی ،امراء کی بدحالی غرض اُس وقت کے تمام حالات ومسائل کو غالبؔ نے اپنے خطوط میں خوبی سے پُر اثر نثر میں پیش کیا ہے۔نورالحسن نقوی رقمطراز ہیں۔

''غالب کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کے زمانے میں دہلی پر کیسی قیامت ٹوٹی تھی اور وہاں کے رہنے والوں پر کا ی گزری تھی۔چھوٹی چھوٹی باتیں بھی ان کی نظر سے نہیں بچیں ۔دکانوں کا منہدم ہونا ،کنوؤں کا بند کیا جانا ،سڑکوں کا چوڑا ہونا سبھی کچھ اُنہوں نے لکھ دیا ہے لیکن انگریزوں کے مظالم کی داستان پوری طرح بیان نہیں ہوتی۔دار وگیر کا خوف نہ ہوتا تو 1857 کی دہلی کا حال ان سے بہتر کوئی اور نہیں لکھ سکتا تھا'' ؎۳

غالبؔ کے خط وکتابت کا انداز اچھوتا اور منفرد ہے یہ رنگ ان سے پہلے اور بعد میں کسی اور سے پیدا نہ ہوسکا۔تقلید بہت لوگوں نے کی لیکن کوئی اس مقام تک نہ پہنچ سکا۔ غالبؔ کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے فاریسٹ کے مضبوط حصار کو توڑ کر ظاہری تصنع اور تکلفات کو برطرف رکھ کر روایات سے بغاوت کی اور اپنا ایک علیحدہ رنگ پیدا کیا جو حسین دلکش اور نرالا ہے۔

غالبؔ بعض مقامات پر مکتوب الیہ کو خطاب کرتے کرتے اس کو غائب فرض کرتے ہیں جو لوگ غالب کے اس انداز سے واقف نہیں وہ اس کو مکتوب الیہ کا غیر سمجھ لیتے ہیں۔مثلاً میر مہدی کو لکھتے ہیں۔

''میر مہدی جیتے رہو۔آفریں صد ہزار آفریں اُردو عبارت

لکھنے کا کیا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے کہ مجھ کو رشک آنے
لگا ہے۔ سنو دلی کی تمام مال ومتاع وزر و گوہر کی لوٹ پنجاب
احاطہ میں گئی ہے۔ یہ طرزِ عبارت خاص میری دولت تھی سو ایک
ظالم پانی پت انصاریوں کے محلے کا رہنے والا لوٹ کر لے گیا مگر
میں نے اس کو بحال کیا۔ اللہ برکت دے'' ۴؎

ظاہر ہے کہ اس عبارت میں ایک ظالم پانی پت سے مراد خود میر مہدی مجروح ہیں کیونکہ غدر کے بعد وہ پانی پت کے محلّہ مذکورہ میں کئی سال مقیم رہے تھے۔

غالب نے اپنے مکاتیب میں اپنے بارے میں اتنا کچھ لکھ دیا ہے اور اس انداز میں لکھا ہے کہ اگر اس مواد کو سلیقے سے ترتیب دیا جائے تو اس سے غالبؔ کی ایک آپ بیتی تیار ہو جاتی ہے۔ اس آپ بیتی میں جیتا جاگتا غالبؔ اپنے غموں اور خوشیوں، اپنی آرزوؤں اور خواہشوں، اپنی محرومیوں اور شکستوں اپنی احتیاجوں اور ضرورتوں، اپنی شوخیوں، اپنی بزلہ سنجیوں کے ساتھ زندگی سے ہر صورت نباہ کرتا ہوا ملے گا۔ غرض ان کی شخصیت کی کامل تصویر اپنی تمام تر جذبات وتفصیلات کے ساتھ ان کے خطوط میں ہی دیکھی جا سکتی ہے۔

نورالحسن نقوی رقمطراز ہیں۔

''مکاتیبِ غالب کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ مکتوب نگار کی
سوانح سے متعلق سب معتبر مواد اسی صنف میں ملتا ہے۔ مکتوب
نگاری سے غالبؔ کو خاص رغبت تھی۔ ابتدائی زندگی سے قطعِ نظر ان
کا سارا سارا دن اسی شغل میں بسر ہوتا تھا۔ ان کی زندگی کے جملہ
حالات اور سارے واقعات ان خطوں میں بیان ہوئے ہیں'' ۵؎

غالبؔ کے مخاطبین میں اپنے زمانے کے امرا، روسا، اہلیانِ وقت سے لے

کردوردراز تک پھیلے ہوئے ادیب وشاعر اوران کے شاگردسب شامل ہیں۔غالب بھلے ہی دہلی میں مقیم تھے لیکن اُن کے شاگرد پانی پت سے لاہور بہار و بنگال تک پھیلے ہوئے تھے بعض سے رسمی ، کچھ ایک لوگوں سے بے تکلفانہ اور چند اصحاب سے غرض مندانہ رشتہ بھی تھا۔تعلقات کی یہ وُسعت اور شخصیت کے پھیلاؤ نے غالبؔ کے خطوط کو عمومیت کی زنجیروں میں جکڑنے سے باز رکھا۔غالبؔ نے اپنے خطوں کو اطلاع نامہ اور اخبار بننے سے اس وجہ سے بچالیا کیونکہ ایک ہی ساتھ مخاطبین سے انہوں نے اپنی شخصیت کے الگ الگ کرداروں سے معاملے طے کرایا ہے۔

خطوطِ غالب میں غالب صرف معیشت کی سطح پر نہیں ٹوٹتے بلکہ شکست وریخت کے اور بھی کئی منظر نامے ہیں۔ایک سچائی بڑھاپے کے ساتھ تیزی سے گررہی غالبؔ کی صحت بھی تھی۔دُنیا میں شاید ہی کوئی ہو جس نے اپنے کم سننے اور بہرے پن کا غالب کی طرح اشتہار کیا ہو یا مذاق اُڑایا ہو۔غالبؔ کے درجنوں خطوط میں اس کا ذکر کیا ہے۔

مجموعی طور پر غالبؔ کے خطوط اور نثر میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں اور اُردو ادب کے عظیم نثر پاروں میں شمار ہوتے ہیں کیونکہ یہ خطوط فطری اور بامعنی ہیں۔انہوں نے آداب والقاب غائب کردیئے اور ڈرامائی عنصر شامل کردیا۔اُن کا اسلوب خود ساختہ ہے۔وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کو بیان کرنے کا سلیقہ جانتے تھے۔اُن کا مشاہدہ بہت تیز تھا۔منظر نگاری خاکہ نگاری میں بھی ملکہ حاصل تھا۔اُن کے خطوط کی سب سے بڑی خصوصیت لہجے کی شیرینی اور مزاج کی خوش بینی ،ظرافت اور مزاح تھا جس میں ہلکی ہلکی لہریں طنز کی بھی رواں ہیں جبکہ یہی خطوط ہیں جو اُردو ادب کے کئی اصناف کی ابتداء کا موجب بنے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ غالبؔ کو اگر شاعری میں ایک انفرادی حیثیت حاصل ہے تو نثر میں بھی وہ ایک الگ اور منفرد نام رکھتے ہیں۔

حواشی وحوالے

۱۔ خطوطِ غالب مرتب غلام رسومیر۔غلام علی اینڈ سنز حیدرآباد۔1951

۲۔ خطوطِ غالب مرتب غلام رسومیر۔غلام علی اینڈ سنز حیدرآباد۔1951

۳۔ غالبؔ شاعر اور مکتوب نگار۔نورالحسن نقوی ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ صفحہ نمبر 178

۴۔ انتخاب خطوطِ غالب مرتب خلیق انجم انجمن ترقی اُردو (ہندی) نئی دہلی صفحہ نمبر 123۔

۵۔ غالبؔ ،شاعر اور مکتوب نگار۔نورالحسن نقوی ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ۔صفحہ نمبر 172-173

اُردو خطوط نگاری ماضی، مستقبل اور حال

مشتاق احمد سوہل
ریسرچ اسکالر (اردو)
برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال (ایم۔پی)

اُردو ادب میں مکتوب نگاری کا آغاز فارسی ادب کی بدولت وجود میں آیا۔ اُردو ادب کے دیگر اصناف کی طرح مکتوب نگاری کے اولین نمونے سرزمین دکن میں ملتے ہے۔مگر یہاں پر بیان کرنا مشکل ہے کہ اُردو ادب میں پہلا خط کب اور کس نے قلم بند کیا ہے اس سلسلے میں بہت سارے ادیبوں نے اپنے اپنے نظریات تحریر کیے ہیں۔ اس ضمن میں پروفیسر ثُریا حسین نے خطوط کے مجموعے بہ عنوان ہندوستانی کی مبادیات (Appendiceause rudaments de la langue hinudstani) میں مشمولا اردو کے چند نادر خطوط کی جانب ہماری توجہ مبذول کرائی ہے۔ مذکورہ خطوط کے مجموعے کی اِشاعت ۱۸۳۳ء میں ہوئی۔اس کتاب میں گارسین داتاسی نے اُردو کے ۱۸ اٹھارہ خطوط شامل کیے ہیں اس سلسلے میں پروفیسر ثُریا حسین رقم طراز ہے۔

> ’’اردو میں خط لکھتے تھے۔ اِن کا اسٹائیل اس فارسی آمیز طرز قدیم سے مختلف تھا جو اُردو مکاتیب کے اولین مجموعوں ’انشاے فرو افروز‘ ’مکتوباتِ احمدی و محمدی‘ اور رقعاتِ عنایت علی،

شامل ہے''

(بہ حوالہ۔اُردو میں ادبی خط نگاری کی روایت اور غالب۔
مصنف ڈاکٹر بیگم نیلوفر احمد۔ص،65ماڈرن پبلشنگ ہاؤس نئ
دہلی۔)

پروفیسر ثُریا حسین کے مطابق ان خطوط یعنی جوگارسین داتاسی نے مزکورہ مجموعے میں شامل کیئے ہے اور جنکی تعداد ۱۸ ہے ان کو تاریخی اعتبار سے اولیت کا شرف حاصل ہے کیونکہ خطوط اُن خطوط سے قبل قلم بند کیے گئے تھے جو اُن سے پہلے مجموعے میں شامل کیے گئے۔

اس ضمن میں پروفیسر عنوان چستی نے لکھا ہے کہ اُردو کا پہلا خط 6 دسمبر 1822ء میں تحریر کیا گیا تھا وہ لکھتے ہیں۔

اُردو کا پہلا دستیاب شدہ خط 6 دسمبر 1822ء کا ہے جس کے کاتب والا جاہ بہادر نواب کرناٹک کے بیٹے حسام الملک بہادر اُنھوں نے یہ خط اپنی بڑی بھابی نواب بیگم صاحبہ کو لکھا تھا ''(مکاتیب احسن ص 37)

اس خط کا متن بذیل ہے۔

''اگرچہ میرے تین، عادت ہے کہ ہر ایک نصیحت کی بات جو اپنے باپ سے سنتا ہوں، ہر ایک اپنے بھانجے، اور بچے جو میرے سات نزدیک کی قرابت رکھتے ہیں۔ ہر ایک موقع پر انوں سے ظاہر کرنا۔ چناچہ تم کو بھی یاد ہوگا کہ ایک روز کوئی سالگرہ کی رسم میں نوب عظیم الدولہ بہادر مرحوم ومغفور میرے تیئں اپنے ہمراہ زمانے میں لے آئے۔ بعد ادائے رسم کے

نواب اعظم جاہ بہادر تسلیم کرنے کے پیچھے ہٹ کر تسلیم کرنے لگے۔ تب میں نے کہ تمہارے پڑہ دادا کو میں نے تسلیم پیچھے ہٹ کر کیا۔ تب مجھے فرمائے کہ ہماری صحبت میں رہ کر اتنا بڑا گدھ ہوا ہے۔ ابھی تک نہیں معلوم کہ پیچھے ہٹ کر تسلیم کرنا عیب ہے۔"

(بہ حوالہ سہ ماہی روشن۔ بدایوں خاص نمبر (1984ء ص 213)

اسی سلسلے کی کڑی میں تاریخ کے اوراق میں اُردو کے قدیم ترین خطوط نظم کی ہیت میں بھی دیکھنے کو ملتے ہیں جیسے شیر محمد خان ایمان کے منظوم خط کے چند اشعار ملا خطہ ہے۔

موزوں تمہارا پہنچا ہے نامہ
مژ گانِ اُہو جس کا تھا خامہ
مضمون تازہ اس میں تھے مرقوم
وقت سے معنی ہوتے تھے معلوم
تحسیں تو سو بار نکلتے زبان سے
خوش رکھے اللہ امن و اماں سے
تھی شریں پہ ترقیم نادر
ٹک ایک شکوہ ہوتا تھا سادر
یعنی کہ اپنی خط و کتابت
خاطر پہ لائے سایہ کدورت

(بہ حوالہ۔ غیر افسانوی ادب۔ سلیبس برائے ایم۔اے

اردو سال دویم مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد۔ص نمبر214)

ان اشعار سے اس بات کا علم ہوجاتا ہے کہ ایمان نے اپنا مذکورہ منظوم خط کسی نثری خط کے جواب اپنے انتقال سے قبل(1806) میں تحریر کیا تھا۔

اس موضوع کے بارے میں سب سے قدیم خطوط 1875ء(1711) سے قبل دوآصف جاہی منصب داروں مرزا یار علی بیگ اور میر ابراہیم جیو کے دریافت ہوئے ہے یہ خطوط ادارہ ادبیات اردو پنجہ گوٹا حیدرآباد کی ایک قلمی بیاض میں محفوظ ہے (بیاض نمبر1130 تزکرہ مکتوتات جلد5 ص۔289)

ذیل میں نمونے کے طور پر ان خطوط کے چند اشعار شامل ہے۔

مرزا یار علی بیگ کا خط میر ابراہیم جیو کے نام

جاصبا کر بندگی میری ہر ایک عنوان سے
صاحب مشفق مہربان خان والا شان سے
ہے تمہارے مخلوں میں کمتر یں یار علی
یاد سامی ہے سدا جس کوں تمہاری از دلی
دم بدم ہر لخط لمحہ تمہاری یاد ہے
یہ دل محزوں تمہاری یاد میں نت شاد ہے

جواب ابراہیم خان جیو بنام مرزا یار علی بیگ

رکھو ا یز دتمہیں امن و امان میں
کرم اپنے سیتی دونو جہان میں
جو مرزا یار علی تم کو اسم ہے
یقین ہے تم پر سرداری ختم ہے

کہوں کیا وصف میں تمنا کے اشعار
کہا حق نے ازل سے تم کو سردار

مذکورہ بیانات کی روشنی میں راقم الحروف کے مطابق اردو کا پہلا نثری ہیئت میں تحریر کردہ خط 6 دسمبر 1822ء کا ہے اور نظم کی ہیئت میں اردو ادب کے قدیم ترین خطوط 1175ء (1761) سے قبل وجود میں آئے۔ یہاں اس بات کا ذکر کرنا میں مناسب سمجھتا ہو کہ مستقبل میں تحقیق کے حوالے سے کئی اور چیزیں سامنے آسکتی ہے کہ اردو کا پہلا کب اور کہا تحریر ہوا ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ تحقیق کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا اور ہر تحقیق صرف آخر نہیں ہوتی۔

اس صنف کے اولین دور میں غالب سے قبل رجب علی بیگ سرور اور غلام غوث بے خبر نے اس کی آبیاری کی۔ سرور کے مجموعے خطوط ''انشائے سرور'' کے نام مرزا احمد علی نے مرتب کر کے 1886ء میں قول کشور پریس لکھنوٴ سے شایع کیا تھا۔ اُن کے خطوط نگاری کے متعلق ڈاکٹر بیگ نیلوفر احمد تصنیف ''اردو میں ادبی خط نگاری کی روایت اور غالب'' میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتی ہے۔

اُن کے خطوط اس دور کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔
لکھنو کی معاشرتی زندگی کی جھلک تہذیبی اور تمدنی اقدار،
انسانی جزبوں کا رنگ اور تخیل کی الطافت ان میں نمایاں
نظر آتی ہے۔ اُن کے بعض خط الجھنوں اور پریشانیوں
کی دستاویز ہیں مگر قافیہ بندی اور لطیف بیان سے خالی نہیں''

(بہ حوالہ اردو میں ادبی خط نگاری کی روایت اور غالب ڈاکٹر بیگم نیلوفر احمد (ص74-73.) ناشر ماڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی (سن اشاعت 2007)

خواجہ غلام غوث خان بے خبر کے دو مجموعے خطوط ایک ''فگانِ بے خبر'' دوسرا''

انشائے بےخبر'' ہیں اُن میں سے انشائے بےخبر کو مرتضیٰ حسین بلگرامی نے مرتب کر کے 1960ء میں علی گڑھ سے منظر عام پر لایا ہے اظہر علی فاروقی ان کے بارے میں یوں فرماتے ہیں کہ

''ان کا اسلوب مرزا رجب علی بیگ سرور اور مرزا غالب کے پیرایوں کی ایک ایسی درمیانی کڑی جو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہو جاتی ہے۔

(سب رس غالب نمبر حیدر آباد 1969ء ص۔208)

خط نگاری کی روایت کو آگے بڑھانے میں جن مکتوب نگاروں اہم کردار ادا کیا ہے۔اُن میں مرزا غالب، مولوی عبدالحق، مولانا ابوالکلام آزاد مہدی آفادی، امیر مینائی، منٹوں پطرس بخاری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہے۔غالب نے اپنی خطوط نگاری کے پرانے انداز کے القاب وآداب کا مکمل طور سے صفایا کر دیا۔اور اس کی جگہ اُنھوں نے عجیب وغریب چیزیں سامنے لائی ہے جسے خط کا آغاز کبھی میاں کبھی برخردار کبھی بھائی صاحب، کبھی مہاراج اور کبھی کسی اور ہم کلامی کے القاب سے شروع کرتے ہیں اور ابتدا سے ہی اپنی بات رکھنے میں کامیاب نظر آتے ہے۔

اس صنف میں غالب نے جو مخصوص اسلوب بیان اپنایا ہے اور مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے اس کی مکمل رہنمائی نہ تو اُن کے معاصرین کر سکے اور نہ اُن کے بعد آنے والے اس صنف کے کارواں میں سے کوئی کر سکا۔

اُن کی خطوط نگاری کے متعلق پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے۔'' خاکم بہ دہن اگر دیوان غالب نہ ہوتا اور صرف خطوطِ غالب ہوتے تو بھی غالب غالب ہی ہوتے''

(بہ حوالہ۔غالب شاعر اور مکتوب نگار۔مصنف۔پروفیسر نو

رالحسن نقوی)
نیشنل ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ۔سنِ اشاعت 2006ءص۔44-143)
غالب کے ساتھ ساتھ سرسید احمد خان نے بھی خطوط نگاری کے میدان میں ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے اُن کے خطوط کا مجموعے''مکاتیب سرسید'' کے نام سے شایع ہو چکا ہے اُنھوں نے اپنے خطوط میں سلیس اور عام بول چال کی زبان کا استعمال کیا زیادہ تر اُن کے خطوط دفتری نوعیت کے ہے اُن کے خطوط میں اپنی قوم کی فلاح بہبود درمندی اور خلوص کی جھلکیاں نظر آتی ہے اُن کے خطوط کے متعلق ڈاکٹر سید عبداللہ فرماتے ہیں

> ''سرسید احمد خان کے خطوط اگرچہ ان کے مقالات کے طرح گراں وزن اور متین ہیں مگر بے تکلفی کا ایک خاص انداز ان کے خطوط میں پایا جاتا ہے ان خطوط کی فضا ان کی باقی تحریروں کے مقابلے میں دلچسپ اور مانوس بھی ہے اورظرفت وزندہ دلی بھی اُن خطوط میں زیادہ حد تک پائی جاتی ہے۔(بہ حوالہ۔اُردو میں ادبی خطہ نگاری کی روایت اور غالب۔مصنف ڈاکٹر نیلوفر بیگم احمد ص نمبر۸۰)(ناشر۔ماڈرن پبلیشنگ ہاؤس نئ دہلی)۔

حالی نے بھی اُردو خطوط نگاری میں ایک اہم مقام حاصل کیا ہے حالی کے خطوط میں سرسید احمد خان کی سادگی قطیت دیکھنے کو ملتے ہے اُنھوں نے اپنے خطوط میں حقیقی معنوں میں سادگی روانی اور ساختگی کو اپنایا ہے ساتھ ہی اُن کے خطوط اور اُن کے مزاج کی سادگی وہمدردی
اور خلوص کی آئینہ دار بھی ہے وہ اپنے مکاتیب میں غیرضروری باتوں سے گریز

کرتے ہیں اور مختصر القاب و آداب کے بعد اپنے مطلب کی بات یا جواب طلب اُمور کو اُجاگر کرتے ہے۔ اسی مصنف کے ایک اور نامور مکتوب نگار شبلی نعمانی ہے جن کے دو مکاتیب ''مکلات شبلی''اور ''خطوط شبلی'' کے عنوان سے منظر عام پر آ چکے ہے اُن کے خطوط میں جا بجا عالمانہ سنجیدگی لطیف پیرائیے میں نظر آتے ہے ایجاز جو اُن کی عام تحریروں میں ملتے ہے وہ اُن کے خطوط میں بھی نظر آتے ہیں۔ اُن کا اندازِ بیان شگفتہ اور مانوس ہے اور عموماً اُن کے خطوط مختصر ہے۔

مہدی آفاری کی مقبولیت ادبی دُنیا میں اپنی مثال آپ رکھتی ہے

مہدی آفادی کی مقبولیت ادبی دُنیا میں اُن کے دو تصانیت'' آفادات مہدی'' مکاتیب مہدی'' کی وجہ سے یہ دونوں تصانیف اُن کے انتقال کے بعد ادبی دُنیا میں آئی اول الزکران کے مظامین کا مجوعہ ہے اور آخرالزکران کے خطوط پر مشتمل ہے ان کے زیادہ خطوط ادبی نوعیت پر مشتمل ہے وہ اپنے خطوط میں مختلف انداز سے شوخی و شگفتگی کو قائم و دائیم رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے نظر آتے ہے۔ ساتھ ہی اُنھوں نے خطوط میں رمز ایما اور تلمیہ کا بھی استعمال کیا ہے سید سلمان ندوی نے ان کے متعلق یوں کہا ہے، مہدی مرحوم کا قلم حد سے زیادہ چلبلا تھا نوک قلم پر جو بات آ جاتی ہے وہ 'نا گفتنی' بھی ہوتی تو 'گفتنی' ہو کر نکل جاتی اور پھر اس طرح نکلتی کہ شوق صدقے ہوتی اور متانت مسکرا کر آنکھیں نیچی کر لیتی''۔

(بہ حوالہ۔ اردو میں ادبی خط نگاری کی روایت اور غالب۔ مصنف۔ ڈاکٹر بیگم نیلو فر احمد ناشر۔ ماڈرن پبلشنگ ہاؤس۔ نئی دہلی ص۔ 86)

مولانا ابو کلام آزاد نے صنف کو آبیاری کرنے میں ایک اہم کردار نبھایا ہے اُن کے خطوط کے کئی مجموعے شایع ہو چکے ہے جس میں'' کاروان خیال'' '' مکاتیب ابوالکلام'' ''نقشِ آزاد'' '' تبرکاتِ آزاد''، ''غبارِ خاطر'' غیرہ قابل ذکر ہے غبارِ خاطر

نامی خطوط کا مجموعہ اُن کی زندگی کا آخری مجموعہ ہے اس مجموعہ، کے خطوط کے حوالے سے ہمیں ابوالکلام آزاد کی زندگی کے مختلف حادثات وواقعات اُن کا اندازِ فکر تجربات و احساسات جزبات وغیرہ کی معلومات ہوتی ہے اس مجموعہ کے بارے میں عبدالقوی دسنوی نے اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے۔

''مولانا کے ان خطوط میں زبان کی سالامت خیال کی پاکیز گی، انداز کی ندرت اور بے ساختگی کی جلوہ گری کے ساتھ ساتھ مکتوب الیہ سے بڑی قربت اور اپنائیت پائی جاتی ہے''
(بحوالہ۔غبارِ خاطر مصنف۔مولانا ابوالکلام آزاد ناشر ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ص نمبر۔19 سن اشاعت۔2011)۔

خطوط نگاری کے میدان میں علامہ اقبال کا نام بھی کافی اہمیت کا حامل ہے اقبال اُردو ادب کا وہ درخشندہ ستارہ ہے جو رہتی دُنیا تک قائم رہے گا۔علامہ اقبال نے کم و بیش ایک ہزار تین سو 1300 خطوط لکھے ہے اوران کے مجموعہ ہائے مکاتیب کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے اردو زبان کے علاوہ انگریزی اور جرمن زبان میں بھی اُنھوں نے خطوط تخلیق کئے ہے اُن کے خطوط اُن کی زندگی اوران کے خیالات کو بہتر طور پر سمجھنے کا نہایت ہی ایک اہم وصیلہ ہے اُنھوں نے اپنے خطوط میں مختلف معاشی، سماجی، تاریخی، علمی اور فلسفانہ مسائیل پر خوب بحث کی ہے وہ کشمیر سے گہری دلچسپی رکھتے تھے اور اپنے کئی، خطوط یہاں کے ادیبوں دیگر کئی اشخاص کے نام تحریر کئے ہے جیسے منشی محمد دین فوق، منشی سراج دین، خواجہ عبدالصمد ککرُو مولانا انور شاہ لولابی، غلام احمد مہجور وغیرہ شخصیات قابل ذکر ہے۔

منشی محمد دین فوق کو علامہ اقبال نے 8 جون 1917ء کو ایک خط یوں لکھا۔۔۔۔۔
کشمیر اور اہل کشمیر پر مختلف کتابیں لکھ کر آپ نے مسلمانوں پر اوران کے لڑ چیر احسان

کیا ہے۔۔۔۔۔ رسالہ رہنمائے کشمیر جو حال میں آپ کے قلم سے نکلا ہے نہایت مفید اور دلچسپ ہے ہے طرزِ بیان بھی دلکش ہے اور مجھے یقین ہے کہ رسالہ عام لوگوں کیلئے نہایت مفید ہوگا۔ افسوس ہے کہ میں نے آج تک کشمیر کی سیر نہیں کی لیکن اس سال ممکن ہے کہ آپ کا رسالہ مجھے بھی اُدھر کھینچے گا''

(بہ حوالہ۔ ماھنامہ رسالہ حکیم لامت ص۔۴۰)

سنِ اشاعت اگست 2013

مذکورہ خطوط نگاروں کے بعد اس مصنف کو آگے بڑھانے میں پروفیسر گیان چند جین اور شاعر انقلاب وشباب جوش ملیح آبادی وغیرہ کے خطوط میں زبان وادب کے مختلف پہلوں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ دورِ جدید میں میں نت نئے سائینسی ایجادات و انقلابات نے اس صنفِ ادب یعنی خطوط نگاری کی ریت کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا ہے ابتداء میں ٹیلی فون اور ٹیلی گرام کی ایجاد نے اس صنف پر اپنے کوئی خاص اثرات مرتب نہیں کیئے مگر آج کل سیاسی ترقی نے ہماری تہذیب وتمدن ثقافت اور خیالات وغیرہ کو غیر معمولی طور پر کافی متاثر کیا ہے تغیر وتبدل کی رفتار میں سمندری طوفان کی تیزی آ گہی اور ہر نیا تجربہ وایجاد پلک جھپکتے ہی ماضی کا حصہ شمار ہونے لگا مختلف علوم وفنون کے پہلو بہ پہلو ترسیل وابلاغ کے بھی نئے نئے سہولیت اور آرام دہ رسائیل وذرایع منظر عام پر آنے لگے۔ جیسے کمپیوٹر، انٹرنیٹ، فیس بک، موبائیل فون وغریہ نے اس میدان میں تہلکہ مچا دیا اور دن بہ دن اس میں اضافہ ہوتا جارہا ہے جسکی وجہ سے خطوط نگاری کی روایت کو نقصان اُٹھانا پڑا۔

راقم الحروف کی کم ظرفی کے مطابق موجودہ سائینس وٹیکنالوجی کے اس دور میں یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اُردو ادب کی اس صنف کا وجود آنے والے کل میں باقی رہنا بہت ہی زیادہ مشکل ہے۔

مکتوب نگاری کی اہمیت وافادیت۔ایک مطالعہ

محمد مقیم انصاری
جی ڈی سی بلاور

زمانہ قدیم میں جب لوگ داستانیں سنتے اورسناتے ،اپنی بہادری کے کارنامے عوام یا دوسرے گروہ کے لوگوں کے سامنے بیان کرتے ، قصے کہانیاں ایک دوسرے کوسناتے توان کا جذباتی رویہ مبالغہ آمیز باتیں کا رویہ بار بار کچھ نیا کرنے کی طرف رجوع کرواتا تھاجس میں زبان وبیان اوراس کے اثرات کی طرف زیادہ دھیان دینے کے بجائے عام پہلوؤں کی طرف دھیان دیاجاتا تھا۔جس کااثر زیادہ دیرپانہ ہوتا تھا۔کیونکہ جوبات زبانی کہی جانے اس میں فکر کاعنصر بہت کم ہوتاہے یعہ وہ بات زیادہ سوچی سمجھی نہیں جاتی۔جبکہ لکھی گئی بات میں زیادہ اثرہوتاہے کیونکہ اس بات میں تحریرکیاموادانسانی ذہین کوفوراًاُس خیال کی طرف مرکوز کردیتاہے۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ لکھی جانے والی زیادہ اثر رکھتی ہے کیونکہ تحریرکرنے والا اُس وقت اچھی طرح سوچ لیتاہے کہ بات لکھنے کے لائق ہے یانہیں۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جوبات لکھی جاتی ہے وہ زیادہ صاف اور جامع ہوتی ہے کیونکہ لکھتے وقت انسان کاذہن زیادہ یکسوئی کےساتھ کام کرتاہے۔اس کےعلاوہ وہ چندذہنی تجربوں سے بھی گزرتاہے جواُس کے ذہن میں زیادہ گہری اورفکری عنصرکی نشاندہی کرتے ہیں جوانسان کے ذہنی عنصرکوزیادہ حساس بنادیتاہے۔یہی بات مکتوب نگاری پربھی صادق

آتی ہے کیونکہ موجودہ عہد کی کم فرصتی اور انسانی زندگی کی دیگر سہولیات کی وجہ سے جو منفی اثرات خط نویسی کی روایت پر پڑ رہے ہیں اس بات کا اطلاق ہمیں آئے دن دیکھنے کو ضرور مل جاتا ہے۔ اس کے علاوہ سب سے زیادہ منفی اثرات اگر دیکھنے کو ملتے ہیں تو وہ ذاتی خط نویسی ہے جبکہ ٹیلی فون پر کی گئی بات کے مقابلے میں اگر بات کو لکھ کر کہا جائے تو اس تحریر میں خیال زیادہ گہرا اور رچا ہوا ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود اب انسانی زندگی اس قدر مصروفیات میں ڈھل چکی ہے کہ خط لکھنے کے بجائے وہ موبائل فون اور دیگر بہتر ذرائع کی طرف رجوع کر رہا ہے جس کے اثرات ہمیں آئے دیکھنے کو مل رہے ہیں۔

ابتداء سے لے کر آج تک دُنیا کی نہ جانے کتنی زبانوں میں خطوط کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں بلکہ آج بھی خط کے مجموعوں کے علاوہ اخبارات اور رسائل وجرائد میں کتنے خط شائع ہوتے رہتے ہیں جو ہمارے نظر سے کسی نہ کسی دن ان اخبارات میں خط دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ ان خطوط سے تعلیمی بیداری اور دیگر درپیش مسائل سے بھی آگہی ہو جاتی ہے۔ یہ خط چاہے Letter pad کی شکل میں تحریر کئے جائیں یا کسی دوسرے طریقے سے لکھ کر ایک لفافے میں ڈال کر بھیج دیئے جائیں۔ اس بات سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ مکتوب نگاری کی اہمیت وافادیت اور اس کی مقبولیت آج کے دور سے بھی دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ لکھنے کا انداز بدل گیا ہے۔

انسانی زندگی سے یہ مکتوبات بہت زیادہ متعلق رکھتے ہیں۔ مکتوباتی ادب تاریخ نثر کا ایک اہم جُز ہے۔ اس کا دائرہ کار نثر سے ملا اور الگ بھی۔ ادب کی وہ تحریر جس سے ہم کسی بھی شخص کی شخصیت کے تمام خدوخال کا اندازہ لگا سکیں۔ وہ تحریر ہمیشہ دلچسپی کا باعث رہتی ہے۔ نجی اور ذاتی لکھے گئے خطوط سے ہم مصنف کی زندگی میں رونما ہونے والے حالات وواقعات کا بھرپور اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اس کے احساسات

وجذبات، اعمال واشغال وغیرہ کا بھی پتہ لگا سکتے ہیں۔اس لیے اچھے خطوط اوراچھی خودنوشت اُسی کو کہا جاتا ہے جس میں شخصیتکے تمام خدوخال زندہ نظر آئیں تا کہ اس کی پوری عکاسی ہو سکے۔ڈاکٹر شجاعت علی اس کی امیت وافادیت کے متعلق یوں رقمطراز ہیں۔

''فنکار کی شخصیت جس طرح ان کے خطوط میں بے نقاب ہو جاتی ہے کسی اور صنف ادب میں ممکن نہیں۔خطوط اس کی شخصیت کا آئینہ بھی ہوتے ہیں اور ایکسرے بھی ۔ بلکہ جن باتوں کو آئینہ اور ایکسرے پیش کرنے سے قاصر رہتے ہیں خطوط ان کو بھی ظاہر کر دیتے ہیں۔آئینہ زیادہ سے زیادہ ظاہری شکل وصورت کو پیش کر دیتا ہے جبکہ ایکسرے اندرونی ساخت کو۔لیکن جذبات واحساسات شمائل وخصائل اور اس قسم کی دوسری خصوصیات کی عکاسی ان کے بس کی بات نہیں۔خطوط میں انسان کی ظاہری اور باطنی تمام باتوں کا عکس آ جاتا ہے۔اس لیے خطوط کو ادب الحالیہ میں سب سے بہتر تسلیم کیا جاتا ہے''

انہی باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے عندلیب شادانی اپنے خیالات یوں ظاہر کرتے ہیں۔

> ''کسی شخص کا عکس دیکھنا ہو تو ان کے خطوط کے آئینے میں دیکھنا چاہیئے بلکہ آئینے کے بجائے انہیں 'ایکسرے' سے تشبیہ دینا صحیح ہے اور سچ پوچھیے تو یہ تشبیہ بھی ناقص ہے۔اس میں شک نہیں کہ ''ایکسرے'' کی مدد سے ان چیزوں کا بھی فوٹو لیا جا سکتا ہے جو جسم کے صدوق میں بند ہوئی ہیں اور جنھیں ہم اس صندوق کو کھولے بغیر نہیں دیکھ سکتے مگر یہ پرائیویٹ خطوں کے ایکسرے تو لکھنے والے کے ان خیالات جذبات اور احساسات

کی بھی تصویر کھینچ دیتے ہیں جو اس کی تصنیفوں میں بھی کہیں نہیں
ملتے۔یہاں تکلف کے سارے حجاب اُلٹ جاتے ہیں
اور حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے''۔

تحریری اور تقریری انداز کے تقریروں کے بجائے خط زیادہ اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ خطوں میں اس کی ذاتی زندگی میں رونما ہونے والے حالات وواقعات کی نشاندہی بھرپور طریقے سے ہو جاتی ہے۔خطوط اصل اخلاق کا آئینہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک قابل غور خودنوشتہ سوانح عمری کا کام بھی دیتے ہیں۔خطوں کے متعلق نیر مسعود لکھتے ہیں۔

''وہ خطوط جس کی تحریر کو زمانہ دراز گزر چکا ہو تاریخی لحاظ
سے بھی بہت اہم ہو جاتے ہیں۔کیونکہ ان کی مدد سے ہم زمانہ
کے مختلف حالات سے واقف ہو سکتے ہیں۔اگر یہ تاریخی
تصنیفات اور ایک حد تک ادبی تخلیقات سے بھی فائدہ حاصل
ہوتا ہے لیکن ان سے فراہم ہونے والی معلومات میں وہ بے
ساختگی نہیں ہوتی جو خطوط کا حصہ ہیں''۔

خودنوشت سوانح عمری ہو یا ڈائری ہو یا خطوط نویسی ہو ہم مصنف کی نہ صرف روزمرہ زندگی کے خدوخال کو جان سکتے ہیں بلکہ اُس عہد میں رونما ہونے والے حالات وواقعات کا بھی اندازہ لگا سکتے ہیں۔کسی بھی انسان کی گفتگو سے ہم پتہ لگا سکتے ہیں کہ وہ کس تہذیب وتمدن اور علاقے سے تعلق رکھتا ہے لیکن اس کی تہذیب وتمدن کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ اس کو خط نگاری کا سلیقہ کہاں تک آتا ہے۔اسلامی تہذیب نے اپنے دور میں مکاتبت ومراسلت کو اتنی زیادہ اہمیت دی کہ جو شخص خطوط نگاری کے آداب ورسوم سے واقف ہوتا وہ سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز کیا جاتا تھا۔

کیونکہ اس کو شائستہ ترین شخص سمجھا جاتا تھا۔ڈاکٹر سید عبداللہ اپنی تحریروں میں خطوط نویسی کے متعلق یوں رقمطراز ہیں۔

''یہ انسان کی بنیادی ضرورتوں میں سے ہے ۔دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا آدمی ہوگا جسے کبھی خط لکھنے یالکھوانے کی ضرورت پیش نہ آئی ہو ۔خط سے بڑھ کرکوئی ادارہ جمہوری یابنیادی طور پر اجتماعی نہیں ہوسکتا۔اس دارے کی وسعتوں کا یہ عالم ہے کہ یہ ایک عام کاروباری پیغامی تحریر سے لے کرادب عالیہ کے رتبے تک پہنچ سکتا ہے''۔

خطوں میں لکھی گئی چھوٹی چھوٹی باتیں، جذبات کا اظہار،احساسات کی گہرائی اور خلوص کا مظہر ہوتی ہیں۔جومکتوب نگاراورمکتوب الیہ کے آپسی تعلقات کی غمازی کرتی ہیں۔خطوں کو پڑھ کر ہم اس کے دِل میں جھانک سکتے ہیں اوراس کی زندگی میں حصہ لے کرمسرت حاصل کرسکتے ہیں۔جہاں تک ذاتی اورنجی خطوط کا تعلق ہے تواس میں کوئی شک نہیں کہ ہم ذاتی خطوط میں عموماً لکھنے والے کی شخصیت اوراس کے ذاتی عقائد وخیالات کوسمجھنے میں ہر چیز سے زیادہ مددگار ہوتے ہیں۔نجی خطوط کی حیثیت ''آپ بیتی'' کی سی ہوتی ہے۔جس کی وجہ سے ہر شخص ان خطوط کودلچسپی کے ساتھ پڑھتا ہے ۔اس کے علاوہ ان ذاتی خطوط کو پڑھنے والا شخص لکھنے والے کے زیادہ قریب پہنچ جاتا ہے۔ایک مورخ کے خطوط اتنے سودمند ہوتے ہیں کہ ان سے تاریخ کی ترتیب وتدوین میں بھی بہت مدد ملتی ہے۔خطوط کبھی رپورتاژ کی ذمہ داریوں کوسنبھالتے ہیں تو کبھی روزنامچے کی شکل میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔خطوط کے ذریعے حادثات وواقعات سے بھی آگاہی ہوجاتی ہے۔اس کے علاوہ خطوط کہانی کا سالطف بھی دیتے ہیں۔خطوط کتنے ہی ذاتی کیوں نہ ہوں اورموضوع کے

اعتبار سے کتنے ہی محدود کیوں نہ ہوں ایک اچھا مکتوب نگار کا قلم مکاتیب میں رنگینی پیدا کر ہی دیتا ہے۔کامیاب خطوط میں ہر عہد اور کرۂ ارض کے تمام لوگوں کی تشفی کا سامان ان میں مل جاتا ہے۔1857ء کے حالات کو اگر مدنظر رکھا جائے تو عہدِ غالبؔ کے خطوط کی ورق گردانی کرنی پڑے گی جس میں اُس عہد کی پوری عکاسی ہو جاتی ہے۔غالبؔ اپنا مجلس سینہ انسان تھے اور واقعۂ انقلاب نے ان کی مجلسی زندگی کو درہم برہم کر دیا تھا۔انگریزوں نے جس طرح مسلمان قوم کو خاص طور پر نشانہ بنایا اس کا ذکر بھی غالبؔ کے خطوط میں دیکھنے کو ملتا ہے۔غالبؔ کے خطوط میں سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

> ''میں جس شہر میں ہوں اس کا نام دِلّی ہے۔اور اس محلے کا نام بلی ماروں کا محلّہ ہے لیکن ایک دوست اس جَم کے دوستوں میں نہیں پایا جاتا۔واللہ ڈھونڈنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔کیا امیر کیا غریب کیا اہلِ صرفہ ، اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔مسلمان آدمی شہر میں سڑک پر بن ٹکٹ پھر نہیں سکتا نا چار تم کو خط نہ بھیج سکا''۔

اس کے علاوہ مصنفوں کے خطوط بھی کافی اہمیت وافادیت کے حامل ہیں۔اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ خطوط نگاری مہذب سماج کا ایک اہم فن ہے اس فن سے نہ صرف اُنس ومحبت کا رشتہ برقرار رہتا ہے بلکہ دونوں دور رہ کر بھی قریب رہتے ہیں۔

مکتوب نگاری کی تاریخ

رافیہ اختر
شعبہ اُردو جموں یونیورسٹی

دو اشخاص کے درمیان باہمی گفتگو ایک سماجی ضرورت ہے اور جب یہ عمل روبرو ممکن نہ ہو تو ہم اپنے خیالات کا اظہار تحریر کے ذریعہ یعنی لکھ کر کرتے ہیں۔ یہ تحریر خط کہلاتی ہے۔ خط نگاری تحریری شکل میں باتیں کرنا ہے۔ اس لئے خط کو عرف عام میں ''آدھی ملاقات'' بھی کہا جاتا ہے۔

انسان کی تخلیقی صلاحیتوں میں سب سے اہم صلاحیت خط کی ایجاد ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ انسان کے خیالات کو دوسرے انسان تک پہچانا ہی حروف و خطوط کی ایجاد کا اولین مقصد تھا۔ انسان کے اپنے اظہار ماضی الضمیر کے لیے قدرتی آوازوں کی نقل کرنا، اشاروں سے کام لینا اور پھر بھولنا سیکھا ہوگا۔ مگر لوگ سامنے نہیں تھے۔ ان تک بھی ابلاغ مقاصد کی خاطر کوئی صورت یا ترسیل ہونی چاہیے۔ انسان کی یہی ضرورت خط یا تحریر کی ایجاد کا سبب بنی۔

مختلف تجربوں سے گذر کر انسان موجودہ خط ایجاد کرنے میں کامیاب ہوا۔ اور ہر ایک قدم نے اپنی ضرورت کے مطابق حروف کی شکلیں تیار کی۔ اور اسی طرح خط کی ابتداء سے اسم تحریر کی ایجاد ہوئی۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ وہ زمانہ آیا جب با قاعدہ لکھنے، تصنیف و تالیف، علم و ادب کی گرم بازاری ہوئی۔ ادب کی ہی ایک شاخ خط نویسی

کتابت، دبیری کے ناموں سے موسوم ہوئی۔

مکتوب نگاری کی تاریخ بہت ہی قدیم ہے۔ کاغذ ایجاد ہونے سے پہلے جب انسان درخت کے پتوں دھات کی پلیٹوں چمڑوں اور مٹی کے لوحوں پر لکھتا تھا۔ تب بھی خط لکھے جاتے تھے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجے جاتے تھے۔ تہذیب وتمدن کے ارتقائی دور کے ساتھ جب تحریروں کے سلسلے آگے بڑھے تو مکتوب نگاری بھی اس ذیل میں آگئی۔ مکتوب نگاری کے آغاز سید مظفر حسین بزمی کلیات مکاتیب اقبال، کے مقدمے میں اس طرح رقمطراز ہیں:

> ''خطوط نویسی یا نامہ نا گری کا آغاز اسی زمانے میں ہو گیا جب انسان نے رسم الخط ایجاد کیا اور لکھنا سیکھا چنانچہ تقریباً تین ہزار سال قبل کی تین سو مٹی کی لوحیں ایسی نکلی ہیں جن پر مصر کے فراعنہ کے نام خطوط کندہ ہیں۔ یہ ۱۸۸۷ء میں سمرنا (عراق) کے مقام پر کھدائی کے دوراں دریافت ہوئیں۔(۱)

یہ بات کہنا یہاں نہایت ہی مشکل ہے کہ پہلا خط کب اور کس زبان میں تحریر ہوا۔ تخلیقات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید قدیم ترین خط وہ ہے۔ جو قرآن پاک کی بعض تفسیروں کے مطابق حضرت یعقوب نے حجرت یوسف کو اس وقت لکھا تھا جب وہ عزیز مصر بنائے گے تھے۔ چونکہ مزکورہ خط کا متن ابھی تک سامنے نہیں آیا۔ اس لیے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے جس کو آج 'خط' کا نام دیا جا رہا ہے۔ اُس وقت اس کی شکل کیا ہو گی۔ دراصل خط کا اولین نمونہ اس خط کو کیا جا سکتا ہے۔ جو حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ بلقیس کو ارسال کیا تھا۔ یہ خط اپنے پورے متن کے ساتھ لفظ بالفظ قرآن پاک میں موجود ہے۔ اس کے مستند اور معتبر ہونے میں کوئی شعبہ نہیں۔ مولانا فتح محمد خاں جالندھری نے اُردو ترجمہ قرآن پاک میں اس حقیقت کی طرف روشنی دالی

ہے:

''پتوں، چھالوں اور مٹی کی لوحوں پر جو خط تحریر کیے جاتے تھے۔ وہ مختصر اور کاروباری قسم کے ہوتے تھے۔ چنانچہ ایک ایسا ہی خط سلیمان علیہ السلام کی طرف سے دسویں صدی قبل مسیح میں فلسطین سے بجانب جشہ ارسال کیا گیا تھا۔ حضرت سلیمان علیہ اسلام کی سلطنت (۹۵۲ م تا ۹۹۲ ق م) موجودہ مشرق اردن تا یمن وسیع و عریض مملکت تھی غالباً سب سے پہلا خط عیرانی زبان میں تحریر کیا گیا تھا۔ جو ملکہ سبا کے نام ارسال کیا گیا تھا۔ وہ مختصر با معنی اور تبلیغی تھا۔ جس کی بدولت ملکہ سبا (بلقیس) مشرف با اسلام ہوئی تھیں.......... یہ خط ہدہد کے ذریعہ ارسال کیا تھا۔ کلام پاک میں خط مذکورہ کا ذکر ہے۔(۲)

مولوی سید سلیمان ندوی عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کے خطوط کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عسایوں میں مقدس حواریوں کے خطوط کی خاص اہمیت ہے اور وہ مجموعہ انجیل کے ضروری جز خیال کیے جاتے ہیں اور قبول کے ہاتھوں سے لیے اور ادب کی آنکھوں سے پڑھے جاتے ہیں''(۳)

غرض کے قدیم یونانیوں کو نہ صرف خطوط نگاری سے واقفیت تھی۔ بلکہ وہ اس میں دلچسپی بھی رکھتے تھے۔ یونان کی طرح روم کی بھی اپنی تاریخی حقیقت ہے۔ خلیق انجم روم کی خط نگاری پر کچھ اس طرح سے اظہار خیال کرتے ہیں:

''انسانی تاریخ میں یہ اعزاز اہل روم کی قسمت میں لکھا تھا

کہ وہ مکتوب نگاری کو با قاعدہ فن بنائیں۔ ادبی مورخ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ اس دور میں روم کے قابل اور پڑھے لکھے لوگ بہت دور واقع صوبوں کی گورنری کے لیے بھیجے جاتے تھے۔ اپنے صوبوں کے حالات بتاتے اور روم کے حالات جاننے کے لیے خط و کتابت کی اشد ضرورت تھی۔ سسر واسی عہد کا مکتوب نگار ہے''۔(۴)

اس طرح یونان و روم کی مکتوب نگاری کی تاریخی اہمیت ہے ۔ افلاطون (Plats)ارسطو (Aristtle) سے بہت سے مکاتیب منسوب کیے جاتے ہیں۔ پلوٹارک کے خطوط مشہور ہیں۔لیکن اہل روم نے ہی مکتوب نگاری کو با قاعدہ فن بنا دیا ہے۔ لاطینی میں ہوریس (Horace) کے منظوم خطوط ہیں۔ اور Horace سے خطوط لکھنے کی روایت قایم ہوئی۔مغربی خطوط نگاری میں سسروکو کو پہلا مکتوب نگار مانا جاتا ہے۔

انگریزی ادب میں ڈاکٹر سمویل جانسن (Samuel Johncen) لارڈ چیر فیلڈ (Lard Chesir Feld) ولیم لوپر، شیلی، کیٹس، بائرن (Byron) براوننگ وغیرہ کے خطوط اپنی جگہ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔اس کے بعد عربی زبان وادب میں خطوط کا بڑا سرمایہ موجود ہے۔عرب میں خط لکھنا اپنے آپ میں ایک ہنر تھا اور اس پیشہ کو اختیار کرنے والے کو کاتب کہا جاتا تھا۔اسلام کے ظہور کے بعد اس فن نے کافی ترقی کی اانحضرتؐ کی جانب سے ارسال کیے گئے خطوط ایک مرتب شکل میں دستیاب ہیں۔

خلفائے راشدینؓ کے خطوط میں اس وقت کے عرب انشاپردازی کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ یہ خطوط شائع ہو چکے ہیں۔حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے خطوط ندوۃ المصنفین نے ۱۹۶۰ء میں شائع کیے۔اس سے پہلے ندوۃ المصنفین نے ہی پہلے

حضرت عمر فاروقؓ کے خطوط شائع کیے۔ حضرت عثمان غنی کے خطوط جناب خورشید فاروقی پروفیسر ادبیات عربی دہلی یونیورسٹی نے ۱۹۶۵ء میں شائع کیے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے خطوط کا مجموعہ نہج البلاغہ کے نام سے شریف علی بغدادی نے شائع کیا۔ ''نہج البلاغہ'' میں شامل حضرت علی کے مکتوبات کا انگریزی ترجمہ قابل ذکر ہے۔ یہ خطوط اسلامی تاریخ میں دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں اور نہایت ہی فصیح، شستہ زبان میں مکتوبات ہیں۔ قرآن کے حوالے سے بہت کرآمد گفتگو کی گی ہے۔ حضرت عمرؓ کو یہ شرف حاصل ہے کہ انھوں نے خطوط کے ذخائر کو محفوظ کرنے اور ان ترتیب و تدوین کی عرض سے باقاعدہ ''دارالانشاء'' قائم کیا۔ ایک مرکزی محکمہ مدینہ میں تھا۔ خط نگاری کے فن پر باقاعدہ کتابیں لکھی گی۔ خطوط کی ہیت، واسلوب، مقاہیم، اقسام، تعین ہوئے۔

عربی خط نویسی کی تاریخ میں عبدالحمید ین یحیٰ کا نام سرفہرست ہے۔ انہوں نے صرف خط نگاری کی ابتداء کی بلکہ مضمون نیز القاب وآداب میں جدت وندرت پید کی۔ عبدالحمید ین یحیٰ عربی زبان وادب میں پہلے ایسے مکتوب نگار ہیں جن کے خطوط یحیٰ اور زاتی نوعیت کے ہیں۔ اور ادبی حیثیت سے ترقی یافتہ شکل میں سامنے آتے ہیں۔ اس کے بعد سامانی اور گزنوی دور میں خط وکتابت کا ایک باقاعدہ محکمہ کھل گیا۔ جس کا ذکر نظامی عروض سمرقندی نے ''چہار مقالہ'' میں کیا ہے۔ ایرانیوں نے جہاں بھی حکومت قائم کی۔ وہاں سے عربی کو نکال دیا جس کا اثر فطری طور پر خط و کتابت پر پڑا۔

عربی کی طرح فارسی میں بھی مکتوبات کا ایک ذخیرہ موجود ہے یہ مکتوبات اپنی انفرادیت اور اہمیت کے ساتھ متنوع اسالیب کے ترجمان ہیں۔ خط لکھنے والوں کو پہلے کاتب کہا جاتا تھا لیکن اب فارسی زبان کے زیر اثر انھیں دوست دار، دبیر منشی کہا جانے

لگا۔ کہیں فارسی مکتوبات فرامین کی شکل میں دستیاب ہیں۔ کہیں حکم ناموں کی شکل میں فارسی مکتوبات کا بڑا ذخیرہ درباروں اور خانقاہوں کے تعلق سے دستیاب ہوتا ہے۔ مکتوب نگاری کی تاریخ کے سلسلے میں ایک خط کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ جو امیر تیمور لنگ نے ۱۳۰۲ء میں فرانس کے چارلس ششم کو ایک خط لکھ تھا۔ جواب نیشنل اا لکا ئیوز میں محفوظ ہے۔ اس خط کا ذکر عبدالوہاب تردینی نے ''بست مقالہ'' میں کیا ہے۔ ہندوستان میں سب سے پہلے خط کا رواج چندر گپت موریہ کے زمانے میں ہوا۔ حضرت عیسیٰ سے قبل تین سو سال پہلے۔ عام طور پر ہندوستانی فارسی ادب میں ''اعجاز نامہ خروی'' کو خطوط نگاری کا نقش اولین قرار دیتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس فن پر مباحث کا اغاز ''اعجاز نامہ خسروی'' سے بہت نثر نگار اور فارسی شعراء کر چکے ہیں۔ نظامی عروضی سمر قندی کی ''چہار مقالہ'' کے ''مقالہ'' میں بھی اس فن پر بحث ہوگی ہے۔ اس کے علاوہ ''راحتہ الصدور'' میں ھی فن انشا کے اصول وقواعد درج ہیں۔

فارسی زبان وادب میں صوفیاے کرام اور بزرگان دین کے خطوط کا کثیر سرمایہ موجود ہے۔ حضرت مولانا جلال الدین محمد بن بلخی رومیؒ کے مکاتیب میں مسائل و حدانیت اور رموز تصوف پر مختلف طریقوں سے اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں امام غزالیؒ کے ''فضائل الانام من وسائل حجتہ الاسلام'' کے ساتھ مکتوبات عالیہ شاہ عبدالدزاق علوی قادریؒ مکتوبات قدوسی، شاہ عبدالقدوس گنگوہی، شیخ ابوالجعفر مکی حیسنی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مزید برآں مفاوضات حضرت شاہ محمد کاظم قلندری علوی کا کورویؒ مکاتیب حضرت حافظ شاہ علی، انور قلندری کا کورویؒ، نیز فیوض العافین وتعلیماتِ قلندر مرتبہ مولانا شاہ تقی حیدرؒ سلسلہ قلندریہ کے اذکار واشگال، حقائق ومعارف اور تعلیمات وغیرہ سے مزین ہیں۔

خواجہ عمادالدین محمود کے مکاتیب کا مجموعہ ''ریاض الانشاء'' کے نام سے موسوم ہے۔سید اشرف جہانگیر سمنانی کے مکتوبات مرتب ہو چکے ہیں۔ یہ مکاتیب اس وقت کے اکابر علماء و بزرگانِ دین کے نام ہیں۔جن میں تسوف و معرفت، ادبیت، تنقیدی نکات اور معاصرین پر تبصرہ کے عناصر دیکھے جا سکتے ہیں۔مکاتیب ابولفضلی اسلوبیات کے اعتبار سے ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ان کے مکاتیب کے دو مجموعے مکاتیب علامی اور رقعات شیخ ابوالفضل قابل توجہ ہیں۔

شہنشاہ عالم گید کے فارسی خطوط ''رقعات عالمگیری اور کلمات طیبات'' منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ یہ خطوط اورنگ زیب نے اپنے بیٹوں اور اپنے امراء کے نام لکھے ہیں۔ جن کو وہ اپنے سے قریب تصور کرتے ہیں۔

شاہ محبّ اللہ الہ آبادی کے مکاتیب کا قلمی نسخہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں دستیاب ہے یہ مجموعہ ۴۳۳ صفحات پر محیط ہے۔جس میں اپنے عہد کی تاریخی پر چھائیوں اور مذہبی روایتوں کے علاوہ وحدت الوجود کے مباحث سے بھی آراستہ ہے۔

مرزا مظہر جانجاناں کے فارسی خطوط بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ باہمی گفتگو کا پورا لفط ان کے خطوط میں موجود ہے۔

مرزا مظہر جانجاناں کی طرح کچھ افراد ایسے بھی گذرے ہیں۔ جو فارسی ادیب و شاعر تھے۔جن کا تاریخی طور پر اُردو ادب سے رشتہ بہت گہرا تھا۔اس فہرست میں مرزا محمد قتیل، مرزا غالبؔ، امام بخش صہبائی، اور مومن خاں مومن، کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس طرح فارسی مکتوب نا گری کا سلسلہ اُردو خطوط نگاری کے ساتھ بھی جاری رہا۔ یہ سلسلہ گالب کے عہد میں بھی ملتا ہے۔اوران کے بعد بھی۔

علامہ اقبال کی خطوط نگاری میں سیاسی پہلو

محمد عارف
ایم۔فل ریسرچ اسکالر
شعبۂ اُردو جموں یونیورسٹی

یہ عجب حسن اتفاق ہے کہ اُنیسویں صدی کا آٹھواں عشرہ بڑا ہی مردم خیز تھا۔لینن (1870ء) فلسفی برٹنڈ رسل (1873ء) چرچل اور ناول نگار سمرسٹ ماہم (1874ء) امریکی ناول نویس تھامس مان (1875ء) رضا شاہ اول (1876ء) جرمنی کا چانسلر ایڈی نار(1877ء) علامہ اقبال (1877ء)، مولانا محمد علی جوہر، کمال اتاترک اور قائد اعظم (1876ء) روسی سیاست دان ٹراٹسکی، سٹالن اور سائنس دان آین سٹائن (1879ء)، سب اسی عشرے کی پیداوار ہیں۔گویا قدرت دُنیا کے مختلف گوشوں اور شعبوں میں جو انقلاب لانا چاہتی تھی اُس کی داغ بیل اسی عشرے میں ڈالی گئی ۔اس عشرے میں ایک شاعر مُفکر، فلسفی، سیاستدان اور قوم معمار حب وطن علامہ اقبال تھے۔

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال 9 نومبر 1877ء بمطابق 3 ذی قعدہ 1294ھ کو سیالکوٹ کے محلّہ چودھری وہاب میں پیدا ہوئے۔نومولود کا نام اُس کی والدہ نے ''محمد اقبال'' رکھا۔اقبال نے ابتدائی تعلیم قدیم اور روایتی طرز کے مکتب میں حاصل کی۔1891ء میں مڈل اور 1893ء میں میٹرک پاس کیا۔1897ء میں بی۔اے اور 1899ء ایم۔اے پاس کیا۔1905ء میں انگلستان چلے گئے اور 1908ء میں

میونخ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

علامہ اقبالؔ کی شہرت وعظمت کا سارا مدار اُن کی شاعری پر ہے اُن کی شاعری کے حوالے سے ہی اُنھیں ایک عظیم مفکر فلاسفر اور شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ علامہ اقبالؔ کے نثری ذخیرے پر بہت کم توجہ دی گئی ہے اور نثری ذخیرے کے خطابات ،مقالات ومضامین ،تقاریر و بیانات اور مکاتیب میں سے موخرالذکر یعنی اقبال کے خطوط بے توجہی کا سب سے زیادہ شکار ہوئے۔ اُس بے توجہی کی ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اقبال کے خطوط ان کی باقاعدہ ''تصنیف'' کی ذیل میں نہیں آئے۔ مکاتیب اقبالؔ کا کوئی مجموعہ اقبالؔ کی زندگی میں شائع نہ ہوسکا کیونکہ غالب کی طرح اقبالؔ بھی اپنے خطوط کی اشاعت کو ناپسند کرتے ہیں۔ اقبالؔ ہندوستان کے علاوہ سمندر پار کے ملکوں میں بھی ایک قادرالکلام شاعر مفکر اسلام اور سیاسی قائد کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں ۔معاشرے کے ہر طبقے کے لوگ انہیں باکثرت خط لکھیئے ۔زندگی کے دوسرے معمولات سے قطع نظر خط کا جواب لکھنے میں اقبالؔ کی باقاعدگی اسی مسلمہ ہے کہ ممتاز حسین مرحوم کے اس بیان کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔

''مجھے کسی ایسے شخص کا علم نہیں جس نے اقبالؔ کو خط لکھا ہو
مگر جواب سے محروم رہا''۔

اور نہ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کی اس رائے کو رد کیا جاسکتا ہے۔

علامہ اقبالؔ نے اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں خط لکھیئے ۔زندگی کے آخری دو برسوں کے علاوہ ہمیشہ اپنے ہاتھ سے خط لکھتے تھے۔ مکاتیب اقبال کی کل تعداد کا حتمی تعین آسان نہیں۔ اقبال کے موجود و معلوم منطوعہ خطوط کی تعداد گیارہ بارہ سو سے کسی بھی طرح کم نہیں اور اس میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

اقبالؔ کی زندگی میں مکاتیب اقبالؔ کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا البتہ وفات کے

چند سال بعد 1942ء میں ''شادِ اقبال'' کے نام سے سب سے پہلا مجموعہ مکاتیب کی حیثیت سے شائع ہوا۔ تا حال مکاتیب اقبال کے آٹھ مجموعے چھپ چکے ہیں جو درج ذیل ہیں۔شاد اقبال 1942ء ،اقبال نامہ حصہ اول 1945، اقبال نامہ حصہ دوم 1951 ،مکاتیب اقبال بنام خان محمد نیاز الدین خان محروم 1954ء،مکتوبات اقبال بنام سید نذیر نیازی 1957ء،انوار اقبال 1967ء، Letter and writing ofIqbal،1967 اور مکاتیب اقبال بنام گرامی 1969ء۔

خطوط اقبالؔ حضرت علامہ کے خطوں کا نواں مجموعہ ہے ۔اس میں اقبال کے 111 غیر مدون اور غیر مرتب خطوط جمع کیے گئے ہیں۔علامہ اقبالؔ کا سیاسی روایہ انگلستان سے واپسی کے بعد شروع ہوگیا جب انھوں نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ظاہر سی بات ہے کہ وکالت میں سیاسی راویہ ہونا لازمی ہے۔

علامہ اقبالؔ کا سیاست میں پہلا قدم ایک مشہور اخبار بنام ایڈیٹر زمیندار سے شروع ہوتا ہے ۔چونکہ نومبر 1926ء میں پنجاب لجسلیٹیو کونسل (مجلس قانون ساز پنجاب) کا انتخاب ہونے والا تھا۔علامہ اقبال طبعاً سیاسی سرگرمیوں اور ہنگاموں سے چنداں دلچسپی نہ رکھتے تھے تاہم دوستوں اور مداحوں کے کہنے پرانہیں انتخاب میں حصہ لینا پڑا۔ان کے مداح دوست چاہتے تھے کہ وہ بلا مقابلہ ممبر منتخب ہو جائیں مگر تین حضرات (میاں عبدالعزیز ،ملک محمد حسن اورخان بہادر،ملک محمد دین)ان کے مقابلے میں کھڑے ہوئے۔ان میں سے دو نے نام واپس لے لیا۔علامہ اقبالؔ اپنے خط میں لکھتے ۔میں مجھے بہت مسرت ہوتی میں ملک محمد حسن اورعبدالعزیز کی اس عنایت فرمائی کا تہہ دِل سے شکر گزار ہوں اوران کے جذبے کو بے انتہا قابل تعریف سمجھتا ہوں کہ وہ مسلمانوں میں برادریوں کے اعتراف کو دیکھنا گوارانہیں کرتے۔ خان بہادر ملک محمد دین بیرا سٹرآف لاء آخروقت تک مقابلے پرڈٹے رہے مگرعلامہ

اقبال بفضلہٖ تعالیٰ خان بہادر کو تین ہزار ووٹوں کی اکثریت سے شکست دے کر 23 نومبر 1926ء کو مجلس قانون ساز کے ممبر منتخب مقرر ہوئے۔

یہ علامہ اقبال کا سیاست میں پہلا قدم تھا۔اس کے پہلے کے خطوط میں کچھ اشارے ضرور ملتے ہیں۔اُن میں ایک خط بنام اراکین انجمن کشمیری مسلمانان کے نام ہے جو مئی 1909ء میں لکھا گیا۔اس کے بعد سیاسی لحاظ سے علامہ صاحب کے بہت سے خطوط سامنے آتے ہیں مثلاً بنام ایڈیٹر انقلاب جو ہندو اور مسلمانوں کے درمیان فسادات پر لکھا گیا۔15 مئی 1925ء میں شائع ہوا۔

سالانہ اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ 1930ء منعقد الہ آباد اس میں اقبال لکھتے ہیں۔حضرات میں آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کا اعزاز ایک ایسے وقت میں بخشا ہے جو ہندوستان میں مسلم سیاسی فکر و عمل کی تاریخ میں نازک ترین لمحات ہیں۔مجھے یقین ہے کہ اس عظیم الشان اجتماع میں ایسے اصحاب بھی موجود ہیں جن کا سیاسی تجربہ مجھ سے کہیں زیادہ ہے اور جن سیاسی فیصلوں کے لیے وہ یہاں آج جمع ہوئے ہیں اُن کے سلسلے میں اُن کی راہ کا دعویٰ کروں اس خطبہ الہٰ آباد سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ کا سیاسی رجحان پہلے سے تھا۔

حکومت برطانیہ نے 1931ء کے آخر میں لندن میں دوسری گول میز کانفرنس بلائی اس میں دوسرے مسلم زعماء کے ساتھ علامہ اقبال کو بھی مدعو کیا گیا۔

ایک خط بنام مس فارقو ہرسن 22 مئی۔1932ء۔

۔۔۔۔ذاتی طور پر میں ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں خاصا مایوس ہوں بمبئی کے فسادات ابھی جاری ہیں۔اس صورت حال نے مجھے خاصا پریشان کیا۔مجھے خدشہ ہے کہ ہندوستان میں جمہوریت کا نتیجہ خونریزی کے علاوہ کچھ نہ ہوگا وغیرہ۔۔۔خطوط اقبال۔صفحہ نمبر 214۔ص۔70

بنام ڈائریکٹر ''ہمدم''، لکھنؤ۔ صفحہ نمبر 218

۔۔۔میرے ذہن میں اس وقت یہ بات تھی کہ شاید اکثریت کوئی تجاویز مسلمانوں کے سامنے پیش کرے مگر افسوس کہ ایسا نہ ہوا۔ پنڈت مدن موہن مالوی صاحب نے بھی وہی طریقہ اختیار کیا جو دہلی میں اُس سے پہلے مہاتما گاندھی نے اختیار کیا۔ بہر حال آپ نے مسٹر محمد علی جناح کا تار پڑھ لیا ہوگا۔۔۔

بنام پنڈت جواہر لال نہرو۔ 21 جون۔ 1936ء

آپ کا خط کل موصول ہوا جس کے لیے میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔۔۔ میرا خیال تھا کہ آپ کو احمدیوں کے سیاسی رویے کا علم نہیں۔۔۔۔ میں نے اپنا مضمون اسلام اور ہندوستان کی بہتری کے لیے لکھا۔ مجھے بے حد افسوس ہے کہ لاہور میں آپ سے ملاقات نہیں ہوئی۔

بنام قائد اعظم

''آپ بخوبی آگاہ ہیں کہ نئے دستور نے ہندوستان کے مسلمانوں کو کم از کم اس بات کا نادر موقع دیا ہے کہ وہ ہندوستان اور مسلم ایشیا کی آئندہ سیاسی ترقی کے پیش نظر اپنی قومی تنظیم کر سکیں گے۔ اگرچہ ہم ملک کی دیگر ترقی پسند جماعتوں کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے تیار ہیں تاہم ہمیں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ ایشیا میں اسلام کی اخلاقی اور سیاسی طاقت کے مستقبل کا انحصار بہت حد تک ہندوستان کے مسلمانوں کی مکمل تنظیم پر ہے۔ اس لیے میری تجویز ہے کہ آپ جلد از جلد دہلی میں ایک آل انڈیا مسلم کنونشن منعقد کریں۔ اس کنونشن میں پوری قوت اور قطعی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیں کہ سیاسی مطمع نظر کی حیثیت سے مسلمانانِ ہند ملک میں جداگانہ سیاسی وجود رکھتے ہیں۔۔۔'' (20 مارچ۔ 1937ء)

علامہ اقبال نے سماجی، مذہبی اور سیاسی ہر طرح کے خطوط لکھے۔ اس کے علاوہ

اپنی والدہ اپنے بھائی اور بیٹے جاوید اقبال کے نام لکھے ۔ترلوک چند محروم ،مولوی انشااللہ خان ،خواجہ حسن نظامی ،میر سردار احمد خان ،سید شوکت حسین ،شیخ نور احمد ،سید سجاد حیدر یلدرم ،شاد عظیم آبادی ،مسٹر سمتھ ،منشی رام پرشاد ،سرداس مسعود ،سر اکبر حیدری جنرل کونسل انجمن حمایت اسلام اور آخر میں سید مبارک شاہ جیلانی جو ایک سو گیارواں خط ہے شامل ہیں۔

لہٰذا میرے خیال میں یہ ایک ایسا خط تھا جس کی آگ آج بھی ہندوستان اور پاکستان میں لگی ہوئی ہے اور دونوں ملکوں کے لوگ اس سے دو چار ہیں۔

علامہ اقبال کی زندگی میں سیاست ایک اہم پہلو رہا ہے۔وہ ان کی شاعری میں نمودار ہوا اور بعد میں خط و کتابت کے ذریعے سیاسی لیڈروں سے رابطہ قائم رہا۔

علامہ اقبالؔ کا نثری سرمایہ بے توجہی کا شکار ہوا جس کی وجہ سے اقبالؔ کے خطوط کو اتنی شہرت نہ مل سکی جتنی علامہ اقبال کی شاعری کو حاصل ہوئی۔

سلام و پیام

(تلوک چند محرومؔ)

محفل میں رنگِ اُلفت اے شیخ پھر جمادے
لایا فرنگ سے ہے جو مے وہی پلادے
پھر ہو رہی ہے ان بن کچھ شیخ و برہمن میں
ان کو گلے ملادے روٹھے ہوئے منادے
ہو برہمن نمازی زائد ہو پائے بُت پر
دیر و حرم کو ایسی ترکیب سے ملادے
سوتوں کو ہے جگانا مردوں کو ہے جلانا
ہوگا یہ کام تجھ سے ہمت تجھے خدادے

مکاتیبِ اقبالؔ میں کشمیریت

ڈاکٹر عاشق چوہدری
اسسٹنٹ پروفیسر اُردو

حُب الوطنی کا جذبہ بشر کے علاوہ حیوانات میں بھی ہوتا ہے۔ جس کا زندہ ثبوت یہ ہے جب کسی جانور یا چرند پرند کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاتا ہے تو کہیں دونوں تک وہ عالمِ سوگ میں رہتے ہیں۔ مگر انسان کو رب العزت نے اشرف الخلوقات کا درجہ عطا فرما کر بے شمار ایسے احساسات سے نوازہ ہے جن کی بدولت انسان دیگر حیوانات سے ممتاز اور زیادہ حساس ہے۔ اگر چہ حُب وطن کا جذبہ ہر زندہ شے میں موجود ہوتا ہے لیکن۔ اس جذبہ عظیم میں بھی سبقت انسان کو حامل ہے۔ پھر اقبال جیسی (Hyper sensitreness personality) بیش حساسیت شخصیت پر تو حب الوطنی کے جذبے نے جنوں کی صورت اختیار کر لی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ لندن کی زمستانی ہوائیں بھی اُن سے آداب سحر خیزی نہ چھوڑا سکیں۔

زمستانی ہوا میں اگر چہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدب سحر خیزی

اقبالؔ کے حُب الوطنی کا یہ عالم تھا کہ جب وہ ہندوستان کو اپنا وطن تصور کرتے ہیں اور اس کی تعریف میں نغمہ سرائی کرتے ہیں تو پوری دنیا پر ہندوستان کو فوقیت حاصل کروا

دیتے ہیں۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا

لیکن سب سے اہم اور سب سے دلچسپ اور مزے کی بات یہ ہے کہ اقبالؔ ہندوستان اور پنجابی ہونے سے پہلے کشمیری تھے۔ کشمیر اور کشمیریت اقبالؔ کی رگ و پا میں اس طرح سرایت کر چکی تھی کہ وہ تا حیات اس وادی گل پوش کے نغمے مختلف عنوانات سے گنگناتے رہے۔ اقبالؔ نے ہر لخت کشمیر کو اپنا وطن سمجھا اور وہ اس کے ہجر میں ہر دم مبتلا نظر آتے ہیں۔ کشمیر سے اقبالؔ کو جو والہانہ محبت و عقیدت تھی اس کا ثبوت اُن کی نظم و نثر دونوں ہیں۔

کشمیر کا چمن جو مجھے دل پذیر ہے
اُس باغِ جان فزا کا یہ بلبل اسیر ہے
ورثے میں ہم کو آئی ہے آدم کی جائیداد
جو وطن ہے ہمارا وہ جنت نظیر ہے

پروفیسر القادر سروری لکھتے ہیں ''وہ اقبالؔ کو کشمیر کے ساتھ نسل ربط کے علاوہ ذہنی ربط بھی رہا۔ جہاں وہ کشمیر کے فطری مناظر کے حُسن اور اُن کی رعنائی کے گیت گاتے ہیں۔ وہی اہل کشمیر کی مظلومی اور بسی پر بھی آنسوں بہاتے ہیں۔ کشمیر کے حسن کو دیکھنے میں ان کی ژوف بین نظر عام شاعروں کے روایتی انداز سے متاثر نہیں ہو ہیں۔ چناچہ کشمیر کے حُسن کے روایتی موضوعات، گلمر گ، پہلگام، ڈل یا ولیر پر انھوں نے کوئی نظم نہیں لکھی بلکہ کشمیر کی حقیقی زندگی اور اہل کشمیر کے بعض بنیادی مسائل ان کی توجہ کے مرکز رہے'' [1] عبدال؛ قادر سروری: کشمیر میں اردو (حصہ دوم) جموں کشمیر کلچرل اکیڈمی ص ۲۶۷

یہ بھی سچ ہے کہ اقبالؔ نے جتنے حسین پیرائے میں کشمیر اور کشمیریت کو بیان کیا اُتنی

ہی عقدیت اور مودبانہ انداز میں کشمیریوں نے بھی اقبالؔ کوخراج تحسین پیش کیا ہے۔لیکن کثرتاًایسا ہوا ہے کہ کلام اقبال کے تو ہر پہلو پر گفت وشنید ہوئی ہے اور معتبر انداز میں ہوئی جس سے کشمیر اور کشمیریت کے تناظر میں کارآمد نتائج برآمد ہوئے ہیں۔لیکن نثر کے حوالے سے کہیں نہ کہیں تشنگی محسوس ہوتی ہے۔جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کا کشمیر کے ساتھ جو ذہنی، جذباتی اور فکری لگاؤ تھا اُس کا اظہار انہوں نے جابجا اپنی شاعری، اپنے مکاتیب، اپنے خطبات اور بیانات میں بڑے دلکش انداز میں کیا ہے۔کشمیر اور کشمیریوں کے لیے اقبال کے دل و دماغ میں گہری محنت، بے لوث ہمدردی، والہانہ جذباتی اور فکری لگاؤ کی ابتداء اُن کی انیس سالہ زندگی میں اُس وقت ہوتی ہے۔جب وہ بی۔اے سال دوم کے طالب علم تھے یہ بات تقریباً ۱۸۹۶ء کی جب کشمیری مسلمان مہاجرین نے ''انجمن کشمیری مسلمانوں ہند''، قائم کی تھی اور اقبال نے اپنی نظم ''فلاحِ قوم'' کے ساتھ اس انجمن میں شرکت کی۔پھر یہ سلسلہ تادمِ مرگ قایم رہا۔

حقیقت یہ ہے کہ اقبالؔ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے ان کی شخصیت اتنی پہلودار ہے کہ اگر کسی بھی پہلو پر بحث کی جائے تو مکمل طور پر اُس پہلو کا احاطہ کرنا اگر ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہے۔ان کی شخصیت سے ہر عہد اور ہر دور میں فکر وفن اور شعور وتفکر کے نیے چشمے پھوٹے ہیں۔شاعری کے حوالے سے بات کی جائے تو اُن کا ایک بڑا حصہ کشمیر اور کشمیریت کے متعلق ہے۔جہاں انھوں نے اپنے مخصوص فلسفیانہ انداز میں کہیں پیچیدہ مسائل کو اُبھرا ہے جن کا تعلق براے راست کشمیری قوم سے رہا ہے۔وہی مکتوبِ اقبال کی کثرہ تعداد ایسی ہے جن کے ذریعے انھوں نے اس وادیِ گل پوش اور اس کے باشندگان کے ساتھ ہمدردی، یکجہتی، لگاو اور اُن کی اصلاح کا بیڑہ اُٹھایا ہے۔کشمیر کے تعلق سے اقبالؔ کے تحریر کردہ خطوط کی تعداد کافی طویل ہے

اُن سب کا اس مضمون میں تذکرہ کرنا ممکن نہیں۔صرف ان خطوط تک خود کو محدود رکھا جائے گا جو اُنھوں نے کشمیر کی شہرت یافتہ شخصیات کے حوالے سے لکھیے اور جن میں خصوصاً کشمیری قوم کو مرکز بنایا گیا ہے۔

اقبآل کا حلقہ ارباب کافی طویل ہے اور اقبال کے خط کم بیش اُن سب کے نام ملتے ہیں لیکن یہ بات بھی حقیقت پر مبنی ہے کہ اقبآل نے اپنی حیات میں سید نذیر نیازی کے بعد سب سے زیادہ خط محمد دین فوؔق کے نام تحریر کیا۔محمد دین فوق کے ساتھ اقبآل کو علاقیات مناسبت کے ساتھ ساتھ ذہنی مناسبت بھی تھی۔

فوق کے نام اقبآل کے لکھیے خطوں میں وہ دو گشتی چھٹیاں بہت مشہور مفروف ہیں جنھیں محمد دین فوق نے کشمیری میگزین میں اہل کشمیر کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ دراصل یہ اُس وقت کی بات ہے جب کشمیری مسلمانان کے درپیش سب بڑا مسلہ کشمیریوں کو فوج میں بھرتی کیا جانے اور کشمیریوں کو زراعت پیشہ قرار دینا تھا۔اقبآل نے اس اہم مسئلہ کو بڑی سنجیدگی سے لیے اور اپنے خطوط کے ذریعے کشمیری قوم کی اصلاح بھی کی اور نئی حکمت عمل سے آشنا بھی کیا۔پہلی گشتی چھٹی کا کچھ حصہ ملاحظہ ہو۔

> ’’میں تحریر کرتا ہوں کہ آپ اپنے سنٹر میں ضرور کشمیر مجلس قائم کریں۔اس کے علاوہ ہر ایسے مقام میں جہاں آپ کا اثر ہوا اپنے دیگر کشمیری بھائیوں کو کشمیر مجلس قائم کرنے کی ترتیب دیں کیونکہ اس طریق سے نہ صرف قوم کے افراد میں یگانگت کی صورت پیدا ہوگی بلکہ قومی حقوق کی حفاظت اور توسیع میں سہولت ہوگی‘‘۔[۲]

ص(۲)پروفیسر جگن ناتھ آزاد اقبال اور کشمیر ص۱۱۰

بالا متن سے واضح ہو جاتا ہے اقبآل پوری کشمیری قوم سے مخاطب ہیں اور انھیں

اتفاق واتحاد کا درس دیے رہتے ہیں اور یگانگیت کی صورت میں منزل کی طرف گامزہ کرر ہے ہیں۔ کیونکہ وہ اس راز کو پا چکے تھے کہ اتفاق اور اتحاد ہی ایک طاقت ہے جس سے باطل کوشکست دی جاسکتی ہے۔

دوسری گشتی چھٹی پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے مطابق ۱۹۰۹ء مین لکھی گی تھی۔اس خط کا کچھ حصہ ملاحظہ ہو۔

> ''.......دنیااس بات کوتسلیم کر چکی ہے کہ تعلیم کے بغیر کوئی قوم زندہ قوموں میں شمار نہیں ہوسکتی۔جس قدر قومیں آج آپ کو مہذب، شائستہ اور ترقی یافتہ نظر آتی ہیں وہ سب علم کے زینہ ہی سے آسمانِ عروج وکمال پر پہنچی ہیں آپ کو یاد رہے کہ آپ میں وہ سچے موتی اور جوہر موجود ہیں جن کی چمک دمک سے دنیا حیراں اور خیرہ ہوسکتی ہے لیکن صرف جلا کی ضرورت ہے۔اور جلا تعلیم کے ذریعے یہی سے ہوسکتی ہے۔۳۱
>
> عبدالمجید سالک، ذکر اقبال ص ۲۰۸

اس متین سے بھی عیاں ہو جاتا ہے کہ اقبالؔ کو کشمیری قوم سے کس قدر انس و ہمدوردی تھی اور وہ کس طرح یار یک بینی سے تعلیم کے معجزت سے کشمیریوں کو آگے کر رہے ہیں کہ اگر تم کو زندہ قوموں میں شمار ہونا ہے تو تمہارے پاس صرف ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے تعلیم ۔لیکن بڑی بات یہ ہے کہ اقبالؔ کو کشمیری قوم کی ذہانت پر پورا بھروسہ ہے اسی لیے وہ لکھتے ہیں کہ'' آپ میں وہ سچے موتی اور جوہر موجود ہیں'' یہ حقیقت ہے کہ اقبالؔ کشمیری قوم سے کبھی بھی ناموس نہیں ہوئے ہیں بلکہ ان کے اندر اُن کو ہر صورت میں جوہر نایاب نظر آتے ہیں جہاں وہ شاعری میں کہتے ہیں۔

نہیں ہے نااُمید اقبالؔ اپنی کشتِ ویراں سے

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

وہی اپنے متعدد مکتوبات میں بھی انھوں بڑے مسبت انداز سے کشمیری قوم کی رہنمائی کی ہے۔ جیسے کہ پہلے بھی تحریر کر چکا ہوں کہ کشمیر اقبالؔ کے اباواجداد کا وطن اور اس کو دیکھنے کے لیے اقبالؔ پر پل بے قرار نظر آتے ہیں۔ محمد دین فوق کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

''رسالہ ''رہنما کشمیر'' جو حال میں آپ کے قلم سے نکلا ہے نہایت ہی دلچسپ اور مفید ہے طرز بیان بھی دل کش اور مجھے یقین ہے کہ ہر رسالہ عام لوگوں کے لیے نہایت مقید ثابت ہو گا۔ افسوس ہے کہ میں آج تک کشمیر کی سیر نہیں کی۔ امسال ممکن ہے کہ آپ کا رسالہ اُدھر کھینچ''۔[۴]

....انقلاب اقبال اکیڈمی پاکستان لاہور ص ۹

۱۹۲۵ء میں جب ریاستی حکومت کی باگ ڈوڑ مہاراجہ ہری سنگھ نے سنبھالی تو اس تبدیلی سے اقبالؔ کے دل میں اپنے آبائی وطن، اقبال کا خیال زیادہ زور وشور سے پیدا ہوا اور انھوں نے کشمیر کی ریاستی اسمبلی میں ملازمت کے حصول کے لیے جے۔ پی تھامسن کے نام ۱۷ اکتوبر ۱۹۲۵ء کو نگریزی میں ایک خط لکھا۔ جس کا مفہوم یہ ہے:

''....کیا آپ میرے لیے کشمیر کی ریاستی مجلس میں ملازمت کے حصول میں مدد کر سکتے ہیں۔ میرے خیال میں آپ کو علم ہوگا کہ کشمیر میرے آباواجداد کا وطن تھا اور میرے دل میں ہمشیہ سے اس ریاست سے دلی وابستگی رہی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ نئے مہاراجہ صاحب اپنی سرکار میں کچھ تبدیلیوں کے بارے میں غور کر رہے ہوں۔ اگر ایسا ہے تو اس معاملہ میں سلسلہ جنبانی کے

لیے مناسب موقع ہے''۔۵؎

پروفیسر جگن ناتھ آزاد۔اقبال اور کشمیر ص ۱۷۱

تحریک حریت کشمیر کی جدوجہد کے دوران کئی لوگوں کی جانین چلی گی کئی پر مقدمات دئر کر کے اُن کو جیلوں میں قیدی بنایا گیا۔اقبالؔ نے ان اسیران کشمیر کی امداد اور کے مقدمات کی پیروی کے لیے بہت سے وکلاء کشمیر روانہ کیا اور کچھ کو خط لکھ کر آمادہ کیا۔ایک کا خط یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

تاریخ.مقدمہ ۲۲ستمبر ہے اور مقدمہ سرینگر میں ہوگا۔شیخ عبدالمجید صدر کشمیر کانفرنس ان کو مفصل ہدایت لکھ دیں گے کہ ان کو کون سے راستے سے سرینگر پہنچانا چاہئے۔یعنی کہ جموں کے راستے یا راولپنڈی کے راستے دونوں راستے اچھے۔مسلمانوں کشمیران کا مناسبت استعمال کرئے گے۔۶؎

شیخ عطااللہ۔مرتب اقبال نامہ۔ص ۴۳۹

یہ خط کشمیر کے معاملات سے اقبال کی دلچسپی اور محبت کے مظہر ہیں اور اس بات کا عین ثبوت ہیں کہ اقبال کو کشمیری عوام سے کس قدر محبت تھی کہ جب اُن پر مقدمات لگے گے تو اقبالؔ نے ملک کے کونے کونے سے وکلاء کو آمادہ کر کے کشمیریوں کی مدد کے لیے کشمیر روانہ کیا تا کہ اُن کو قید سے چھوڑ یا جا سکے۔

۱۹۳۳ء میں جب آل جموں کشمیر مسلم کانفرنس کے رہنماوں نے اپنا دوسرا سالانا اجلاس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تو اس شرکت کے لیے شیخ محمد عبداللہ نے علامہ اقبالؔ کو بھی دعوت دی۔اقبالؔ کانفرنس میں تو تشریف لیکناُ نھوں نے جواب میں شیخ عبداللہ جو خط لکھا نہایت ہی سبق آموز اور نصیحت آموز ہے

۱۲/۱ اکتوبر ۱۹۳۳ء

ڈاکٹر شیخ عبداللہ صاحب، اسلام علیکم۔

آپ کا نامہ ابھی ملا ہے مسلم کانفرنس کشمیر اخبارات پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ مجھے یقین ہے کہ بزرگانِ کشمیر بہت جلد اپنے معاملات سلجھا سکیں گے۔ اس بات کے لیے میں ہر لحاظ دست بدعا ہوا اور یقین کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے آپ کی مساعی کو بار آور کرے گا۔ لیکن جو مختلف جماعتیں سنا ہے کہ بن گئی ہیں اور اُن کا باہمی اختلاف آپ کے مقاصد کی تکمیل میں بہت بڑی رکاوٹ ہوگا۔ ہم آہنگی ہی ایک ایسی چیز ہے جو تمام سیاسی اور تمدنی مشکلات کا علاج ہے۔ ہندی مسلمانوں کے کام ابھی تک محض اسی وجہ سے بگڑے ہیں کہ یہ قوم ہم آہنگ نہ ہوسکی۔ اور اس کے افراد اور بالخصوص علما اوروں کے ہاتھ کٹ پتلی بنے رہے۔ بلکہ اس وقت بھی ہیں بہر حال دعا ہے کہ آپ کے ملک کو یہ تجربہ نہ ہو۔ افسوس ہے کہ میں اور مشاغل کی وجہ سے کانفرنس میں شریک نہ ہوسکوں گا۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا''۔ ؎

محمد اقبال لاہور۔ شیخ عطاء اللہ مرتب اقبال نامہ ص ۴۳۹

اس خط کے متن سے بالکل صاف ہو جاتا ہے کہ اقبالؔ کو کشمیر اور کشمیری عوام سے کس قدر انس و عقیدت تھی۔ وہ اس قوم کو ٹوٹتے اور بکھرتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس خط میں انہوں نے کشمیری لیڈوں کو مخاطب کر واضح کیا ہے تمام اختلاف چھوڑ کر اتفاق اور اتحاد سے رہے اور اتفاق اور اتحاد ہی ایک چیز ہے جس سے آپ اپنی منزل متعین کر سکتے ہو۔

اقبالؔ کے دل میں کشمیر دیکھنے خواہش تو تھی مگر کئی بار کوشش کرنے کے باوجود یہ خواہش پوری نہ ہو رہی تھی۔ آخر کار قدرت نے یاری کی ۱۹۲۱ء میں اقبال کشمیر تشریف لائے۔ ہوا یہ تھا کہ منشی سراج الدین نے اقبالؔ کو ایک مقدمے کی پیروی کے لیے کشمیر بلایا تھا اور اقبال کم و بیش دو ہفتے اس مقدمے کے سلسلے میں کشمیر رہے۔

اقبال نے کشمیر میں اپنے مختصر قیام کے دوران کن مقدمات کی پیروی کی۔ کہاں کہاں

گئے، کن کن مقامات کی سیر کی، کن کن لوگوں سے ملاقاتیں کی، کن کن ادبی واسلامی انجمون اور محفلوں کی زینت ہے ان تمام باتیوں کی کوئی ٹھوس تفصیل تو نہیں ملتی ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ اقبالؔ نے کشمیر سے واپسی پر کچھ حضرات کے نام جو خط تحریر کیے ہیں۔ ان میں کشمیری کی مہمان نوازی، یہاں کی خدمت گذاری اور کچھ مقدمات کا ذکر کیا ہے۔

اقبال کے خطوط سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے وہ دوبارہ کشمیر آنا چاہتے تھے اور کشمیری عوام بھی ان کے انتظار میں آنکھیں بچھائے بیٹھی تھی۔ سید غلام میراں شاہ کے نام اقبالؔ کے خطوط سے یہ بات صاف ہو جاتا ہے کہ اقبال دوبارہ کشمیر آنا چاہتے تھے ۔کشمیر کی تحریکِ آزدای سے وابستہ رہنما بھی اُن کی آمد میں منظر تھے اس بات کا ذکر شیخ محمد عبداللہ نے اپنی خود نوشت ''آتش چنار'' میں بڑے والہانہ انداز میں کیا ہے۔

''مجھے ساری عمر قلق رہا کہ علامہ اقبالؔ نے میری درخوست
پر کشمیر آنا مان لیا تھا، لیکن پہلے تو ڈوگرہ حکومت نے ان کی راہ میں
مشکلات پیدا کیں اور بعد میں موت کا بے رحم ہاتھ اُن کی راہ میں
ہمیشہ کے لیے حائل ہو گیا''۔ ۸

شیخ محمد عبداللہ۔ اآتش چنار ص ۲۷۱

اقبالؔ کے اس قبیل کے متعداد اور بھی خطوط ہیں جن کے ذریعے انھوں نے وقتاً فوقتاً کشمیری عوام کی رہنمائی کی ہے۔ جس طرح اقبال کی شاعری کا ایک بڑا حصہ کشمیر اور کشمیریت کے متعلق ہے بکل ٹھیک اُسی طرح ان کے مکتوب کا ایک اچھا خاصہ حصّہ کشمیر اور اہلِ کشمیر کے تعلق سے ہے۔ جن میں سے انھوں نے یہاں کے عوام کی رہبری بھی کی اور رہنمائی بھی کی ہے اور اپنی عقیدت وانس کا ثبوت بھی پیش کیا ہے۔ جب بھی کشمیریت اور اقبالیات کے تعلق بات ہو گی تو اُن شاعری کے ساتھ ساتھ اُن مکتوب کا ذکر بھی لازمی ہو گا۔

خطوط غالبؔ کی خصوصیات

شاہدہ نواز
شعبہ اُردو جموں یونیورسٹی

''ہیں اور بھی دُنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور''

بقول خواجہ احمد فاروقی

''حاکم بدہن اگر دیوانِ غالبؔ نہ ہوتا صرف خطوط غالبؔ ہوتے تو بھی غالبؔ، غالب رہتے''۔

مرزا غالبؔ کے خطوط ہی ان کی اُردو نثر نگاری کا سرمایہ ہیں۔ خطوط کے ذریعے انھوں نے اُردو نثر کی غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں جہاں ایک طرف انھوں نے اُردو نثر نگاری کو بامِ عروج تک پہنچایا وہیں دوسری طرف اُردو شاعری بالخصوص اُردو غزل کو چار چاند لگائے۔

بقول رشید احمد صدیقی

''غزل اگرچہ اُردو شاعری کی آبرو ہے تو غالبؔ اُردو غزل کی آبرو ہیں''۔

ان کے بارے میں مشہور ہے کہ مرزا نے مراسلے کو مکالمہ بنایا اس کا اعتراف خود کیا جیسا کہ ان کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے۔

''ہزار کوس بہ زبان قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو''۔ ان کی خطوط نگاری کا طریقہ سب سے الگ تھا۔

بقول حالؔی

''مرزا کے اُردو خط وکتابت کا طریقہ فی الواقع سب سے
نرالا ہے نہ مرزا سے پہلے کسی نے خط وکتابت کا یہ رنگ اختیار کیا
نہ ہی ان کے بعد کسی سے ان کی پوری تقلید ہوسکی''۔

خطوط غالبؔ اور جدید اُردو نثر: ان کے خطوط سے جدید اُردو نثر کا آغاز ہوتا ہے۔
بقول آل احمد سرور: ''غالبؔ کے خطوط سے جدید نثر کا آغاز ہوتا ہے۔ بلاخوف وتردد کہا جاسکتا ہے کہ خواہ شبلؔی ہوں یا ابوالکلام غالبؔ کے خطوں کا جواب اب تک نہ ہوسکا''
جدید نثر کی تشکیل میں حالؔی کے بعد دوسرا نام غالبؔ کا آتا ہے۔ ان کے بعد سرسید اوران کے رفقاء نے نثر کو فروغ دیا۔ خطوط نویسی میں انھوں نے جو طریقہ ایجاد کیا۔ جدتیں پیدا کیں، اس میں وہ اول بھی ہیں اور آخر بھی۔ تحریر سادہ ہے مگر دلکش، لطیف اور شیرین ہے۔ ان کی نثر میں سادگی اور سلاست کے باوجود پرکاری بھی ہے جو ان کی شخصیت کا حصہ تھی۔ فارسی زبان پر انکو عبور حاصل تھا۔ اُردو نثر میں فارسی کے استعمال سے ان کی نثر کی خوبصورتی اور بھی دوبالا ہوجاتی ہے۔ ان کی نثر میں ایسا اسلوب نہیں ملتا جو محنت سے پیدا ہوتا ہے اس کے برخلاف ایک روانی نظر آتی ہے۔ فطری بہاؤ، نغمگی اور غنائی کیفیت کا احساس ہوتا ہے یہ تمام چیزیں خطوط کی نثر کو ایک نئے اسلوب سے آشنا کرتی ہیں۔

آل احمد سرورؔ نے ان کے بارے میں درست فرمایا ہے۔

''غالبؔ جدید اُردو نثر کے موجد اور خطوط نویسی کے رہنما ہیں''۔

منفرد انداز تحریر: غالبؔ کا اندازِ تحریر اس قدر مقبول ہوا کہ معاصرین نے ان کی پیروی کرنی شروع کی لیکن کوئی بھی مکمل طور پر ان کے اصولوں پر کھرا نہیں اُترا۔
شاید حامد حسن قادری نے ٹھیک کہا ہے۔

''اُردوخطوط نویسی کا غالبؔ نے جو طریقہ ایجاد کیا ہے اس
میں وہ اول بھی ہیں اور آخر بھی''۔

ان کی نثر کی دوسری بڑی اہمیت یہ ہے کہ ان کے خطوط نے اُردو نثر کو ترقی کی منازل کی طرف گامزن کیا۔

اُردو نثر قافیے اور مرصع کاری میں جکڑی تھی غالبؔ نے آزاد کرایا۔سادگی اور سلاست پیدا کی نثر نگاروں کو اُردو نثر نگاری کو فروغ دینے کی طرف گامزن و آمادہ کیا۔

نثر نگاری کی انفرادیت

۱۔قدیم انداز کی عبارت آئی کو قطعی طور پر ترک کیا

۲۔غیر ضروری تشبیہات واستعارات سے گریز کیا

۳۔فرسودہ انداز کو ختم کیا۔

۴۔سماجی واقعات کو بیان کیا

۵۔ہر موقعے پر زندگی اور زندہ دلی کا ثبوت دیا۔

کسی نے خوب کہا ہے

؎ زندگی زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دِل ہم جیا نہیں کرتے

نثری خصوصیات:

شخصیت کا بیان :ان کے خطوط سے ان کی شخصیت کے ایسے گوشوں کا سراغ ملتا ہے جن سے اُردو ادب میں نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے۔

بقول حالیؔ:''غالبؔ کا ہر خط ان کی شخصیت کے کسی نہ کسی پہلو کی ترجمانی کرتا ہے''۔

سماجی زندگی کی جانکاری:ان کے خطوط کے مطالعہ سے اُس عہد کی سماجی زندگی کا ذخیرہ سامنے آتا ہے۔

بقول رشید احمد صدیقی ''گھر کا بھیدی کہہ سکتے ہیں''۔

ایسا لگتا ہے ویڈیو فلم ہماری آنکھوں کے سامنے چل رہی ہے۔ تبصرہ ان کی زبان ہے۔

جدّت پسندی: عام روش سے ہٹ کر چلنا ان کے مزاج میں شامل تھا۔ انھوں نے خطوط کے پرانے انداز کو ترک کیا۔ نیا طریقہ ایجاد کیا۔

مختصر آداب والقاب: زمانہ قدیم سے یہ دستور تھا کہ مکتوب الیہ کو خوش کرنے کے لیے لمبے لمبے آداب والقاب لکھے جاتے تھے۔ غالبؔ یہاں بھی الگ نظر آتے ہیں۔ لمبے آداب والقاب سے گریز کیا جیسے بھائی۔ میاں۔ برادر۔ مہاراج وغیرہ کا استعمال کیا۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ان کے خطوط اُردو ادب کی تاریخ میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ خطوط غالبؔ سے جہاں ایک طرف جدید اُردو نثر کا آغاز ہوتا ہے وہیں دوسری طرف ان کی شخصیت، غدر کا بیان، سماجی حالات، معاشرتی عکاسی وغیرہ کا پتہ بھی چلتا ہے۔ جتنی بار خطوط کا مطالعہ کیا جائے نئے پہلو اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ یہ ان کی ادبی شخصیت کا آئینہ ہیں۔ غالبؔ کو ادبی شخصیت بنانے میں شاعری کے ساتھ ساتھ خطوط کا بھی بڑا دخل ہے۔

بقول خلیق انجم: ''یہ خطوط ہمارے لیے سرمایہ انبساط بھی ہیں اور ذخیرہ معلومات بھی''

مختلف جگہوں پر نام کا استعمال: عموماً خط کے آخر میں مکتوب نگار اپنا نام لکھتا ہے۔ غالبؔ کو گھسی پٹی باتیں پسند نہیں تھیں۔ یہاں بھی جدّت سے کام لیا۔ نام کا استعمال کبھی خط کے شروع میں کبھی آخر اور کبھی درمیان میں کرتے تھے۔

تاریخ کا اہتمام: غالبؔ خطوں میں تاریخ کا اہتمام کیا کرتے تھے یہ اُن کی نمایاں خصوصیت تھی۔

مختلف جگہوں پر سلام ودُعا کا استعمال: غالبؔ کبھی خط کے شروع، کبھی درمیان اور کبھی آخر میں سلام ودُعا کا استعمال کرتے تھے۔

بات چیت کا سا انداز: خط کو آدھی ملاقات کہا جاتا ہے لیکن غالبؔ نے اسے پوری ملاقات کہا ہے کیوں کہ ایسے خطوط لکھتے ہیں جیسے کوئی آمنے سامنے بیٹھ کر باتیں کر رہا ہو۔

مکمل ڈراما: بعض خطوط ایسے ہیں جو مکمل ڈراما ہیں۔

شوخی وظرافت: غالبؔ کے مزاج میں بلا کی شوخی، ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری تھی شاید اسی وجہ سے حالیؔ نے انھیں ''حیوانِ ظریف'' کہا ہے۔ اُن کی نثر میں جگہ جگہ چٹکلے، لطیفے اور ظرافت آمیز باتیں دکھائی دیتی ہیں۔

بقول حالیؔ: ''وہ چیز جس نے ان کے خطوط کو ناول اور ڈرامے سے زیادہ دلچسپ بنایا شوخی تحریر ہے''۔

خودسوانحی عنصر: اُن کی نثر کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ حالاتِ زندگی کے بارے میں اس قدر جانکاری ملتی ہے۔ مکمل سوانح حیات تیار کی جا سکتی ہے یعنی پیدائش، باپ دادا کا ذکر، ننھال کا ذکر، پنشن کا بیان، کلکتہ کا سفر، شادی کا بیان، عشق بازی، قمار بازی، غذا کا بیان غرض پوری تفصیل ہے۔

بقول نثار احمد فاروقی

''تمام خطوط کو جمع کر کے یقیناً آپ بیتی لکھی جا سکتی ہے''۔

دہلی کے حالات: مرزا نے مغل سلطنت کا سورج غروب ہوتے دیکھا۔ انگریزوں کے اقبال کی صبح اُن کی آنکھوں کے سامنے طلوع ہوئی ان تمام واقعات کا ذکر بھی ہے۔

1857ء کے غدر کا بیان: غدر کے بارے میں بھرپور جانکاری پیش کی ہے ایسے واقعات بھی لکھے ہیں جن کی جانکاری کہیں اور نہیں ملتی گویا اُن کی نثر اُس عہد کی نثر ہے۔

بقول خلیق انجم: غالبؔ کے خطوط میں تجربات واحساسات کی رنگارنگی، اجتماعی تجربے، ذاتی وارداتیں بھی ہیں۔ ایک فرد کی آواز بھی ہے پورے عہد کی گونج بھی''۔

ناول کے عناصر: اُن کی نثر میں ناول جیسی آوازوں کی بہتات ہے۔

سادگی: اُن کی نثر ایسی دلکش ہے کہ مصنف ہزار بار مفصل کرنے اور نوک پلک سنوارنے کے باوجود ایسی نثر لکھنے پر قادر نہیں ہوسکتا۔

رنگینی: مرزا نے حسبِ ضرورت نثر میں شعری وسائل کا سہارا لیا ہے۔کہیں استعارہ وتشبیہ سے کام لیتے ہیں تو کہیں پیکر تراشی سے۔گویا ان کی نثر سادگی اور رنگینی کا دلکش امتزاج ہے۔

''اب تو گبھرا کے کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کر بھی نہ چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے''

مرقع کشی: جہاں مرزا نے شعری تدابیر سے کام لیا ہے تو وہیں تصویر کشی کا کمال بھی دکھایا ہے۔اُردو میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش غالبؔ کے ہاں ملتے ہیں۔

قافیہ آرائی: قافیے کا تعلق اگرچہ نقوش غالبؔ نے نثر کو قافیہ پیمائی سے آزاد کرایا لیکن دوستوں کو دکھانے کے لیے وہ کسی کام میں پیچھے نہیں،اس غرض سے قافیہ کا استعمال کیا۔

افسانویت: نثر میں افسانوی انداز بھی مِلتا ہے۔اس کی مثالیں کم ہیں مگر دلکش ہیں۔کئی واقعات ایسے ہیں جیسے کوئی کہانی سنا رہا ہے۔

علمی نثر: علمی نثر کی داغ بیل کا سہرا سرسید کے سر ہے لیکن غالبؔ کی نثر میں اسکے اولین نقوش نظر آتے ہیں۔

استدلالی نثر: سرسید نے استدلالی نثر سے بہت کام لیا ہے لیکن اس کا نقش اول غالبؔ کے ہاں نظر آتا ہے۔عام بول چال کی زبان: انھوں نے اکثر مکتوب میں عام بول چال کی باتیں لکھیں۔وہ صرف کام کی باتیں لکھتے ہیں۔

مکاتیب کی اہمیت

نیر و سید
پی۔ایچ۔ڈی اسکالر شعبہ اُردو یونیورسٹی آف جموں

ادبی مکاتیب اپنی داخلی کیفیات اور خصوصیات کے لحاظ سے دیگر مکاتیب سے ممتاز ہیں۔اوران کیفیات کو مکتوب میں اُجاگر کرنا ہر کاتب کے بس کی بات نہیں۔اس کے لیے اعلی ادبی مذاق کو جن بنیادو پر اعتبار حاصل ہے وہی مکتوب نگاری کے رہنما اصول بن گئے ہیں۔

اس سلسلے میں پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر رشید احمد صدیقی ،ڈاکٹر سید عبداللہ، مولوی عبدالحق ،اور ڈاکٹر خورشید الاسلام وغیرہ کی تحریریں ہماری رہنمائی کرسکتی ہیں۔ پروفیسر خورشید الاسلام کا خیال ہے کہ ''خط لکھنا ایک فن ہے'' بلکہ رشید احمد صدیقی نے تو اسے ''فنونِ لطیفہ'' میں جگہ دی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس فن پر دسترس کے لیے ویسی ریاضیت کی ضرورت نہیں جیسی دوسرے فنون کے لیے لازمی ہے۔

اچھے اور معیاری مکتوبات حسنِ اتفاق سے وجود میں آتے ہیں۔اس کے لیے سعی نہیں کی جاتی، بلکہ ان کا تعلق زیادہ ذہن کی وقتی حدود سے ہوتا ہے اور ایسے خطوط ذہنی سطح سے منتقل ہوکر تحریری شکل میں رونما ہوتے ہیں۔بقول رشید احمد صدیقی۔''خط لکھا نہیں جاتا بلکہ خود تحریر ہوتا ہے اور لکھنے والے کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اسے لکھے۔مکتوب کی

سب سے بڑی خوبی اس کی قطعیت ہے۔'' یہ ضروری ہے کہ مکتوب نگار جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ باآسانی ترسیل کے مراحل سے گزر کر مکتوب الیہ تک پہنچ جائے۔

خط کی ایک خوبی جزئیات نگاری بھی ہوتی ہے۔ جزئیات میں وہ ادیب کامیاب ہوسکتا ہے جسے زندگی سے محبت ہو اور جس نے زندگی کے واقعات کا محض ایک تماشائی کی طرح نہیں بلکہ ایک خاص نقطہ نظر سے مشاہدہ کیا ہو۔ مکتوب کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں محبت و موانست پائی جائے۔ اس عمل میں یہی وجہ ہے کہ انسانی زندگی کے وہ سبک، دلکش اور نازک پہلو، جو اس کے بلند کارناموں میں ظاہر نہیں ہوتے لیکن مکتوبات میں نمایاں ہو جاتے ہیں۔

علما کے نزدیک مکتوب کو زندہ رکھنے والا سب سے بڑا عنصر اس کا دلچسپ اندازِ بیان ہوتا ہے۔ خط میں شخصی جذبے کا استعمال کچھ اس انداز میں ہو کہ شخصی ہونے کے باوجود اس کی حیثیت ہمہ گیر انسانی ہو۔ اس میں ایسی باتیں ہوں جو عام انسانی جذبات کی اپیل کر سکیں اور ایسے مکتوبات کی دلچسپی اور دیرپا مقبولیت میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اردو میں اس کی مثال صرف غالبؔ کے خطوط میں پائی جاتی ہے۔

مکتوبات کی خوبی کے سلسلے میں بنیادی چیز اس کی لطافت ہوتی ہے۔ مکتوب کا مفہوم کچھ بھی ہو، غم والم، تلخی و ناگواری، شکوہ و شکایت، ہجر و وصال یا ضروریاتِ زندگی کے مادی پہلوؤں کی کاروباری باتیں، لیکن یہ سب اچھے مکتوب نگار کے یہاں کچھ ایسے انداز میں بیان ہوتی ہے کہ ایک خوشگوار اور لطیف کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ادبی مکتوب شغل کی چیز نہیں، شوق کی متاع ہے۔ مکتوب اس بات کو ذہن میں رکھ کر نہیں لکھے جاتے کہ وہ ادبی شکل ختیار کریں، لیکن بعض لوگوں کے مکتوب بے ساختگی، بے تکلفی اور طرز ادا کی وجہ سے اعلیٰ مقام حاصل کر لیتے ہیں۔

بقول ڈاکٹر سید عبداللہ۔

''خط نگاری خود ادب نہیں ،مگر اس کو خاص ماحول ،خاص مزاج ،استعداد اور خاص فضا میسر آ جائے تو یہ ادب بن جاتی ہے۔خط کو ادب بنانے کا کام بہت مشکل ہے ۔یہ شیشہ گری ہے بلکہ اس سے بھی نازک تر۔''

مکاتیب عام طور پر اشاعت کی غرض سے نہیں لکھے جاتے ،مکتوب نگار زیادہ تر معلومات غیر ارادی طور پر پیش کرتا ہے اوران میں کسی قسم کی آمیزش نہیں ہوتی ۔لکھنے والا کسی خاص مقصد کے تحت کوئی خاص نتیجہ برآمد کرنے یا کوئی خاص تعصب وتاثر پید اکرنے کے لئے ان معلومات کو تج کر کے اور حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش نہیں کرتا ہے ۔اس کی فراہم کردہ معلومات بے ساختہ ہوتی ہیں ۔اس لئے یہ مستند ہوتے ہیں ۔مکتوبات تمام اصنافِ ادب میں سب سے زیادہ شخصی یا نجی ہوتے ہیں اوراس میں شخصیت کا پرتو پوری طرح منعکس ہوتا ہے ۔اُردو ادب کے ممتاز نقاد پروفیسر آل احمد سرور فرماتے ہیں۔

''ادب میں تازگی ،لذت ،سچائی اور زندگی ،شخصیت کی گرمی سے بے جان الفاظ منہ سے بولنے لگتے ہیں اوراقبال کے الفاظ میں نالہ سے سرورِ مئے اور شیشے کی صراحی میں شمشیر کی تیزی ملنے لگتی ہے۔''

(تنقیدی اشارے)

انیسویں صدی کی نفسیاتی موشگافیوں نے ادب کو بے حد متاثر کیا ہے ۔اب ادب پارے انفرادی حیثیت یا محض کسی فن کار کی ذہنی اختراع تک محدود نہیں ہوتے بلکہ ان پر تخلیق کار کی ذات اور ماحول کے گہرے نقوش پائے جاتے ہیں ۔اس نقطہ ِ نظر کی ادبی افہام وتفہیم میں مکاتیب اہم رول ادا کرتے ہیں۔

مکتوب ایک آدمی کو دوسرے آدمی سے دور دراز رہنے کے باوجود قربت کا احساس دلاتے ہیں ۔مکتوب نگارا پنے دل کی بات کہتا ہے جس سے اس کے ذہن کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے ۔فکر کی فضا کا علم ہوتا ہے اور اس کی طبعیت کا پتہ چلتا ہے ۔مکاتیب کبھی تاریخ کی ترتیب وتدوین میں مورخ کی مدد کرتے ہیں تو کبھی اس میں رپورتاژ کی خوبیاں پیدا ہوتی ہیں اور وہ کبھی روز نامچے کے فرائض انجام دیتے ہیں ،کبھی واقعات سناتے ہیں تو کبھی کہانی کا لطف عطا کرتے ہیں اور کبھی سانحات اور واقعات سے آگاہ کرتے ہیں۔

مکتوب سوانح نگاری کے بہترین ماخذ ہوتے ہیں مکتوب نگار کے خاندانی حالات، اس کی زندگی کے بیشتر واقعات ،اس کے عقائد ونظریات ،اس کی سیرت وشخصیت کا پورا علم خطوط سے معلوم ہوتا ہے۔وہ اپنے پیش رواور ہمعصر فنکاروں کے بارے میں کیارائے رکھتا ہے۔؟ یہ سب بہت واضح انداز میں مکتوبات سے ظاہر ہوتا ہے۔

مرزا غالبؔ کے سوانح نگاروں نے ان کے خطوط کو بنیاد بنا کر بعض اہم نکتے وضع کئے ہیں ۔مولانا عبدالماجد دریا بادی کی دو کتابیں ''حکیم الامت اور محمد علی کی ذاتی ڈائری'' کے چند اوراق میں سوانح نگاری کے جو کرشمے نظر آتے ہیں، وہ سب مکاتیب کی بدولت ہیں ۔یہ مولانا کا کمال ہے کہ خطوط سے استفادہ کرتے ہوئے ''ذاتی ڈائری'' میں مولانا محمد علی کے حالات اور نجی واقعات کو موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کتابوں کی اہمیت اس لئے ہے کہ کوئی بھی سوانح نگار یا پارکھ ان شخصیتوں کی افہام و تفہیم کے ضمن میں انھیں نظر انداز نہیں کرسکتا۔

ایک اچھے مکتوب نگار کا قلم ایسی گل افشانیاں کرتا ہے کہ مکاتیب میں تنوع ، رنگارنگی اور بوقلمونی پیدا ہو جاتی ہے ۔اچھے مکاتیب زماں ومکاں کی قیود سے آزاد ہو کر عہد کے انسان سے تعلق قائم کر لیتے ہیں ۔ جہاں تاریخ خاموش ہوتی ہے وہاں

مکتوب گویا ہوتے ہیں ۔۱۸۵۷ء کے غدر سے متعلق مرزا غالبؔ کے خطوط ایک دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں ہر چند کہ تاریخ کی کتابیں موجود ہیں اور ہماری معلومات میں اضافہ بھی کرتی ہیں لیکن ان کتابوں سے لوگوں کے ردِعمل کا اندازہ نہیں ہوتا۔ دہلی کی تباہی نے ایک شاعر کے قلب و ذہن کو کس طرح متاثر کیا اور خود شاعر کے کیسے تجربات تھے، کن اذیتوں سے وہ گزرے، ان سب کی تفصیلات ہمیں غالب کے خطوط میں مل جاتی ہے۔

مکاتیب محض موضوعات کے لحاظ سے اہم نہیں ہوتے بلکہ فکر و اسالیب کے نقطہ ِ نظر سے بھی اہمیت کے حامل ہیں رجب علی بیگ سرور اور غلام غوث بے خبر کے خطوط میں بھی مضامین کا تنوع پایا جاتا ہے۔ان میں اپنے عہد کی سچی تصویریں ملتی ہیں۔ زبان کا چٹخارہ، لہجے کا خلوص اور اسلوب کی رفعت نے اس میں جان ڈال دی ہے۔

ہر چند کہ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے دور میں مکتوب نگاری کی روایت ماند پڑتی جارہی ہے تاہم ددورِ قدیم اور موجودہ عہد کی تاریخ وتہذیب کے امانت دار مکاتیب ہی ہیں۔اس لئے ان کی ادبی اہمیت اور افادیت سے کسی بھی صاحبِ نظر اور صاحبِ ذوق کو انکار ممکن نہیں۔

ابوالکلام آزاد کی خطوط نویسی کا پس منظر

روضیہ تبسم
شعبۂ اردو جموں یونی ورسٹی

خط کا لکھنا اور پڑھنا ایک سماجی عمل ہے انسان سماجی حیوان ہے انسان سماج سے علاحدہ رہ کر زندگی بسر نہیں کرسکتا۔ ہر انسان کے دوسرے انسانوں سے مختلف نوعیت کے روابط ہوتے ہیں۔ انسانوں رشتوں کی ابتداء گھر اور خاندان سے ہوتی ہے پھر دوستی کا رشتہ بنتا ہے اس کے علاوہ زندگی کے مختلف شعبوں میں الگ الگ رشتے قائم ہوتے ہیں جیسے استاد اور شاگرد کا رشتہ، کارخانے کے مالک اور مزدور کا رشتہ، دفتر میں اعلیٰ عہدہ دار اور ماتحت کا رشتہ، تاجر اور خریدار کا رشتہ، رسالے اور ایڈیٹر اور ادیب یا قاری کا رشتہ ایسے بہت سے رشتے ہیں جنھیں قائم رکھنے اور مستحکم بنانے میں خط و کتابت اور مراسلت کا بھی داخل ہوتا ہے۔

جب کسی وجہ سے لوگ ایک دوسرے سے مل نہیں سکتے تو وہ خطوط کے ذریعے ربط پیدا کرتے ہیں خطوط ملاقات کا بدل بن جاتے ہیں۔ اسی لیے خط کو آدھی ملاقات کہا جاتا ہے یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ خطوط نویسی کی ابتداء کب سے ہوئی جب تحریر کی ابتداء ہوئی تو یقیناً خطوط بھی لکھے گئے ہوں گے۔ قدیم زمانے میں خطوط کی ترسیل کے ذرائع نہیں تھے البتہ سلاطین اپنے قاصدوں کے ذریعے ارسال کرتے اور مختلف علاقوں کے حالات سے باخبر رہتے تھے۔ آہستہ آہستہ عام لوگ خطوط لکھنے لگے جس کے لیے ڈاک پہنچانے کے مختلف ذرائع استعمال کیے گئے۔ خط کی تعریف کرتے

ہوئے شپلے (Shiply) نے لکھا ہے کہ:

> ’’خط عام طور سے مکتوب نگار (پہلا آدمی) اور مکتوب الیہ (دوسرا آدمی) کے بیچ تبادلہ خیالات کا ذریعہ ہے۔‘‘

خطوط میں تمام جاندار اور بے جان اشیاء کو موضوع بحث بنایا جا سکتا ہے کبھی یہ محض استفسار کے جواب میں لکھا جاتا ہے تو کبھی دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے۔ کبھی اپنے دکھ اور شادمانی میں دوسروں کو شریک کرنے کے لیے اور کبھی ان آرزوؤں اور خوابوں کے اظہار کے لیے لکھا جاتا ہے جو شرمندہ تعبیر ہونے کے لیے مچلتے رہتے ہیں۔

فارسی اصناف ادب کی تقلید میں اردو میں مکتوب نگاری کا آغاز ہوا اور دیگر اصناف ادب کی طرح اردو میں مکتوب نگاری کے اولین نمونے بھی دکن ہی میں ملتے ہیں لیکن قطعی طور پر یہ بتانا مشکل ہے کہ پہلا خط کب اور کس نے تحریر کیا تھا۔ ڈاکٹر عبدالطیف اعظمی کے غیر مطبوعہ مقالے ’’اردو مکتوب نگاری‘‘ کے حوالے سے پروفیسر عنوان چشتی نے لکھا ہے کہ اردو کا پہلا خط ۶ دسمبر ۱۸۲۲ء میں تحریر کیا گیا تھا چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

> ’’اردو کا پہلا دستیاب شدہ خط ۶ دسمبر ۱۸۲۲ء کا ہے جس کے کاتب والا جاہ بہادر نواب کرناٹک کے بیٹے حسام الملک بہادر ہیں انھوں نے یہ خط اپنی بڑی بھابی نواب بیگم صاحبہ کو لکھا تھا۔‘‘

اردو کے قدیم ترین خطوط نظم کی ہئیت میں ملتے ہیں۔ شیر محمد خان ایماںؔ کے خطوط کے ایک ’’نامہ منظوم‘‘ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ۱۸۰۶ء سے قبل بھی اردو نظم و نثر میں مکتوب نگاری کی روایت رہی ہے۔ عام طور پر غالبؔ کو اردو میں مکتوب نگاری کا موجد کہا جاتا ہے لیکن تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ غالبؔ سے پہلے اردو میں مکتوب نگاری کی روایت موجود تھی۔ یہ اور بات ہے کہ ان مکاتیب میں خطوط غالبؔ کی سی سادگی اور بے تکلفی نہیں تھی۔

غالبؔ سے پہلے اردو میں مکتوب نگاری کے سلسلے میں دو نام اہمیت کے حامل ہیں

ایک رجب علی بیگ سرورؔ اور دوسرا نام غلام غوث بیخبرؔ کا۔ اردو میں مکتوب نویسی کا ارتقاء مرزا اسد اللہ خان غالبؔ ہیں۔ غالبؔ کا شمار جدید اردو نثر کے معماروں میں ہوتا ہے۔ غالبؔ کے ساتھ ساتھ دوسرے شعراء نے بھی خطوط لکھے جن میں حالیؔ، شبلیؔ، مہدی افادی، ڈاکٹر سر محمد اقبال اور ابوالکلام آزاد وغیرہ نے مکتوب نگاری کی روایت کو بام عروج پر پہنچایا لیکن خط میں نئے طرز کی ایجاد کا سہرا صحیح معنوں میں غالبؔ کے سر ہے غالبؔ کے مکاتیب کی اہمیت اس لیے ہے کہ ان کے خطوط میں ہمیں وہ فضا ملتی ہے جس میں غالبؔ کا عہد و معاشرہ سانس لے رہا تھا اس اعتبار سے یہ خطوط ادب، تاریخ اور تہذیب کا مرقع ہیں۔

حالیؔ کے بعد سر سید، شبلیؔ اور آزاد نے مکتوب نگاری کو بلند مقام پر پہنچایا۔ سر سید کے خطوط میں ان کی علمی و ادبی تحریک اور شخصیت کے پرتو جلوہ گر ہیں۔ نثر کی طرح ان کے مکاتیب میں بھی مدعا اور مقصدیت موجود ہے۔ شبلیؔ اپنے طرز اور تیور سے پہچانے جاتے ہیں حالیؔ اپنی سادگی، نرمیت اور محبت کا رنگ خطوط مین دکھاتے ہیں۔ اقبالؔ کا فکری اور علمی اجتہاد خطوط میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد سیاسی اور فکری بصیرت سے اپنے مکاتیب کا ڈھانچہ تیار کرتے ہیں۔ منفرد اسلوب میں وہ معاشرے اور اپنے عہد کا خوبصورت نقشہ کھینچتے ہیں۔ مولوی عبدالحق کے خطوط ان کی علمی زندگی کا آئینہ ہیں۔ مولانا کا شمار اردو کے صاحب طرز ادیبوں میں ہوتا ہے وہ عربی اور فارسی کے عالم تھے اور اردو ان کی مادری زبان تھی اردو، عربی اور فارسی تینوں زبانوں میں اُن کی اردو نثر بہت رواں دواں اور برجستہ ہے اور اس میں دریا کا سا بہاؤ ہے ابتداء میں انھوں نے بہت آسان زبان میں مضمون لکھے اور دوستوں کو خطوط لکھے۔ ایک زمانہ میں نثر میں مولانا کی زبان بہت مشکل تھی وہ عام طور سے عربی اور فارسی کے لیے ایسے الفاظ استعمال کرتے تھے جن

سے عام پڑھے لکھے لوگ واقف نہیں ہوتے تھے۔اُن کے مضامین کی زبان جوہفت روزہ رسالوں ''الہلال''اور''البلاغ'' میں شائع ہوتے تھے بہت ادق، پیچیدہ اور نا قابل فہم ہوتی تھی۔یہی وجہ ہے کہ اُن کی کتابوں ''تذکرہ''''سوانح سرمد'' اور ''ترجمان القرآن'' وغیرہ میں اُن کی نثر ہے۔دراصل جس زمانے میں یہ تحریریں قلم بند ہوئی تھیں۔مولانائے اسلام یعنی اتحاد اسلامی تحریک کے علم بردار تھے۔غالبؔ اور مولانا آزاد کے خطوط میں بنیادی فرق یہ تھا کہ غالبؔ کے خطوط میں زندگی اپنی ہمہ رنگ رعنائیوں کے ساتھ بکھری ہوئی نظر آتی ہے جب کہ ''غبار خاطر'' کے خطوط کے موضوعات علمی مسائل کے مختلف پہلوؤں پر مبنی ہیں اس طرز تحریر میں بھاری بھرکم الفاظ، تصنع، علمیت کے اظہار کی کوشش اور خود نمائی کا جذبہ نظر آتا ہے۔

''الہلال''اور''البلاغ''میں مولانا کی شخصیت ایک مصلح اور رہنما کی حیثیت سے ابھرتی ہے۔اس لیے ہفت روزہ رسالوں میں مولانا کی نثر میں خطابت یا تقریر کا اندازہ زیادہ ہوتا ہے دوسری نثری کتابوں میں مولانا کی علمی قابلیت ، ذہانت اور دانشوری جلوہ گر نظر آتی ہے۔مولانا کی نثر کا یہ انداز ہمیشہ یکساں نہیں رہا۔وہ وقت اور موقعوں، مصلحتوں کے مطابق اپنی نثر کا رنگ بدلتے رہتے تھے۔ادبی زندگی کے آغاز میں مولانا کی نثر کی زبان میں سادگی ہے اور وہ مشکل الفاظ سے گریز کرتے تھے۔

مولانا کے ''الہلال'' کی انقلابی تحریروں نے برطانوی حکومت کی بنیادیں ہلانی شروع کر دیں تھیں برطانوی حکومت ''الہلال'' میں شائع ہونے والی مولانا آزاد کی تحریروں سے خائف ہوگئی۔۷ اپریل ۱۹۱۶ء کو حکومت بنگال نے ڈیفنس آرڈینس کے تحت مولانا کا بنگال سے نکلنے کا حکم دے دیا۔مولانا کلکتہ چھوڑ کر رانچی چلے گئے کچھ عرصے کے بعد انھیں اسی شہر میں نظر بند کر لیا گیا اس شہر میں مولانا کو فرصت اور ذہنی سکون ملا۔انگریز حکومت کی نظر بندی میں رانچی میں مولانا کا قیام سزا تھی جو انھیں

بغاوت کے الزام میں دی گئی تھی مولانا کے لیے یہ بہت بڑی نعمت تھی بقول اُن کے ایک مدت سے جس فراغ خاطر اور آزادی فکر وعمل کو طبعیت ڈھونڈ رہی تھی وہ ملی بھی تو جلاوطنی اور نظر بندی کی شکل میں۔ بقول مولانا ابوالکلام آزاد:

''دنیا نے جلاوطنی اور نظر بندی کی خبر سنی اور دل نے خلوت گزینی وگوشہ گیری کی دولت وسعادت پائی۔''

اسی شہر میں مولانا کی قابل ذکر تصانیف ان کی آپ بیتی ''تذکرہ'' اور ''ترجمان القرآن'' وجود میں آئیں ان دونوں کتابوں کی نثر مشکل، پیچیدہ اور ادق ہیں عام پڑھنے والوں کے لیے ان کتابوں کے بعض حصے نا قابل فہم ہیں۔مگر حیرت کی بات ہے کہ اسی زمانے نے اپنے ایک دوست مولوی محمد ابراہیم کو جو خطوط لکھے ہیں جنھیں جمشید قمر نے اپنی کتاب مولانا آزاد کا قیام رانچی ''احوال وآثار'' میں نقل کیا ہے۔سادگی بیان کی بہت اچھی مثال ہیں جس میں عربی اور فارسی کے اجنبی اور مشکل الفاظ ہیں نہ عبارت کی پیچیدگی ہے اور نہ ہی عربی اور فارسی کے اشعار ہیں۔

مولانا نے ذاکر صاحب کے نام ایک خط لکھا ہے جس کی عبارت بہت صاف اور سلیس ہے یہ خط نثر کی سادگی کی بہت اچھ مثال ہے:۔

''۲ جنوری ۱۹۲۰ء

حُبی فی اللہ! اسلام علیکم

خط پہنچا! اخلاص احمد صاحب وغیرہ کا یار آیا تھا۔اللہ کو جو منظور ہوگا ہو رہے گا اس میں کاوش بے سود ہے آپ نے لکھا ہے کہ جب تمہارا جلد کلکتہ آنا مطلوب ہے تو پھر مولوی اکرام کے یہاں تعلق کیوں کروں؟ بلا شبہ میرے لیے نہایت خوشی کا موجب ہو اگر براہ راست آپ کے لیے کسی بہتر سامان کا ذریعہ ہوسکوں لیکن یہ چیزیں اصل کار مقصد میں داخل نہیں ہیں محض وسیلہ معشیت ہیں جہاں ہوں ایک ہی حکم میں داخل ہیں۔

علاوہ بریں بالغرض اگر میں کلکتہ آ بھی گیا تو وہاں آپ کے لیے بالفصل کوئی اچھی صورت ذہن میں نہیں۔ پریس میں کوئی ایسا کام نہیں جس کو آپ کیلئے منتخب کروں نہیں کہا جاسکتا کہ پریس کے کام کی جو حالت کیا ہوگی۔موجودہ حالت میں صرف ایک ''تذکرہ'' کے لیے مسٹر فضل دین نے آپ کو بلا لیا۔ چوں کہ وہ اپنے طور پر کام کررہے ہیں۔اس لیے میں نے دخل نہیں دیا ورنہ تو آپ کیلئے کام کوئی کام تھا۔نہ دفتر کیلئے واقعی ضرورت تھی۔ برخلاف اس کے مولوی اکرام اخبار روزانہ نکال رہے ہیں نام اور ترقی کا بہت اچھا موقع ہے آدمی ہم مشرب اور خوش خیال ہیں۔

بحالت موجودہ آپ کے لیے اس سے بہتر کلکتہ میں اور کوئی کام نہیں ہوسکتا۔تنخواہ بھی امید ہے مناسب ہوگی۔آپ کو ذاتی طور پر اخبار کے کام سے دلچسپی ہے۔ان تمام موجودہ کی بنا پر کسی طرح مناسبت نہیں کہ اس عمدہ موقعے کو ہاتھ سے جانے دیں فوراً اختیار کرلیں انشاءاللہ موجب ملاح ہوگا۔

میں اگر کلکتہ چلا بھی گیا جب بھی بحالت موجودہ مجھ کو دوسری مشغوبتیں درپیش ہوں گی اور مالی مشکلات کی وجہ سے پریس میں کوئی گنجائش ایسی نہ نکلے گی کہ مختلف قسم کے کام پیش آئیں پس جو صورت سامنے ہے اُسے ضائع نہ کیجئے۔

بڑی اچھی بات اس میں ہوگی کہ آپ کا قیام کلکتہ ہی میں رہے گا چوں کہ............اس لیے جو اصلیت تھی لکھ دی گئی ہے۔''

(ابوالکلام آزاد کا قیام رانچی۔۔احوال وآثار)

پروفیسر شہاب عنایت ملک ۔ایک صحافی ،ایک ادیب

نصرت بانو
پی ایچ ڈی اسکالر
برکت اللہ یونیورسٹی

پروفیسر شہاب عنایت ملک ریاست اور ملک کے ممتاز اساتذہ اور بلند پایہ ادباء، ناقدین، محققین، نثر نگاروں اور بے باک صحافت کاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ۱۹۹۵ء میں جموں یونی ورسٹی کے شعبہ اُردو میں تعینات ہونے کے بعد اپنی محنت، لگن، ذہانت ، بردباری، اعلیٰ کارکردگی اور تدریسی، تخلیقی اور تنظیمی صلاحیتوں کی بدولت اس شعبے کے صدر مقرر کئے گئے اور اس جلیل القدر عہدے کے علاوہ وہ جموں یونی ورسٹی کے سنٹر فار پروفیشنل سٹڈیز ان اُردو کے ڈائریکٹر، کشتواڑ کیمپس جموں یونیورسٹی اور شعبہ اُردو جموں یونیورسٹی کے صدر کے عہدے پر فائز رہ کر شاندار خدمات انجام دے چکے ہیں۔ موصوف فی الوقت دوسری مرتبہ شعبہ اُردو کے صدر کے طور پر فرائض انجام دے رہے ہیں اور ساتھ میں ڈین فیکلٹی آف آرٹس کی ذمہ داری بھی بخوبی نبھا رہے ہیں۔

شہاب صاحب کے تنقیدی، تحقیقی مقالے اور بصیرت افروز مضامین ریاستی اور ملکی سطح کے معتبر اور مقتدر جرائد، رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں اور داد و تحسین حاصل کرتے آئے ہیں۔ شعراء، ادباء اور دیگر قلمکاروں کی ادبی خدمات اور سوانح پر قلمبند

کئے گئے ان کے سینکڑوں تذکرے اور تنقیدی نوعیت کے مقالے ریاستی اور ملکی سطح کے اخباروں اور مجلّوں میں شائع ہوتے آئے ہیں جن کی ہر سطح پر پذیرائی کی جاتی رہی ہے۔ پروفیسر شہاب کے اُردو اخبارات کیلئے متفرق سیاسی اور سماجی مسائل پر مضامین لکھے ہیں اور ان میں بے باکی کا عنصر اتم درجہ کا پایا جاتا ہے۔ ان کی کئی دیگر نثری کاوشیں کتابوں کی صورت میں منظر عام پر آچکی ہیں جن کی بظاہر سادہ مگر معیاری اور فنی بصیرت سے لبریز طرزِ نگارش، ان کے فکر وفن کی گہرائی اور لسانی پختگی کے علاوہ اُردو زبان وادب کے ساتھ ان کی گہری وابستگی، والہانہ محبت اور فریفتگی کی آئینہ دار ہے۔ اس حوالے سے وہ ایک جرأت مند، بے باک اور اصول پرست صحافت نگار کے طور پر اپنا لوہا منوانے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ وہ دیانتدارانہ، شفاف اور غیر جانبدارانہ صحافت کے پاسدار ہیں اور بسا اوقات ان کی صداقت اور دیانت پر مبنی ہنگامہ خیزی موجودہ دور کے کچھ متعصب اور جانبدار قسم کے صحافیوں یا الیکٹرانک میڈیا کے ایسی فکر کے حامل اینکروں اور تجزیہ نگاروں کے مباحث یا تحریروں کے خلاف ایک جہاد کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس کے علاوہ اُردو زبان وادب کے مخالفین اور جھوٹے دعویداروں کے خلاف ان کے قلم سے ایسے تیروں کی برسات ہو جاتی ہے جو ان کی ریاکاری کا پول کھول کر ان کی ضمیروں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ اعلیٰ انسانی اقدار کی پاسبانی اور تخلیقِ ادب میں بلند معیاری، رواداری، قومی یکجہتی اور امن وشانتی کے اصولوں کو قائم رکھنے کے لئے ان کی تقریری اور تحریری کاوش قابل داد ہیں۔ ایک صاحبِ فن کی حیثیت میں ان کے تنقیدی اور تجزیاتی مضامین بہت معیاری اور غیر جانبدارانہ ہوتے ہیں جن کے اسلوب اور بیانیہ کی پُرکاری، زبان کی شیرینی اور سادگی ان میں چھپے ہوئے ایک کہنہ مشق اور پختہ قلمکار کی غماز ہے۔ انہوں نے بحیثیت اُستاد تحقیقی، تنقیدی اور تدریسی عمل کے ایک اعلیٰ اور معیاری سلسلہ کو نہ صرف

قائم رکھا ہے بلکہ اسکی ترویج اور فروغ کے لئے موثر اور فکر انگیز کوششیں جاری رکھی ہوئی ہیں ۔ان کے شعبہ میں ایک ذہین، حساس اور باشعور طبقہ کی سیرتوں کی تعمیر وتشکیل ہورہی ہے جو اُردو زبان وادب کیلئے ہر سطح پر ایک روشن مستقبل کی ضمانت ہے۔

ریاست اور اندرونِ ملک قریباً ہر یونی ورسٹی کے شعبہ اُردو میں ان کی رُکنیت اور ان کی ادبی کانفرنسوں، سیمیناروں وغیرہ میں شرکت نہ صرف ان کی ذات قابلیت اور ہردلعزیزی کی مظہر ہیں بلکہ جموں یونی ورسٹی کے شعبہ اُردو کی شہرت اور عظمت کی بھی آئینہ دار ہیں۔یہی وجہ ہے کہ مذکورہ شعبے میں منعقد کی جانے والی ہر کانفرنس، سیمی نار یا مشاعرے میں ریاست اور ملکی سطح کے قلمکاروں وغیرہ کے علاوہ بیرونِ ملک کے معروف ادیب، قلمکار اور شعراء شرکت کرنا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔شہاب نے رسؔا جاودانی میموریل سوسائٹی قائم کرکے اس کی شاخیں نہ صرف ریاست کے کچھ مقامات پر قائم کی ہیں بلکہ ملکی سطح کے علاوہ اسکی ایک شاخ کچھ سال پہلے پاکستان میں بھی قائم کی ہے ۔ ان اقدامات سے ریاستی اور ملکی اور بیرونِ ملک سطح کے اُردو دانشوروں کے باہمی روابط، اشتراک اور تال میل سے اُردو زبان وادب کی نئ جہتوں اور رجحانات کی تفہیم میں کافی مدد حاصل ہورہی ہے جس کے مفید اور موثر اثرات نئے ادیبوں اور یونیورسٹی میں زیرِتعلیم طلباء اور اساتذہ پر نمایاں طور پر پڑ رہے ہیں۔شہاب نے اپنے شعبہ میں ''تسلسل'' نام سے موسوم ایک ششماہی مجلّہ اجراء کرکے ایک بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے جس میں مختلف جامعات کے بلند مرتبت ادباء وشعراء کے رشحاتِ قلم کے علاوہ ریاست جموں وکشمیر کے ممتاز قلمکاروں اور دانشوروں کی نگارشات شامل کی جاتی ہیں اور قدآور شخصیات کے نمبرات بھی شائع ہوئے ہیں جس کی نمایاں مثالیں فیض، سرسید، منٹو، رسا جاودانی وغیرہ نمبرات ہیں جن میں ملک کی مقتدر ادبی شخصیات نے بہت اہم مقالے اور مضامین پیش کئے ہیں۔

شہاب صاحب نے وادیٔ چناب کی پُراسرار وادیوں اور بلند و بالا کوہساروں میں گوشہ نشین ایسے بے شمار شاعروں، ادیبوں، نثر نگاروں کو ڈھونڈ نکال کر ان کی حیات اور ادبی خدمات پر سیر حاصل تبصرے، مقالے اور مضامین لکھ کر یہاں کے مختلف ذرائع ابلاغ، اخبارات اور جرائد کے ذریعہ انہیں ریاست جموں وکشمیر اور بیرون ریاست کے اہلِ قلم حضرات سے متعارف کروا کر ایک قابل تحسین کارنامہ انجام دیا ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس ادبی کہکشاں میں رسؔا جاودانی کے علاوہ دیگر چند ایک قلمکار ہی اندرون و بیرون ریاست متعارف ہو چکے تھے لیکن ان ستاروں کی ایک بڑی تعداد گمنامیوں کے تاریک اندھیروں میں روپوش ہوتے ہوئے شہاب جیسے محقق کا انتظار کر رہے تھے جس نے انہیں اپنی قلمی کاوشوں کے جادو میں بیرونِ وادی نُور متعارف کرانے کا بیڑا اٹھایا۔ اتنا ہی نہیں جموں یونی ورسٹی کے شعبہ اُردو میں اس وادی کے کئی توجہ طلب ادباء، شعراء اور قلمکاروں کی حیات اور ادبی کارناموں پر اپنے اسکالرس کے ذریعہ ایم فل اور پی ایچ ڈی ڈگریوں کیلئے ریسرچ کروانے اور ڈگریاں دلوانے میں انہوں نے ایک قابلِ تحسین کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ بصورتِ دیگر ان کی عدم موجودگی میں شاید کسی دوسرے صاحبِ صدر کی نظروں سے وہ اور ان کے ادبی کارنامے دُنیائے اُردو سے ابھی تک مخفی ہی رہتے۔

ریاست جمّوں وکشمیر میں اُردو صحافت کا آغاز

عبدالمجید
ریسرچ اسکالر شعبۂ اُردو جمّوں یونیورسٹی

ہمارے ملک ہندوستان میں نظامِ جمہوریت ہے اور جمہوریت میں میڈیا اور میڈیا کی آزادی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔اسی اہمیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے صحافت کو ڈیموکریسی کا چوتھا ستون کہا جاتا ہے۔ریاست جمّوں وکشمیر میں اُردو صحافت کی تاریخ ظلم و جبر کے خلاف ایک جدوجہد ہے۔دراصل حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی قوم،ملک یا معاشرے کے سماجی ،سیاسی اور ثقافتی حالات و واقعات کو جاننے کے لیے جو ذرائع مثبت ثابت ہوتے ہیں ان میں صحافت اور ادب بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔اس لیے صحافت کو ملک کے وجود کا چوتھا ستون کہا جاتا ہے۔صحافت سماج کے خارجی واقعات و حادثات سے عبارت ہے جبکہ ادب فرد اور سماج کے داخلی واردات و کیفیات سے عبارت ہے۔اگر صحافت میں داخلیت کا عنصر آجائے تو صحافت ادب کے قریب پہنچ جاتی ہے اور ادب میں خارجیت آجائے تو ادب صحافت کے قریب تر ہو جاتا ہے ۔ادبی صحافت کا اندازہمیں ابوالکلام آزاد کے ’’الہلال والبلاغ‘‘ میں شامل تحریروں سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

جہاں تک ریاست جمّوں وکشمیر میں صحافت کا تعلق ہے تو ریاست میں ادب نما

صحافتی تحریروں کی مثالیں شمیم احمد شمیم کے اخبار ''آئینہ'' میں شامل تحریروں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ریاست جمّوں وکشمیر کے شاعروں اور ادیبوں نے اپنے درپیش تمام مسائل کو سامنے لانے کے لیے اخبارات کے لیے جدوجہد کی ۔انیسوں صدی کے آخر اور بیسوں صدی کے اوّل تک لاہور، امرت سر سے نکلنے والاے اخبارت کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا ۔اس وقت ریاست جمّوں وکشمیر سیاسی ،سماجی اور اقتصادی بہران سے گزری بھی ، ان ہنگامی حالات میں صحافت ہی عوامی مسائل کی رہنمائی کا فریضہ ایمانداری کے ساتھ انجام دے رہی تھی ، کیونکہ ایماندارای اور غیر جانبداری صحافت کی بنادی شرط ہے۔

کشمیر کے حوالے سے ریاستی اور ملکی صحافت کی مثالیں بھری پڑی ہیں۔ ریاست جمّوں وکشمیر میں ابتدا سے ہی اُردو اخبارات نے یہاں کے عوام کے مسائل اور حقائق کے حوالے سے مثبت کردار ادا کیا ہے ۔مگر کچھ ایسے اخبارات بھی تھے جنھوں نے حکومت کی حمایت کی اور بعض اخبارات نے کھل کر ریاست کی تحریکِ آزادی میں عوام کی حمایت کی اور حکمران طبقے کی مخالفت ۔تحریکِ آزادی کے دوران اخبارات کی ضرورت کا نقشہ شیخ محمد عبداللہ ''آتش چنار'' میں یوں کھینچتے ہیں۔

> '' ہم نے اپنی آواز بلند کرنے کی ضرورت کو اور زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کیا لیکن سوال یہ تھا کہ اس آواز کی نشر و اشاعت کے لیے کیا ذریعے اختیار کیے جائیں۔ اس زمانے میں تحریر وتقریر کی آزادی ایک خیالی چیز کے برابر تھی۔ ریاست سے مسلمانوں کا کوئی اخبار شائع نہ ہوتا تھا ۔البتہ جمّوں سے ایک ہندو اخبار'' رنبیر'' چھپتا تھا جو مہاراجہ کی قصیدہ خوانی اور اس کے ظالمانہ نظام کی تعریف کر کے اپنے وجود کو قائم کرنے کی سعی کرتا

رہتا تھا۔لاہور سے کچھ ایسے اخبارات ضرور شائع ہوتے تھے جن کے مدیر مسلمان تھے۔لیکن اگر وہ دوبارہ کشمیر کے خلاف ذرا سا منھ کھولتے تو ان کا فوراً ریاست میں داخلہ بند کر دیا جا تا ۔ایک کشمیری نژاد بزرگ محمد دین فوق جنھوں نے ۳۰ میں کشمیر کے بارے میں بہت سی تاریخی کتابیں لکھنے کے سلسلے میں خاصہ نام کمایا۔اور ایک ہفتہ وار اخبار لاہور سے نکالا کرتے تھے جو کبھی کبھی نچی سی آواز میں کشمیری مسلمانوں کی شکایت کی طرف حکومت کی توجہ متبادل کرتا تھا۔''

اس اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ڈوگرہ حکمران کشمیری عوام کی بدحالی اور ظلم و جبر اور زیادتوں کو کشمیر سے باہر عام لوگوں تک ہرگز نہیں پہنچانا چاہتے تھے۔

ریاست جموں وکشمیر وزیر اعظم سر بینل جی (۳۹۔۱۹۳۸ء) میں اپنے عہدے سے استعفیٰ دے کر لاہور میں اخبار کے نمائندوں سے بات کرتے ہوئے واضح الفاظ میں کہا کہ۔

''جموّں وکشمیر ریاست بہت سی نا انصافیوں کا شکار ہے۔اس ریاست کی بڑی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے جو قطعی طور پر ناخواندہ ہیں۔یہ لوگ غربت اور افلاس کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور انہیں بالکل اندھے اور گونگے مویشوں کی طرح ہانکا جاتا ہے۔حکومت اور عوام کے درمیان کوئی رابطہ نہیں اور نہ ہی شکایت کا ازالہ کرنے کے لیے کسی قسم کا موقعہ فراہم کیا جاتا ہے۔۔۔۔اخبارات تقریباً مفقود ہیں۔عوام کی شرم ناک بدحالی ریاست کے تمام مسائل کی جڑ ہے۔اگر یہ لوگ بڑے سمجھ

داراوراچھے ہیں لیکن انہیں زندگی کا کوئی سکھ نہیں ملتا۔''

(انگریزی اخبار۔۱۵مارچ۱۹۳۹ء)

ریاست جمّوں وکشمیر سے چند نمائندہ اشخاص نے مہاراجہ ہری سنگھ کے دربار میں درخواستیں پیش کیں کہ ہمیں اخبار نکالنے کی اجازت دی جائے۔ان لوگوں میں محمد دین فوق، سالک رام سالک اور ملک راج صراف شامل تھے۔بلآخر۱۹۲۴ء میں ملک راج صراف کو اجازت دی گئی اور انھوں نے ''رنبیر'' جاری کیا۔مگر یہ اخبار ایک تعصب ثابت ہوا۔اس کے بعد ۱۹۳۱ء میں باضابطہ طور پر شیخ محمد عبداللہ کی قیادت میں ریاست جمّوں وکشمیر سے بہت سے اخبارات شائع ہونے لگے۔

ریاست جمّوں وکشمیر میں باضابطہ طور پر صحافت کا آغاز ''بدھیابلاس پریس'' اور'' سالک رام سالک پریس'' سے ہوتا ہے۔''بدھیابلاس پریس''جمّوں میں قائم تھا اور ''سالک رام سالک پریس'' سری نگر میں۔ان دونوں پریسوں نے ریاست میں اُردو اخبارات کی اشاعت کا بہترین انتظام کیا تھا۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک محمد دین فوق کے نام سے سامنے آتے ہیں۔انھوں نے اپنی تعلیم کے فوراًبعد علمی وادبی زندگی کا آغاز اُردو صحافت سے کیا تھا۔وہ بیس سال کی عمر میں اخبارات سے وابستہ ہو گئے تھے۔محمد دین فوق جن اخبارات سے وابستہ رہے ان میں' کوہ نور' ' اخبارِعام' 'صدائے ہند' 'اردو اخبار' اور'' آفتابِ پنجاب'' وغیرہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

اسی دوران وہ لاہور سے کشمیر آئے اور پریس قائم کرنے کی کوشش کرنے لگے ۔۱۹۰۴ء میں ڈوگرہ حکومت کو عرضی لکھنے کے ساتھ ساتھ یہ یقین دہانی بھی کی کہ حکومت کے بارے میں اس پریس سے کوئی بھی منفی رویہ نہ ہوگا مگر اس کے باوجود ان کو

ریاست جموں وکشمیر میں پریس قائم کرنے کی اجازت نہ دی گئی اس عرضی کا جواب ۱۹۰۷ء میں ڈوگرہ حکومت کی طرف سے ملا کہ موجودہ وقت میں ان کو ریاست میں کوئی پریس قائم کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی ۔۱۹۰۱ء میں محمد دین فوق نے لاہور سے'' پنجہ فولاد'' جاری کیا۔جس کو علامہ اقبالؔ، محمد دین فوق اور داغؔ نے بہت سہراہا۔داغؔ لکھتے ہیں۔

ہوا ہے پنجہ فولاد جاری
خریدارو نیا اخبار دیکھو

علامہ اقبالؔ لکھتے ہیں۔

پنجہ فولاد ایک اخبار ہے
جس سے سارا ہند واقف کار ہے
کون ہے اس بانکے پرچے کا مدیر
بات یہ بھی قابلِ اظہار ہے
نام ہے اس کا محمد دین فوق
عمر چھوٹی مگر ہوشیار ہے

محمد دین فوق نے ۱۹۰۶ء میں ایک رسالہ'' کشمیری میگزین'' جاری کیا۔ یہ رسالہ ۱۹۳۴ء تک پورے خلوص کے ساتھ کشمیریوں کا ترجمان رہا۔۱۹۳۲ء میں انھوں نے سری نگر سے ایک ہفتہ روزہ اخبار'' کشمیر جدید'' کے نام سے جاری کیا جو ۱۹۳۴ء میں بند ہوگیا۔ریاست جموں وکشمیر میں اردو زبان اور صحافت ان کی مرہون منت ہے۔

ریاست جموں وکشمیر کے بابائے صحافت ملک راج صراف نے'' رنبیر اخبار'' کی اشاعت ۲۵ جون ۱۹۲۴ء سے کی ۔ملک راج صراف کے تعلق سے پروفیسر شہاب عنایت ملک اپنے ایک مضمون میں الکھتے ہیں۔

''وہ حق گو اور نڈر صحافی تھے۔ایک صحافی میں جن صفات کا
ہونا لازمی سمجھا جا تا ہے وہ ملک راج صراف میں بدرجہ اتم
موجود تھیں۔''

(مضامین شہاب ص۵۲)

ملک راج صراف کا دوسرا رسالہ ''رتن'' ہے جو۱۹۳۴ء میں پہلی بار جموّں سے شائع ہوا۔مختصراً یہ کہ ملک راج صراف ریاست جموّں و کشمیر میں اردو صحافت کے حوالے سے ایک درخشندہ ستارے کی مانند رہے ہیں جنھوں نے بہت مشکلات اور مصیبتوں کے باوجود بھی ریاست میں اردو صحافت کی شمع روشن رکھی۔یہ محمد دین فوق اور ملک راج صراف کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج بھی اس ریاست میں اردو صحافت کا چراغ پوری شدومد کے ساتھ جاری وساری ہے۔

اُردو کے اہم مکتوب نگار

محمد ارشاق
ریسرچ اسکالر
شعبہ اُردو جموں یونیورسٹی

اُردو ادب میں مکتوب نگاری کو اہمیت حاصل ہے۔ دراصل خطوط انسان کی زندگی کا بہترین سرمایہ ہے۔ پرانے وقتوں میں انسان نے اتنی ترقی نہیں کی تھی جس کے ذریعے ایک دوسرے کے حالات وواقعات سے باخبر ہوسکے لیکن وقت بدلتا گیا اور انسان ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا آگے بڑھا۔ اس نے خط وکتابت کے ذریعے لوگوں سے میل جول کو آگے بڑھایا۔ اُردو میں خطوط کا زمانہ فورٹ ولیم کالج سے پہلے کا تھا۔ عام طور پر یہ بات کافی گردش کرتی ہے کہ اُردو کے پہلے خطوط نگار ''رجب علی بیگ سرور'' اور ''غلام غوث بے خبر'' کو کہا جاتا ہے لیکن ڈاکٹر لطیف اعظمی نے اپنے مقالے ''اُردو مکتوب نگاری میں بعد از تحقیق سے یہ ثابت کیا ہے کہ کرناٹک میں ارکاٹ کے نواب والا جاہ کے چھوٹے بیٹے ''حسان الملک بہادر نے اپنی بڑی بھابھی نواب بیگم'' کے نام 6 دسمبر/1822ء کو خط لکھا تھا۔ ڈاکٹر لطیف کے مطابق یہ اُردو کا پہلا خط ہے جس کی تائید گیان چند جین اور عنوان چشتی نے بھی کی ہے۔ اس کے علاوہ ''خلیق انجم'' نے اپنے مضمون ''غالب اور شاہانِ تیموریہ'' میں جان طپش

1814ء اورراسخ عظیم آبادی 1822ء میں دونوں کا ذکر ملتا ہے۔مکتوب نگارافتخارالدین علی خان شہرت جوفورٹ ولیم کالج کے ملازم بھی رہے ان کی مکتوب نگاری کی شناخت ہوتی ہے۔دراصل مکتوب نگاری کے لحاظ سے کوئی حتمی شکل نہیں ملتی اور نہ ہی یہ معلوم ہوسکا کہ اُردومکتوب نگاری کا اولین مکتوب نگارکون ہے البتہ بہت سارے ادیبوں نے خطوط کولکھا ہےاوراُس زمانے کے حالات وواقعات کونقل کیا ہے۔خطوط کے متعلق چندمکتوب نگاروں کی مختلف آرائیں بھی شامل حال ہیں جن سے مکتوب نگاری کا اصل مقصد ظاہر ہوتا ہے۔مولوی عبدالحق لکھتے ہیں۔

''خط دلی خیالات وجذبات کا روزنامچہ اوراسرارِحیات کا صحیفہ ہے''۔مثلاً انسان کی دلی تمنا کوپیش کرنے کا صحیح اوراصل طریقہ کارخط ہی ہے یعنی خط کے ذریعے انسان اپنی زندگی کے پیچ وخم کواچھے تاثرات کے تحت پیش کرسکتا ہے۔ڈاکٹرسیدعبداللہ لکھتے ہیں کہ

> ''خطوط نگاری خود ادب نہیں مگر جب اس کوخاص ماحول خاص مزاج ،خاص استعداد ایک خاص گھڑی اورخاص ساعت میسرآجائے تو یہ ادب بن سکتی ہے''۔

جہاں تک اُردوکاتعلق مکتوب نگاری سے ہے یہ اپنے اندرایک دبستان رکھتا ہے۔یعنی اس کا دامن وسیع ہے۔اس میدان میں بہترین فن کاروں کا عمل دخل ہوتا ہےجن میں مولوی عبدالحق ،مرزا اسداللہ خان غالبؔ، ابوالکلام آزادوغیرہ قابل ذکر ہیں۔

غالبؔ کےخطوط: غالبؔ کی شخصیت اُردوادب کےحوالے سےاہم خصوصیات کی حامل رہی ہے۔ان کے ہاں شاعری اورنثری تصانیف دونوں یکساں درجہ کی چیزیں ہیں جہاں شعری نقطۂ نظر سے غالبؔ کی اہمیت وافادیت سے انکارنہیں کیا جاسکتا۔

وہاں دوسری جانب نثری تخلیقات میں بھی غالب کا اہم مقام ہے۔اُردو میں خطوط کی تقلید فارسی کی مرہونِ منت ہے ۔غالبؔ نے فرسودہ روش کو ترک کر کے اُردو خطوط نویسی میں انقلاب لایا۔انہوں نے خطوط کو نئی جلا بخشی اور یہاں تک فرمایا کہ میں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا۔یعنی خطوط میں زبان کو اہم فہم اور ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ کر ترجیح دی گئی۔خط میں دراصل ذاتی بات چیت ایسے کی جاتی ہے تاکہ ایک بات کہے اور دوسرا سمجھے۔غالب کے خطوط کے دو مجموعے چھپ کر منظرعام پر آئے ہیں۔ان میں ''عود ہندی'' اور ''اُردوئے معلیٰ'' کا نام ہے ۔یہ دونوں مجموعے قابل ستائش ہیں۔غالبؔ نے پرانی روایات سے انحراف کر کے نئے انداز سے تحریر کی ایجاد کی ہے جو عوام میں خاص کر ادب کی دُنیا میں قابل قبول اعتراف کے حق میں ہیں ۔اِس طرح غالبؔ نے اُردو میں خطوط کو نئی تحریر سے متعارف کروایا۔اور اہلِ ادب میں اپنا لوہا منوایا۔دہلی کی جنگی صورت حال کا آنکھوں دیکھا ماحول غالبؔ نے اپنے خطوط میں پیش کیا ہے۔

ابوالکلام آزاد: مولانا ابوالکلام آزاد کی اہمیت وافادیت اُن کے مجموعہ خطوط ''غبارِ خاطر'' سے بہت بلند ہوئی ہے۔یہ تمام خطوط نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی ،رائیس بھیکم پور ضلع علی گڑھ کے نام لکھے تھے ۔یہ خطوط قلعہ احمد نگر کی اسیری کے دوران لکھے تھے جو 1942ء تا 1945ء درمیانِ زمانہ میں تحریر ہوئے کیونکہ اس بار کسی بھی شخص کو ملنے کی اجازت نہ تھی اور نہ خط وکتابت کی ۔اس دوران انسانی پریشانی کا عالم بڑھ جاتا ہے اور مولانا نے دِل کے غبار کو نکالنے کے لیے یہ خط تحریر کیے اور ان خطوط کو اپنے پاس محفوظ رکھا جِسے بعد میں جیل کی اسیری کے ایک دوست نے چھپوائے ایک خط میں شیروانی صاحب کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔''مانتا ہوں کہ میری صدائیں آپ تک نہیں پہنچ سکیں گی تاہم طبع نالہ سنج کو کیا کرو

ل کہ فریاد وشیون کے بغیر رہ نہیں سکتی۔آپ سن رہے ہوں یا نہ رہے ہوں میری ذوق مخاطبت کے لیے یہ خیال لیس کرتا ہے کہ روئے سخن آپ کی طرف ہے''

مولانا ابوالکلام آزاد کا انداز تحریر نہایت فصیح و بلیغ تھا جو انسان کو پڑھنے کا شوق اور ولولہ پیدا کرتا رہا ہے۔حسرتؔ نے بھی یہ اشعار کہا تھا۔

جب سے دیکھی ہے ابوالکلام کی نثر
نظم حسرتؔ میں کچھ مزانہ رہا

مولانا نے غبار خاطر میں تقریباً تین باتوں پر زور دیا ہے زبان، بیان اور انداز بیان ہے جس کے ذریعے نثر میں بہترین فن کاری عنصر ملتا ہے۔ایک اقتباس ملاحظہ کریں جس میں چڑا چڑے کی کہانی کو بیان کیا ہے۔

''لوگ ہمیشہ اس کھوج میں لگے رہتے ہیں کہ زندگی کو بڑے بڑے کاموں میں لائیں مگر یہ نہیں جانتے کہ یہاں سب سب سے بڑا کام خود زندگی ہے یعنی زندگی کو ہنسی خوشی کاٹ دینا یہاں اس سے زیادہ سہل کوئی کام نہیں''۔

غبارِخاطر میں کبھی کبھی انشاپردازی کا احساس ہونے لگتا ہے اور شعریت بھی کافی حد تک موجود ہے جس پر بہت سارے قارئین نے اظہار خیال بھی کیا ہے۔اس انداز بیان کے نمونے آزاد کے ہاں جا بجا ملتے ہیں۔

ملاحظہ کریں اقتباس:

''اس کا زمانہ ہزار شیوہ ورنگ میں کتنے ہی دروازے کھول جاتے ہیں تاکہ بند ہوں اور کتنے بند کیے جاتے ہیں تا کہ کھولے جائیں'' ۔غبار خاطر میں فارسی زبان کا استعمال کیا گیا ہے ۔ فارسی الفاظ ،اشعارِ ترکیب بند اور فارسی محاوروں کا جا بجا استعمال

کیا ہے ۔یہی وجہ ہے کہ غبارِ خاطر میں تقریباً بہت سارے فن موجود ہیں جو ادبی نقطۂ نظر سے بہترین فن کاری پر پرکھے جا سکتے ہیں ۔مولانا ابوالکلام آزاد نے ''غبارِ خاطر'' کے علاوہ '' کاروانِ خیال'' اور دوسرے غیر مطبوع خطوط بھی موجود ہیں لیکن غبارِ خاطر کو مرکزیت حاصل ہے ۔''غبارِ خاطر''میں اضافہ تراکیب اور بہترین نقطہ نظر کو پیش کیا ہے ۔سیاسی کشمکش ،انسانی تنزلی اور ہندوستان کی آزادی کے لیے لڑنے والے لیڈروں پر ظلم و ستم کی داستان ''غبارخاطر''میں ملتی ہے لیکن اُردو ادب میں غبارخاطر بطور خطوط کے مجموعہ میں نہایت عمدہ تحریر ہے اور یہ نثری تحریر اپنی مثال آپ ہے ۔خطوط نگاری کو بلند درجہ پر پیش کرنے سے پہلے غُبار خاطر کا مطالعہ کرنا ضروری ہے ۔ابوالکلام کے خطوط اُردو ادب کی بہترین نثری تخلیق ہیں ۔

مولوی عبدالحق:

مولوی عبدالحق ''بابائے اُردو'' کے نام سے جانے جاتے ہیں ۔مولوی عبدالحق نے اپنی پوری زندگی اُردو کی خدمت میں گذاری ۔ یہاں تک کہ آخری ایام میں بھی وہ اُردو کی آبیاری کرتے رہے ۔اُردو ادب کی جتنی خدمت مولوی عبدالحق نے کی شائد کسی نے اُتنی محنت و لگن نہیں کی ہوگی ۔مولوی صاحب کی انتھک محنت اور مشقت سے ہی انجمن ترقی اُردو اور دارالترجمہ جیسے ادارے قائم کیے جن سے اُردو کی ترویج و ترقی کے لیے نئی راہیں ہموار ہونے لگیں ۔1903ء اس ادارے کا آغاز ہو چکا تھا لیکن 1911ء میں مولوی عبدالحق اس کے سیکریٹری منتخب ہوئے ۔1938ء میں یہ ادارہ منتقل کر دیا گیا اور دہلی میں دوبارہ اسے ادارے کو باضابطہ طور پر کھولا گیا لیکن تقسیم ملک

کے حالات دگرگوں ہو چکے تھے ۔ فسادات نے امن اورآرام کی جگہ چھین لی تھی مصائب کا دوردورہ ہو چکا تھا۔اس فساد کی بات کوایک خط میں غلام ربانی کو لکھتے ہیں کہ

''یہ ایک بیج تھا جواڑتا اُڑتا اورنگ آباد کی زرخیز زمین میں آپڑا تھا چند ہی روز میں یہاں کی خوش آب وہوا کی بدولت اس انکور پھوٹے ،کونپلیں نکلیں اور ہوتے ہوتے یہ خوشنما پودا ایک تناور درخت ہوگیا اوراس نے وہ نشاط انگیز بہاریں دیکھی ہیں جوکم اداروں کونصیب ہوتی ہیں۔ بہار کے بعد خزاں کا آنا لازم ہے اب وہ خزاں کی بہاریں دیکھ رہاہے اوراس کے ساتھ میں بھی یہ ساری منزلیں طے کرر ہاہوں''

(خطوط عبدالحق ۔ص230)

ان کے خطوط میں موقع کی مناسبت سے اظہار بیان کوخاص دخل ہے جہاں غم واندوہ کے حالات بیان کیے جاتے ہیں وہاں بڑی سادگی ،روانگی اورعاجزانہ طور پرپیش آتے ہیں اور جہاں خوشگوارحالات اورفسادات سے دورہوتے ہیں تو خطوط کاتسلسل بھی کچھ الگ نوعیت کا ہوتا ہے ۔مثلاً خط میں لکھتے ہیں۔جس میں ساجدعلی کولکھتے ہیں کہ ''کل مجھے معلوم ہوا کہ آپ نے کچھ تمبا کوبھیجا ہے میں اس عنایت کادلی شکریہ ادا کروں گا اگراچھا نکلاتو ہرکش آپ کی کشت کویاد دلائے گا''۔(خطوط عبدالحق ص۔118)

مولوی صاحب کے خطوط میں ظرافت کی بھی نمایاں وسعت ملتی ہے وہ اپنے خطوط میں عوام کوہنسنے ہنسانے پرمجبور کرتے ہیں اور بڑی فن کاری کے ساتھ اپنی بات پیش کرتے ۔ مولوی صاحب اپنی علالت کے دوران اپنے ساتھیوں سے ہم کلام

ہوکرظرافت کی مثال بن کرسامنے آتے ہیں۔ایک خط میں کچھ اسطرح سے رقمطراز ہیں۔

''میراجی چاہتاہے کہ کسی ایسے مہینے میں مروں جس میں کوئی بڑاآدمی نہ مرا ہومگرسارے مہینے تو گھرے ہوئے ہیں ۔جنوری میں محمدعلی جوہر،سدھارے،فروری میں غالبؔ رخصت ہوئے ۔مارچ سرسید کے حصے میں آیا۔اپریل میں علامہ اقبالؔ نے کوچ کیا۔جون میں بہادریادجنگ کے حصّے میں آیا۔ستمبر میں محمدعلی جناح نے وفات پائی ۔اکتوبر میں ظفرعلی خان نے داعی اجل کولبیک کہااوردسمبر میں حالؔی چل بسے اب لے دے کے تین مہینے رہ گئے۔مئی ،جولائی اوراگست ،مئی اورجولائی سخت گرمی کے مہینے ہیں۔ان میں کون صاحب ذوق مرناپسندکرے گا،ہمارے خیال سے اگست کامہینہ ٹھیک رہے گا''۔(ہندوستانی ادب کےمعمار۔عبدالحق ص۔44)

عبدالحق کی وفات بھی 14اگست 1941ء میں ہوئی تھی جوان کے خیال میں اچھامہینہ تھا وہی موت کا سامان لے کرآیااوراس جہانِ فانی کوکُوچ کیالیکن اپنے خطوط اورادبی کاموں کےلحاظ سےعبدالحق کامرتبہ ومقام بہت بُلند ہےانہیں کام سے کافی رغبت تھی اورفرصت کےلمحوں میں اُردوکی ایسی خدمت کی کہ رہتی دُنیامیں اپنامقام ومرتبہ بلندکیا۔اپنے کام کی لگن سے متعلق اپنے شوق وذوق کاکچھ اسطرح اظہارکرتے ہیں۔

''بہرحال زندہ ہوں اورکام کئے جاتاہوں لیکن جینے سے بیزارہوں ،جینے میں اب کچھ لطف نہیں رہاجس کے لیے میں

نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ وہ اب میرے لیے عذاب جان
ہو گیا ہے کیا اچھا ہوتا میں دلی کے فسادات میں ہلاک کر دیا جاتا
اور یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا''۔

(خطوط عبدالحق۔ص 247)

غالبؔ، مولانا ابوالکلام آزاد، مولوی عبدالحق کے علاوہ داغ دہلوی، علامہ اقبال، اکبرالہ آبادی وغیرہ نے بہترین خطوط لکھے جو اُردو ادب کے بہترین سرمایہ ہیں۔ انھیں خط و کتابت کی بہترین کڑی کہا جا سکتا ہے جو ہمارے ادب میں تاریخ، فلسفہ، سیاست، سماجیات اور اقتصادی مسائل کو پیش کرتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں مشترکہ تہذیب

بلبیر

قرۃ العین حیدر نے اپنے مخصوص طرز سے سماجی رشتوں اور تہذیبوں کی بازیافت کی ہے۔ان کی سماجی حقیقت نگاری، انہیں اپنے ہمعصروں میں منفرد کرتی ہے۔ان کے اکثر افسانے طویل اور خاصے طویل ہوتے ہیں۔دراصل وہ جس تہذیبی، سماجی اور تاریخی پس منظر کے سہارے کہانی کو زمین پر بساتی ہیں اس کے لئے افسانے کا قالب کم پڑتا نظر آتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے زیادہ تر افسانے طویل ہیں بلکہ بعض افسانے، ناولٹ لگتے ہیں۔اس طرح ایک اور بات اپنی حیثیت منواتی نظر آتی ہے کہ قرۃ العین حیدر کا فن افسانے کے بجائے ناول میں مناسب اور بہتر طور پر سامنے آیا ہے۔ناول کی صنف ہی میں ان کے فنی محاسن کو فطری طور پر فروغ کا موقع ملتا ہے۔ دراصل ان کی تخلیقات ایک فرد یا خاندان یا کسی مخصوص واقعے تک محدود نہیں ہوتیں، بلکہ ان کا دائرہ کار وسیع ہوتا ہے اور وہ پورے معاشرے، قوم اور ملک کی تاریخ، مشترکہ تہذیب اور ثقافت کا آئینہ ہوتی ہیں۔اس نقطۂ نظر سے ترقی پسند تحریک کے مقاصد سے وہ بہت قریب نظر آتی ہیں۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ قرۃ العین حیدر نے اپنے افسانوں اور ناولوں کے ذریعہ سماجی حقیقت نگاری کو بالکل نیا رُخ دے کر ترقی پسند

افسانے کو نیا آسمان عطا کیا ہے۔

قرۃ العین حیدر کے مشہور و مقبول افسانے جو مشترکہ تہذیب وثقافت کے آئینہ دار ہیں ان میں ''ستاروں سے آگے''، ''شیشے کا گھر''، ''پت جھڑ کی آواز''، ''رقص شرر''، ''روشنی کی رفتار''، ''ہاوسنگ سوسائٹی''، ''سیتا ہرن''، ''برف باری سے پہلے''، ''کیکٹس لینڈ''، ''جلاوطن''، ''اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو وغیرہ شامل ہیں۔

قرۃ العین حیدر نے ہندوستانی تہذیب وتمدن جسے مشترکہ تہذیب بھی کہتے ہیں، کو بڑی صناعی سے اپنی کہانیوں کا استعمال کیا ہے۔ان کے افسانے جہاں اسلامی تشخص، اسلامی معاشرے اور ماحول کو پیش کرتے ہیں وہیں ہندوستانی مشترکہ تہذیب وثقافت کے مرقعے بھی ان کے یہاں ہوتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے افسانہ ڈالن والا کا شمار ان کے نمائندے افسانوں میں ہوتا ہے۔اس افسانہ میں بھی یوں تو ان کے دیگر افسانوں کی طرح واقعات اور کرداروں کی کثرت ہے، مگر نمایاں کردار، ڈاکٹر زبیدہ صدیقی کا کردار ہے۔قرۃ العین حیدر نے اس کردار کا تعارف ان الفاظ میں کروایا ہے۔

> ''کرسمن کی چھٹیاں شروع ہوئے ایک ہفتہ گذرا تھا کہ ایک بہت لمبی اور دُبلی پتلی ۔بی۔ بی ہمارے یہاں مہمان آئیں ۔ان کا نام ڈاکٹر زبیدہ صدیقی تھا.................. انہوں نے ولایت سے سائنس کے کسی مضمون میں پی۔ایچ۔ڈی کیا تھا''

لیکن اس کے باوجود وہ ایک کٹر مسلمان خاتون تھیں۔قرۃ العین حیدر نے زبیدہ صدیقی کے کٹرپن کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے۔

> ''پہلے روز جب وہ کھانا کھانے بیٹھیں تو انہوں نے زار جھجھک کر کہا۔'' آپ کے ہاں سارے ملازم ہندو ہیں ۔ میں

دراصل ہندو کے ساتھ کا پکا نہیں کھاتی ......'' مسلمان ہو کر آپ
چھوت چھات کرتی ہیں زبیدہ آپا؟ کمال ہے، اور آپ تو ولایت
تک ہو آئی ہیں زبیدہ آپا؟ ....'' باجی نے اپنی خوبصورت آ
نکھیں پھیلا کر کہا۔

دراصل ......وہ......میں......میں ایک وظیفہ پڑھ رہی ہوں
آج کل ....'' انھوں نے جھینپتے ہوئے جواب دیا۔ لہٰذا ان
کا کھانا غفور بیگم نے باوضو ہو کر اپنے ہاتھ سے تیار کرنا شروع
کیا۔

پڑوس کی مسلمان بیبیوں پر ڈاکٹر صدیقی کی مذہبیت کا بے
انتہا رعب پڑا۔ لڑکی ہو تو ایسی، سات سمندر پار ہو آئی۔ مگر ساری
کا آنچل مجال ہے جو سر سے سرک جائے ....مسز فاروقی
نے کہا۔

شرعی پردہ تو اصل یہی ہے، کہ عورت بس اپنا چہرہ اور ہاتھ
کھلے رکھے۔ اور اپنی زینت غیر مردوں سے چھپائے۔ قرآن
پاک میں یہی آیا ہے۔'' مسز قریشی نے جواب دیا۔

''روزے نماز کی پابند، شرم وحیا کی پتلی''

قرۃ العین حیدر مشترکہ تہذیب کی علمبردار ہیں اور ان کے افسانوں میں کسی بھی طرح کے مذہبی کٹر پن کی مخالفت اور مذمت کے جذبات ملتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے کئی افسانوں میں مذہبی کٹر پن کا عبرت ناک انجام دکھایا ہے۔ مثلاً اس افسانہ ''ڈالن ولا'' میں ڈاکٹر زبیدہ صدیقی ابتدا میں کسی ہندو کے ہاتھ کا پکا نہیں کھاتی، لیکن وہی ڈاکٹر زبیدہ آخر میں ایک ہندو شخص ڈاکٹر اُپل سے شادی کر لیتی ہے۔

قرۃ العین حیدر نے اس واقعے کو اس پیش کیا ہے۔

''ایک روز ڈاکٹر زبیدہ صدیقی کا خط باجی کے نام کلکتے سے آیا۔انہوں نے لکھا تھا...... ''جس روز میں یہاں پہنچی اسی ہفتے میں محمود صاحب نے میری بھتیجی سائرہ سے شادی کر لی بڑی دھوم کی شادی ہوئی ہے۔تم نے السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا میں دولہا دُلہن کی تصویر بھی دیکھی ہوگی۔پی۔پی۔ایس۔ڈاکٹر اُپل ہندو ہیں یہ اطلاع کہ میں نے ایک کافر سے شادی کر لی مسز فاروقی، مسز قریشی اور مسز انصاری کو بھی دے دینا۔''

قرۃ العین حیدر نے اپنے افسانہ ''دریں گرد سوارے باشد'' میں تقسیمِ ملک کے بعد ہندوستان میں پھیلتی ہوئی فرقہ پرستی اور مسلمانوں کے معاشی بدحالی کے بارے میں اظہار کیا ہے لیکن یہ بھی بتایا ہے کہ ملک کی تقسیم، فرقہ وارانہ فسادات، خون خرابہ اور ہجرت کے سانحات کے باوجود نہیں آیا تھا۔ مذکورہ بالا افسانہ کے اس اقتباس کو دیکھئے۔

''ہم لوگ کالج کے احاطے میں سے ٹہلتے ہوئے فصیل تک پہنچے۔گذشتہ سال ایک شام کو میں یہاں شاعر کزن اور نواب زادہ کزن کے ساتھ چہل قدمی کے لئے آئی تھی۔ایک دلچسپ منظر دیکھا تھا۔فصیل کی اندرونی دیوار میں ایک طاقچے میں چراغ روشن تھا، پھول رکھے تھے، اگربتی سُلگ رہی تھی۔ یہ کسی پیر کا چلہ تھا۔اس کے نیچے ایک دوسرے سے دور کچھ فاصلے پر دو غریب مسکین صورت آدمی چپ چاپ آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ایک دھوتی پوش۔ایک چگی داڑھی والا۔ یہ دونوں کالج کے

چپراسی ہیں، شام کو دونوں یہاں بیٹھے ہیں ۔آپس میں معاہدہ
ہے، اس چلے کے مجاور بن گئے ہیں ۔ ہندو مسلمان جو چڑھاوا
چراغی کا نذرانہ لاتے ہیں اُسے آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔''

قرۃ العین حیدر نے موضوع کی انفرادیت کو افسانے میں بڑی خوبصورتی سے عیاں کیا ہے۔انہوں نے اپنے پسندیدہ موضوع مشترکہ تہذیب و ہندوستانی ثقافت و کلچر تاریخ کے یاد ماضی پر کئی افسانوں کو موضوعاتی ڈھنگ سے ادبی تخلیق کی دنیا میں پیش کیا ہے ۔انہوں نے جلاوطن ، دو سیاح ، آوارہ گرد، دریں گرد سوارے باشد،لکڑ بگھے کی ہنسی، روشنی کی رفتار، یہ داغ داغ اُجالا، کیکٹس لینڈ ،سینٹ فلورآف جارجیا کے اعتراف، ہاؤسنگ سوسائٹی جیسے تمام افسانوں کا موضوع انہوں نے مشترکہ تہذیب وثقافت کو بنایا ہے ۔قرۃ العین حیدر کے موضوع زندگی کے تجربات اصل زندگی سے وابستہ ہوتے ہیں ۔ ماحول معاشرت کی سیاست وسماج سے انہوں نے ادب میں الگ الگ موضوعات کے انتخابات سے اُردو افسانے کی دنیا کو تنوع کینوس کا نئی تکنیک نئے پلیٹ فارم دیے موضوع کی اہمیت کو واضح کرایا۔ایک اقتباس ان کے افسانے جلاوطن سے جس میں مختلف تہذیب وثقافت کے اثرات کے ساتھ مشترکہ تہذیب کی عکاسی بھی کرتا ہے:

''ہندو مسلمانوں میں سماجی سطح پر کوئی واضح فرق نہیں تھا۔
خصوصاً دیہاتوں اور قصبہ جات میں عورتیں زیادہ تر ساریاں اور
ڈھیلے پائجامے پہنتیں ۔اودھ کے بہت سے پرانے خاندانوں
میں بیگمات اب تک لہنگے بھی پہنتیں ۔ بن بیاہی لڑکیاں ہندو اور
مسلمان دونوں ساری کے ء بجائے کھڑے پائچوں کو پائجامہ
پہنتیں ۔ ہندوؤں کے ہاں اسے ''اجار'' کہا جاتا ۔مشغلوں کی
تقسیم بڑی دلچسپ تھی ۔ پولیس کا عملہ اسی فیصد مسلمان تھا۔محکمہ

تعلیم میں ان کی اتنی ہی کمی تھی۔ تجارت تو خیر کبھی مسلمان بھائی نے ڈھنگ سے کر کے نہ دی۔ چند پیشے مگر خاص مسلمانوں کے تھے۔ جن کے دم سے صوبے کی مشہور صنعتیں قائم تھیں۔ لیکن خدا کے فضل و کرم سے کچھ ایسا مضبوط نظام تھا کہ سارا منافع تو بازار تک پہنچاتے مڈل مین ہی مار لے جاتا تھا اور جو بھائی کے پاس بچتا تھا اس میں قرضے چکانے تھے۔ بیٹا کا جہیز بنانا تھا۔ اور ہزاروں قصے تھے۔ آپ جانئے۔ زبان اور محاورے ایک ہی تھے۔ مسلمان بچے برسات کی دعا مانگنے کے لئے منہ نیلا پیلا کئے گلی گلی ٹین بجاتے پھرتے اور چلاتے۔ برسو رام دھڑا کے سے بڑھیا مرگئی فاقے سے۔ گڑیوں کی بارات نکلتی تو وظیفہ کیا جاتا۔ ہاتھی گھوڑا پالی۔ جے کنہیا لال کی، ذہنی اور نفسیاتی پس منظر چوں کہ یکساں تھا لہٰذا غیر شعوری طور پر بھی ایک ہی تھی۔ جس میں رادھا اور سیتا اور پنگھٹ کی گوپیوں کا عمل دخل تھا۔ مسلمان پردہ دار عورتیں جنہوں نے ساری عمر کسی ہندو سے بات نہ کی تھی۔ رات کو جب ڈھولک لے کر بیٹھتیں تو لہک لہک کر الاپتیں۔ بھری گگری موری ڈھرکائی شام۔ کرشن کنہیا کے اس تصور سے ان لوگوں کے اسلام پر کوئی حرف نہیں آتا تھا۔ یہ سب چیزیں اس تمدن کی مظہر تھیں۔ جنہیں پچھلی صدیوں میں مسلمانوں کی تہذیبی ہمہ گیری اور وسعت نظر اور ایک رچے ہوئے جمالیاتی حس نے جنم دیا تھا۔ یہ گیت اور کجریاں اور خیال یہ محاورے، یہ زبان، ان سب کی بڑی پیاری اور دل آویز مشترکہ میراث تھی۔ یہ معاشرہ

جس کا دائرہ مرزا پور اور جونپور سے لے کر لکھنؤ اور دلی تک پھیلا ہوا تھا۔ اک مکمل اور واضح تصویر تھا۔ جس میں آٹھ سو سال کے تہذیبی ارتقاء نے بڑی گمبھیر اور خوبصورت رنگ بھرے تھے۔''

قرۃ العین حیدر اس مشترکہ تہذیب وثقافت کو یاد کرتی ہیں جس میں امن وآشتی، میل جول اور اتفاق واتحاد کی دنیا آبادی تھی۔ وہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں اور الگ الگ فرقوں کے مابین محبت اور رواداری کی نشاندہی کرتی ہیں اور گنگا جمنی تمدن ہندوستانی تصورات کو بڑی خوبصورتی سے پیش کرتی ہیں۔ اُن کو انسانیت کی قدروں پر اعتماد تھا اسلئے وہ اپنے افسانوں میں ہندو اور مسلمان دونوں قومیں مفاد اور جذبات کا احترام کرتی ہوئی ماضی کی ناسٹلجیا کے تصورات کے خوبصورت احساسات پیش کرتی ہیں۔ وہ مذہبی تعصب کے بجائے رسوم ورواج کے اعتبار سے دونوں قوموں کی یکسانیت جذبات یاد ماضی کی تکنیک سے افسانے میں پیش کرتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر نے افسانہ ''آہ اے دوست'' میں لکھنؤ کی تہذیب کو ایک کردار کے طور پر نمایاں کیا ہے۔ وہ اودھ کے مشترکہ تمدن ہی کو یاد نہیں کرتی ہیں بلکہ اکثر بیرونی ممالک میں ان کا کوئی کردار یو۔پی کے موسموں کو یاد کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے، وہاں کی رنگ رنگ محفلوں کی حسرت سے ذکر کرتا ہے۔ کبھی گرمیوں میں آم کے باغوں میں دوپہر کے سناٹے کی خاموشی کو یاد کرتا ہے تو کبھی امردوں کی جھرمٹ میں سے بلند ہوتی ہوئی برہا اور آلھا اودل کی تانوں کا خیال یاد ماضی کے حوالے سے کرتا ہے۔

تقسیمِ ہند سے قبل ہندو مسلم میں جو اتحاد تھا اس کی عمدہ مثال قرۃ العین حیدر کے افسانہ ''ہاؤسنگ سوسائٹی'' میں بھی ملتی ہے:

''وسط شہر میں مہاجنوں، ساہوکاروں اور زمینداروں کی اونچی حویلیاں تھیں یہ لوگ سرکاری فنڈوں میں ہزاروں روپیہ

چندہ دیتے ۔ اسکول کھلواتے ، مجرے اور مشاعرے اور دنگل
کرواتے ، جلسے جلوس اور سرپھٹول بھی ان ہی کی زیرِ سرپرستی
منعقد ہوتے ۔ ہندو مسلمانوں کا معاشرہ اور تمدن بالکل ایک تھا۔
وہی تیج ،تہوار، میلے ٹھیلے ۔محرم، بالے میاں کی برات ۔ پھر اس
سے اونچی سطح پر وہی مقدمے بازیاں۔''

قرۃ العین حیدر نے ہندوستان کی دونوں ہندو مسلم قوموں میں سماجی سطح پر بھی کوئی بڑا فرق نہیں کیا ہے۔ ہندوستان کی آبادی کا ۷۰ فی صدی حصہ دیہاتوں میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اگر ہندوستان کی اصل تہذیب وثقافت کا مشاہدہ کرنا مقصود ہو تو یہاں کی دیہاتوں کو دیکھنا لازمی ہے۔قرۃ العین کے مطابق بھی اُس عہد میں شہروں کی تہذیب میں تصنع و بناوٹ اور تفرق بڑھ رہا تھا لیکن دیہاتوں کی تہذیب وثقافت میں یکسانیت اور اتحاد، سچائی اور سادگی قائم تھی۔ دیہات میں عورت مرد، ہندو مسلم سبھی کے لباس، رسم رواج اور لب و لہجے یکساں تھے:

''ہندو مسلمانوں میں سماجی سطح پر کوئی واضح فرق نہیں تھا۔
خصوصاً دیہاتوں اور قصبہ جات میں عورتیں زیادہ تر ساریاں اور
ڈھیلے پائجامے پہنتیں۔''

انگریزوں نے جس طرح ہندوستانی مشترکہ تہذیب کو نقصان پہنچایا اس کا ذکر بھی قرۃ العین حیدر نے اپنے افسانوں میں کیا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''ویسے انگریز کی پالیسی یہ تھی کہ جن ضلعوں میں مسلمانوں
کی اکثریت تھی۔ وہاں ہندو افسر کو تعینات کیا جاتا تھا اور جہاں
ہندو زیادہ ہوتے تھے وہاں مسلمان حاکموں کو بھیجا جاتا تھا۔''

قرۃ العین کے افسانہ ''قلندر'' کا مرکزی کردار اقبال بھی مشترکہ تہذیب کا نمائندہ

ہے۔ اقبال کے رہن سہن، بات چیت غرض کہ کسی بھی رویہ سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ ہندو مذہب کا ماننے والا ہے۔ مسلمانوں کے ہر تہوار میں شریک ہونا، رہن سہن، طرزِ گفتگو، عادات واطوار ہر اعتبار سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مسلمان ہے۔ بہت بعد میں منی کے ذریعے جو بچپن میں ان کی سرپرستی میں فارسی اور انگریزی وغیرہ سیکھتی ہے اور پھر ان کے چلے جانے کے باوجود کسی نہ کسی طرح ان کے رابطے میں رہتی ہے۔ اس بات کا اندازہ قاری کو ہوتا ہے کہ وہ مسلمان ہیں۔ اس اقتباس سے وضاحت ہوتی ہے۔

> ''اقبال بھائی آپ یہ فراڈ بھی کرنے لگے ہیں۔ ان لڑکیوں کے سامنے آپ نے خود کو مسلمان ظاہر کیا؟ نہ صرف مسلمان بلکہ شیعہ............ جواب ملا۔ دیکھ منی! دنیا میں اس قدر تفرقہ ہے کہ سب لوگ ایک دوسرے کے جان کو آئے ہوئے ہیں میری جب اس لڑکی سے ملاقات ہوئی وہ میرے نام کی وجہ سے مجھے مسلمان سمجھی اور میرے سامنے ہندوؤں کی اور ہندوستان کی خوب برائیاں کی......اس میں میرا کیا حرج ہے۔ میرے خاندان میں سینکڑوں برس سے فارسی نام رکھے جاتے ہیں اس سے ہندو دھرم پر کوئی آنچ نہیں......''

اسی طرح منی مسلمان ہونے کے باوجود شار دامہتہ کے ساتھ سنگ کی پوجا میں شرکت کرنے اور گروجی کا آشرواد لینے میں کوئی حرج نہیں سمجھتی۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اس افسانے میں قرۃ العین حیدر نے جس معاشرے کی عکاسی کی ہے وہ مشترکہ تہذیب سے عبارت ہے۔

ہندوستان کی مشترکہ تہذیب میں قبر پرستی، چڑھاوے چڑھانا، تعویز گنڈے، ٹونے ٹکے اور منتیں مانگنے کا رواج یہاں کی فطرت میں رچا بسا ہوا ہے۔ دیوی دیوتاؤں

کے چرنوں میں قربانی دینے کا جو تصور ہندوں کے یہاں ابتدا سے موجود ہے وہی چیزیں مسلمانوں کے یہاں بھی شامل ہوگئیں۔مثلاً پیروں کے مزاروں پر حاضری دینا ، چادر چڑھانا اور منتیں چڑھانے وغیرہ کے رسم کی بہترین عکاسی قرۃ العین حیدر کے افسانے ''دریں گردسودائے باشد''، ''فقیروں کی پہاڑی'' اور ''فقیروں کی بستی'' وغیرہ میں موجود ہے۔

قرۃ العین نے افسانے ''روشنی کی رفتار'' میں اگرچہ وقت کوموضوع بنایا ہے لیکن آج جدید دور میں جس طرح مشترکہ تہذیب وتمدن منتشر ہورہا ہے افسانے میں اُس پر بھی طنز کیا گیا ہے۔مصنفہ عہدِ حاضر اور جدید تر تہذیب وتمدن پر طنز کرتے ہوئے کہتی ہیں:

> ''یہ زمانہ!......؟اس میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں؟اس نے تلخی سے کہا اور پھر ٹیلی ویژن کھولا۔نیوز، دیل میں دنیا بھر میں بپا جنگوں اور نسلی اور مذہبی فسادوں کے مناظر دکھا ئے جارہے تھے۔۔''بتاؤ مجھ سے سوا تین ہزار سال بعد تم کتنی متمدن ہو۔ہم بنی اسرائل پر ظلم ڈھاتے تھے اور اشوریہ سے لڑتے رہتے تھے۔تم سب ایک دوسرے کے ساتھ بے انتہا پیار محبت سے رہتے ہو، ہمارا فراعنہ ستم پیشہ تھے۔تمہارے حکمراں فرشتے ہیں۔ہم موت سے ڈرتے تھے تم موت کے خوف سے آزاد ہو چکے ہو۔تم عالی شان مقبرے نہیں بناتے ، مردو پرستی نہیں کرتے ،نوحے نہیں لکھتے ،شعروشاعری بھی ترک کر چکے ہو،تمہارے مذاہب ، فلسفے ، اخلاقیات ،نفسیات......'' وہسکی کا گلاس میز پر پٹخ کرزور سے ہنسا ''تمہاری دیو مالائیں ،نظریہ تثلیث، رومانیت یہ وہ سب عین سائنٹفک ہیں۔تمہاری جنگیں

ہیومنزم پر بنی ہیں ۔تمہارا نیوکلیر بم بھی خالص انسان دوستی
ہے۔ہے نا۔تمہاری روشنی کی رفتار واقعی تیز ہے؟''

قرۃ العین حیدر کے افسانہ''اودھ کی شام'' میں بھی ہندوستانی مشترکہ تہذیب اور خصوصاً اودھ کی تہذیب کوسامنے لایا گیا ہے۔اس افسانے کا بنیادی موضوع اودھ کی ہی تہذیب و ثقافت ہے ۔اس میں قرۃ العین حیدر سیاسی تبدیلیوں کے حوالے سے بات کرتی ہیں جہاں محمد علی جناح کا ذکر بھی آتا ہے۔اُس کے بعد انہوں نے امریکی انگریز فوجیوں کے لباس، کلچر، مشترکہ زبان،ان کی سوچ وفکر اور ہندوستانی عوام سے ان کے میل ملاپ کے بارے میں روشنی ڈالی ہے۔

''مجھے تمہاری آنکھیں بہت پسند ہیں لیکن اس کے باوجود میں تمہارے ساتھ رقص نہیں کروں گی۔تمہارا لہجہ بہت عمدہ ہے۔ تم پہلے انگریز ہو جو صحیح اور اچھے تلفظ کے ساتھ انگریزی بول سکنے کے علاوہ کسی ٹھوس اور سنجیدہ موضوع پر دیر تک آسانی سے گفتگو کر سکتے ہو۔تم سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے اڑاتے ہوئے کورنل وائلڈ کے انداز میں کہتے ہو کہ ہندوستان کے دو ہفتے کے قیام میں تم جن تین چار ہندوستانی لڑکیوں سے ملے انہوں نے تم کو بہت امپریس کیا۔وہ بہت عمدہ ہوتی ہیں۔اس کے دماغ میں Ideas ہیں اور وہ چین کی خانہ جنگی اور کمیونزم اور انڈونیشیا کی آزادی پر لمبی لمبی ثقیل بحثیں اسی خوب صورتی کے ساتھ کرتی ہیں جس خوبصورتی کے ساتھ وہ مانی پوری اور کتھک اور رمبا کرتی ہیں۔''

عام طرزِ معاشرت، رسم ورواج، وضع لباس اور زبان ولب ولہجہ کے علاوہ تفریح و تفنن میں جو یکسانیت مختلف قوموں میں پیدا ہوگئی ہے اس کے نقوش بھی قرۃ العین

حیدر کے افسانوں میں موجود ہیں۔مثلاً کرسمس، نیوائیر، دیوالی، برتھ ڈے،شادی کی سال گرہ وغیرہ ان تہواروں کے موقع پر ہونے والی تیاریوں اور تفریحی گہما گہمی کا نظارہ قرۃ العین حیدر کے افسانے ''ڈالن والا'' اور ''نظارہ درمیاں'' میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ موجود ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''کرسمس نزدیک آگئی کیرول گانے والوں کی ٹولیاں رات کے وقت ڈلن والا کے سڑک پر گھوم گھوم کر رکارڈ میں اور گٹار پر ولادت مسیح کی گیت گاتی پھرتیں .... سورج اوپر آتا تو سامنے ہمالیہ کا برف پوش سلسلہ کرنوں میں جگمگا اُٹھتا .... رات گئے کسی پہاڑی راہ گیر کی بانسری کی آواز کہرے میں تیرتی ہوئی سنائی دے جاتی۔کرسمس کے ایک دن پہلے سائمن نے ...... باجی کے لئے گلابی نقلی موتیوں کا منا سا ہار میرے لیے بالوں کے دو سرخ اور سبز ربن اور ریشم کے لیے چھوٹی سی رنگین گیند لائے تھے۔''

مجموعی طور پر یوں تو ہندوستان کے مختلف خطوں کے رہن سہن، زبان وادب اور دوسرے تہذیبی عناصر کا بیان متعدد افسانہ نگاروں کے یہاں موجود ہے لیکن قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں عالمی سطح کا تہذیبی اشتراک نظر آتا ہے۔ان کے یہاں مشترکہ تہذیب کبھی مذہبی اختلاف، کبھی نسلی تفریق اور کبھی علاقائی رنگارنگی وہم آہنگی کے ساتھ نمایاں ہوئی ہے۔اوران کے افسانوں میں ہندو مسلم اور دوسرے مختلف طبقوں کے عقائد اوران کی زندگی کے خارجی وداخلی پہلوؤں کا بیان بھی بڑی چابک دستی سے ہوا ہے جس سے مشترکہ تہذیب کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔